

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
May 2018
قیمت -/70 روپے

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
ڈر ڈائجسٹ
کراچی

جلد نمبر 19 شمارہ نمبر 8 مئی 2018ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/70 روپے

سالانہ قیمت -/1500 روپے



ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں

☆ اللہ نے کسی آدمی کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے اور نہ تمہاری عورتوں کو جن کو تم ماں کہہ بیٹھتے ہو تمہاری ماں بنایا اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے بنایا۔ یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ تو سچی بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا رستہ دکھاتا ہے مومنوں! لے پالکوں کو ان کے اصلی باپوں کے نام سے پکارا کرو کہ اللہ کے نزدیک یہی بات درست ہے۔ اگر تم کو ان کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو دین میں وہ تمہارے بھائی اور دوست ہیں اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو قصد دلی سے کرو اس پر مواخذہ ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 4 سے 5)

☆ اگر تم عجیب بات سننی چاہو تو کافروں کا یہ کہنا عجیب ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہوں گے؟ یہی لوگ ہیں جو اپنے رب سے منکر ہوئے ہیں۔ اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور اہل دوزخ ہیں کہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔ (سورۃ رعد 13 آیت 5)

☆ تمہارے لئے دریا کی چیزوں کا شکار اور ان کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے یعنی تمہارے اور مسافروں کے فائدے کے لئے اور جنگل کی چیزوں کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں تم پر حرام ہے اور اللہ جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے ڈرتے رہو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 96)

☆ یہ بات تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا پھر اگر یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت حال تو معلوم ہو ہی چلی ہے تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ۔ پھر دونوں فریق اللہ سے دعا و التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ یہ تمام بیانات صحیح ہیں اور اللہ کی سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 60 سے 62)

☆ اور جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ، اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس نصرت پر ایمان رکھتے ہو جو حق و باطل میں فرق کرنے کے دن یعنی جنگ بدر میں جس دن دونوں فوجوں میں مڈ بھیڑ ہوگی، اپنے بندے محمد پر نازل فرمائی۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۃ انفال 8 آیت 41)

☆ اس دن کفر کے پیشوا اپنے پیروں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور دونوں عذاب الٰہی دیکھ لیں گے اور ان کے

آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے یہ حال دیکھ کر پیروی کرنے والے حسرت سے کہیں گے کہ اے کاش ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ جس طرح یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں اسی طرح ہم بھی ان سے بیزار ہوں۔ اس طرح اللہ ان کے اعمال حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 166 سے 167)

☆ ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لئے اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں یہ رات طلوع صبح تک امان اور سلامتی ہے۔ (سورۃ قدر 97 آیت 1 سے 5)

☆ اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بھی بے نیاز ہے۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔ (سورۃ لقمان 31 آیت 12 سے 13)

☆ اور جو لوگ اپنی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں، تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار اللہ کی قسم کھائی کہ بے شک وہ سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ پہلے چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بے شک یہ جھوٹا ہے اور پانچویں دفعہ یوں کہے کہ اگر یہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتیں مگر وہ صاحب کرم ہے اور یہ کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور حکیم ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 6 سے 10)

☆ مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے لوگوں کے گھروں میں گھر والوں سے اجازت لئے اور ان کو سلام کئے بغیر داخل نہ ہوا کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور ہم یہ نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ شاید تم یاد رکھو اگر تم گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے اس وقت لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو۔ یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے ہاں اگر تم کسی ایسے مکان میں جاؤ جس میں کوئی بستا ہو اور اس میں تمہارا اسباب رکھا ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 27 سے 29)

☆ بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو۔ اور اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو شرع اللہ سے حکم میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔ اور چاہئے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہو۔ (سورۃ نور 24 آیت 2)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

مسز زینت خان روات سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔ اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین اپریل 2018 کے ڈر نے گو اتنا متاثر نہیں کیا کہ اِس مرتبہ بھی زیادہ کہانیوں پر تبصرے کی نوبت آتی لیکن سرورق نے بہت خوش کیا کہ یہ ادارے کی نیک نیتی سے کی گئی کوشش ہوتی ہے اور محنت بھی۔ کچھ مہینوں سے ڈر کی ٹیم سرورق بنانے میں کافی محنت سے کام لے رہی ہے۔ سرورق انتہائی دیدہ زیب رنگوں کے ساتھ ڈر کی حقیقی عکاسی کر رہا ہے۔ بہت ہی خوب۔ اِس مرتبہ ڈر کی جانب سے جو سب سے بڑی خوشی مجھ جیسی قاری کو نصیب ہوئی وہ میرے ڈر سے وابستہ Most favourite writer محترم احسان الحق صاحب کی کہانی ''المیہ'' کی صورت میں تھی۔ یہ ایک سماجی، سبق آموز کہانی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو اِس وقت ہمارا معاشرہ ایسے ایسے اندرون خانہ خوفناک اور گھناؤنے جرائم کی داستانوں سے بھرا ہوا ہے اور اِس وقت ہمارے معاشرے کا ہر ہر عمل اللہ پاک اور اس کے رسول ﷺ کے واضح احکامات کی ڈٹ کر نافرمانی کی غمازی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بات چند افراد تک محدود ہوتی تو کچھ اُمید بھی ہوتی کہ چھوٹ یا بخشش مل سکتی ہے لیکن یہاں پر اکثریت کا عمل ایک جیسا ہے۔ اس پر لکھی یہ دوٹوک کہانی پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر ثبت کرتی ہے۔ اللہ پاک آپ کو صحت دے اور آپ ہمارے لئے لکھتے رہیں۔ مَیں تہہ دل سے کہتی ہوں اور دُعا کرتی ہوں کہ ڈر میں آپ متواتر لکھیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آخری کہانی شہزاد خان کی جانب سے ''ویران مندر'' تھی جو ایک معیاری کہانی تھی، لکھنے والوں کو ڈر کے اچھے رائٹرز سے کافی کچھ سیکھنا چاہئے۔ مہر پرویز احمد دولو صاحب سے ایک خاص التجاء ہے کہ اپنی تحاریر میں مکالمہ جات کا اضافہ فرمائیں تا کہ کہانی کی سی صورت بن جائے۔ مہر صاحب! آپ کے پاس معاشرے میں پائی جانے والی خامیوں اور معاشرتی بیماریوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے جس کا ہر ایک موضوع دراصل ایک بہترین کہانی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اگر آپ اپنی کہانیوں میں مکالمہ جات کا اضافہ کر سکیں اور کوئی sequence اُس کہانی میں ڈال دیں تو آپ سے زیادہ اچھا بھلا کون لکھ سکے؟ اس کہانی ''سفاک کون'' میں جو آپ کے تجربے کی جھلک دکھلائی دیتی ہے، جان لیوا کہانی اپنی خاص الخاص طلب کے ساتھ آگے کی جانب رواں دواں ہے اور کہیں پر بھی اس کہانی میں جھول نہیں، نہ ہی یہ کہانی روحانی دنیا کے حقائق سے ایک لحظہ بھی پرے کو ہٹی ہے اور نہ ہی اس میں عمومی طور سے لکھی جانے والی طویل کہانیوں کی مانند کوئی بچکانہ پن ہے۔ بے جا کی طوالت بھی نہیں۔ ہر ہر سطر قاری کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ بہت مبارک۔ ایس حبیب خان صاحبہ کی کہانی اِس مرتبہ شائع ہو رہی ہے۔ دل باغ باغ ہے۔ فلک زاہد صاحبہ کی طبیعت کا پڑھ کر دعا گو ہوں۔ اللہ پاک آپ کو جلد از جلد صحت یاب کرے، آمین۔ باقی رائٹرز محنت سے کام کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن سب سے استدعا ہے کہ اپنا مطالعہ بھی وسیع کریں۔ آخر میں ڈر کے لئے۔ نیک تمنائیں!

☆☆ زینت صاحبہ: یہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ ڈٹ کر اللہ پاک اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکامات کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ ہمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فکر نہیں بلکہ صرف اور صرف اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی فکر ہے......زینت صاحبہ تحریر سے بلی والا پیراگراف نکال دیا گیا ہے اس کے لئے معذرت۔ کیونکہ وطن عزیز میں تنقید برائے تنقید اور اختلاف برائے اختلاف کے لوگ ہیں اور ہر آدمی کی سوچ الگ الگ ہے......

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ محترم ایڈیٹر، ڈر کی ٹیم، اس کے رائٹرز اور تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ ابتدا ''قرآن کی باتیں'' سے کی۔ اس کے بعد خطوط کی بزم میں قدم رکھا تو فلک زاہد کے خط نے پریشان کر دیا۔ فلک مائی سسٹر! میں دعا گو ہوں کہ خدائے لم یزل آپ کو صحت کی بادشاہت کے منصب پر فائز کرے۔ (آمین) اس کے علاوہ اپنے تمام دوستوں کو دعاؤں میں یاد رکھنے کے لئے شکریہ! ہر بار کی طرح مسز زینت خان اپنے مفصل اور جامع تبصرے سے بازی لے گئیں دیگر میں مسز سندس اقبال، مسز فرحین حامد، احسان الحق، شاہد عظیم اور مہر پرویز احمد کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ جنہوں نے رائٹرز کی تعریف و اصلاح کی۔ کہانیوں میں اب تک جو پڑھ سکی ہوں ان میں سب سے پہلے ''المیہ'' پڑھی، ڈر کے کہنہ مشق رائٹر احسان الحق کی تحریر ایک منفرد طرز کی تحریر تھی۔ جس نے پڑھنے والوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بہت خوب احسان صاحب! ''پراسرار مخلوق'' کیے کی سزا تو لازمی بھگتتی

پڑتی ہے۔اس تحریر میں خوف کے ساتھ یہ پیغام رائٹر نے بہت خوبصورتی سے دیا ہے۔کیا بات ہے ایس امتیاز احمد!''خون خوار بلی'' اس طرز کی تحریر ثابت ہوئی جس نے حقیقی معنوں میں متاثر کیا گڈ!''شہر خموشاں'' خوف کے لبادے میں لپٹی، لہو ٹپکاتی اپنی نوعیت کی بہترین تحریر تھی جس نے دل کی دھڑکنوں کو تیز کردیا۔بہت اچھا لکھا نسرین رانا آپ نے Keep It up ''اندھیرے کا مسافر'' طارق محمود صاحب کی تحریر حقیقت سے قریب ایک پراثر تحریر ثابت ہوئی۔ویلڈن!''ویران مندر'' اس تحریر کو مزید بہتر انداز میں لکھا جاسکتا تھا۔تحریر کافی الجھی ہوئی تھی۔''خبیث روح'' ایک ذرا سی لاپرواہی کبھی کبھی زندگی بھر کے لئے وبال جان بن جاتی ہے یہ حقیقت اس تحریر میں پنہاں ہے۔محمد رضوان قیوم صاحب نے دل گرفتہ تحریر پیش کی۔ !Excellent سلسلے وار تحریر ''جان لیوا'' کے بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ دل و دماغ سے محو نہ ہونے والی تحریر ''جان لیوا'' واقعی جان لینے پر تلی ہوئی ہے۔Awesome۔ باقی تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں اور امید کرتی ہوں کہ وہ بھی اچھی ہی ہوں گی۔اب اجازت چاہوں گی۔ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆ایس حبیب صاحبہ: چلئے خوشی کی بات ہے کہ آپ کی کہانی ''پراتی شودُ'' شائع ہوگئی اور اب نئی کہانی کے لئے انتظار کی گھڑیاں...... ویسے ماشاء اللہ آپ کو ہندی الفاظ پر عبور حاصل ہے......ڈر پڑھنے والے قارئین کو ہندی پر عبور حاصل نہیں......تو پلیز! آئندہ اس پر ذرا غور کیجئے گا۔شکریہ۔

نثار فاطمہ راولپنڈی سے،السلام علیکم!محترم ایڈیٹر صاحبان، میں ڈر ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔پچھلے آٹھ سال سے میں نے ہر ماہ ڈر کا آنے والا شمارہ بہت شوق سے پڑھا ہے اور میں ہر ماہ بہت بے صبری سے نئے شمارے کا انتظار کرتی ہوں۔ڈر کے تمام رائٹرز قابل تعریف ہیں اور بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔مجھے کہانیاں پڑھنے کا ہی نہیں لکھنے کا بھی شوق ہے۔اس دفعہ میں نے ہمت کرکے ایک کہانی لکھی ہے جو میں آپ کو ارسال کررہی ہوں۔امید کرتی ہوں کہ میری کہانی آپ کو پسند آئے گی اور اسے شائع کرکے آپ شکریہ کا موقع ضرور دیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے تاکہ میں مزید اچھی کہانیاں لکھ سکوں کیونکہ میں نے پڑھا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ والے ہر نئے لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو کہانی میں آپ کو ارسال کررہی ہوں اگر اس میں آپ کو کوئی غلطی لگے تو براہ کرام کاٹ چھانٹ کر شائع کردیجئے گا اگر آپ کی حوصلہ افزائی میرے ساتھ ہوئی تو میں انشاء اللہ مزید اچھی کہانیاں لکھ سکوں گی۔

☆☆نثار فاطمہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کی ارسال کردہ کہانی ''حویلی کا راز'' آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی اور امید ہے کہ حسب وعدہ آپ جلد از جلد دوسری کہانی بھی ارسال کردیں گی۔Thanks۔

فاطمہ خان علی پور مظفر گڑھ سے،السلام علیکم!جناب امتحانات کا بھوت ایک مرتبہ پھر ہمیں خوفزدہ کرنے کو تیار کھڑا ہے۔لیکن ہم بھی خوفزدہ ہونے والی چیز نہیں۔آخر ''ڈر'' کے لکھاری ہیں اور ڈر کے لکھاری اور قارئین تو بڑے سے بڑے بھوت کو بھی پچھاڑ دیں۔

ماشاء اللہ ڈر کا ہر شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔خاص کر سرورق دیکھ کر تو دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور اگر ہم اس میں اپنی کہانی بھی دیکھ لیں تو مزہ دگنا نہیں تگنا ہوجاتا ہے۔سب سے پہلے تو ''ڈر'' کے سب لکھاریوں اور قارئین سے یہ گزارش کروں گی کہ میرے لئے دعا کردیں کہ بہترین نمبروں سے اس امتحان کے بھوت کو پچھاڑ سکوں۔پھر یہ کہوں گی کہ آپ سب کی وجہ سے ہی ڈر دن دگنی رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔اسی طرح ہی بہترین اور عمدہ تحریریں لکھ کر ڈر کی رنگینیوں میں مزید اضافہ کرتے رہیں۔امتحانات شروع ہونے سے پہلے سوچا ایک زبردست سی تحریر لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کردوں پھر تو امتحانات کے بعد ہی ارسال کروں گی۔تو جناب ہم اپنی تحریر ارسال کررہے ہیں کمی بیشی دور کردیجئے گا اور پھر شائع کردیجئے گا۔ڈر سے متعلق تمام احباب کو سلام۔دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔والسلام۔

☆☆فاطمہ خان صاحبہ: آپ کی کہانی ''آسیبی مسکن'' آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔کہانی کمپوز ہوچکی ہے اور ہاں یاد آیا......آپ کی نئی ارسال کردہ کہانیاں بہت چھوٹی ہورہی ہیں جو کہ ڈر کے بہ مشکل 3 صفحات بھی نہیں ہوں گی۔پلیز!اس کا ذرا خیال رکھئے گا۔Thanks۔

رشک نور فیصل آباد سے،السلام علیکم!مارچ کا شمارہ دیکھ کر خوشی ہوئی اپنی کہانی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی خط اور غزل ڈائجسٹ میں نہ تھی جس سے مجھے تھوڑا دکھ ہوا۔راشد نذیر طاہر صاحب کی اہلیہ کے انتقال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔سب سے پہلے رانا عامر شہزاد کی کہانی خوفناک رات پڑھ کر دل میں ایک عجیب سا ڈر پیدا ہوا۔زبردست اسٹوری تھی۔کامنی شامنی بھی اچھی کہانی تھی۔شاعری میں نینا خان، کائنات رشک تنویر، ڈاکٹر رانا عامر شہزاد، محمد حنیف شاکر، خضر حیات، رانا زوہیب کی شاعری اچھی تھی۔آخر میں اب ایک نئی کہانی بھیج رہی ہوں۔امید ہے پسند آئے گی اور ایک بات انکل جی میری چار

اپریل کو سالگرہ ہے میری کہانی شائع کرکے مجھے دوہری خوشی دیں۔ آخر میں پاکستان زندہ باد۔

☆☆ رشک نور صاحبہ: سالگرہ بہت بہت مبارک ہو اور اس خوشی میں کہانی ''آسیبی پارلر'' شامل اشاعت ہے۔ آئندہ ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ کہانی لکھ کر پڑھ لیا کریں اور اس طرح کہانی کی تصحیح ہوجائے گی۔ امید ہے اس بات پر غور کریں گی ضرور۔

مسز سندس اقبال راولپنڈی سے، اپریل 2018 کا ڈر پڑھ کر ایک خاص خوشی کا احساس ہوا۔ خوشی کی وجہ یہ ہے کہ ایک جانب سرورق انتہائی معیاری اور شاندار تھا تو ساتھ میں فیورٹ رائٹر احسان الحق صاحب کی کہانی بھی شائع ہوئی۔ 'المیہ' ایک ایسی کہانی ہے جسے میں نے تین مرتبہ پڑھا۔ کہانی میں ایک خاص کشش تھی۔ ایک خاص کرشاتی انداز میں لکھی یہ کہانی بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ بہت ہی زبردست۔ شاہد بھائی! ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے منہ میاں مٹھو بنے رہتے ہیں۔ سیاستدان سے لے کر عام آدمی تک سب کا یہی عالم ہے۔ اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا ہی نہیں چاہتے۔ خوب سے خوب تر سیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ عوامی رائے سب سے بڑی ہوتی ہے۔ کوئی بھی گروہ اپنی جماعت کی تعریف کرے تو یہ تعریف نہیں ہوتی، محض پروپیگنڈہ ہوجاتا ہے۔ اس وقت وطن عزیز میں ہر شعبے میں یہی روش ہے۔ Improvement کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ آپس کی بندر بانٹ جاری ہے۔ شاہد بھائی! یہ بات میں یہاں اس لئے عرض کررہی ہوں کہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا بذات خود ناکامی کی واضح دلیل ہے۔ اعوام الناس کی پسند کی کسوٹی پر پورا نہ اترنے کی دلیل ہے اور اوپر سے شکوہ بھی ہے کہ جی ہمیں کسی خاطر میں نہیں لاتے۔ کام کوئی بھی ہو، سیاست اور ریاستی امور سے لے کر ایک عام طالب علم کے پڑھنے تک۔ سب کام محنت کے متقاضی ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں وطن عزیز کا ہر رائٹر بھی شامل ہے۔ اپنی محنت اور کام سے ثابت کریں کہ آپ بحیثیت رائٹر اپنی کہانی کے ساتھ انصاف کررہے ہیں یا نہیں؟ ہم قارئین، عام لوگ یعنی پڑھنے والے، خود ہی سمجھ جائیں گے کہ رائٹر نے کیا لکھا ہے، کن الفاظ کے ساتھ اور کیسا لکھا ہے۔ آپ کا کام ہی آپ کا نام بن جائے گا۔ پھر آپ میں سے کسی کو بھی خودستائشی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہی بات حکیم محمد سعید شہید صاحب نے بھی اپنی زندگی میں کہی تھی۔ مئی میں دو خوشیاں اور ملیں گی۔ ایس حبیب خان صاحبہ اور فلک زاہد کی کہانیاں آرہی ہیں۔ بس تیار ہوجائیں کہ ڈر میں خوب رونق بڑھنے والی ہے۔ سب کا کہانیاں لکھنے کا بہت شکریہ اور سب کے لئے دعاؤں کے ساتھ۔ اب اجازت دیجئے والسلام۔

☆☆ سندس صاحبہ: آپ کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں، واقعی مجھ سمیت ہر آدمی اپنے منہ میاں مٹھو بننا چاہتا ہے نہ ہمیں خود سے اور نہ ہی وطن عزیز سے قلبی لگاؤ رہ گیا ہے اور غور طلب بات ہے کہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی...... یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

مسز فرحین حامد رحیم یار خان سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، ڈرڈائجسٹ کا شمارہ اپریل 2018ء اس وقت زیر تبصرہ ہے۔ ڈر کا سرورق بہت خوش نما تھا۔ شہباز احمد صاحب (ایبٹ آباد) کی بات کو کچھ آگے بڑھاتے ہوئے یہ التجاء کروں گی کہ ڈر کے سرورق کو مزید خوفناک بنائیں۔ کیونکہ یہ کوئی غیر معیاری التجاء بھی نہیں ہے۔ خوفناک رسالے کا سرورق دیکھ کر خوف آنا چاہئے۔ تھینکس۔ اس مرتبہ اپنے فیورٹ رائٹر احسان الحق صاحب کی کہانی کو پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ سر احسان الحق! ڈر کے توسط سے میں ایک طویل عرصے سے آپ کے در پر دستک دے رہی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟ کہانی کیوں نہیں لکھ رہے؟ پھر آپ کی صحت کی خرابی کا معلوم ہوا۔ دعاؤں کا ایک سمندر اپنے آنسوؤں کے ساتھ رب کائنات تک پہنچایا، آخر کار آپ کی جانب سے کہانی آگئی اور پڑھ کر جہاں دل خوش ہوا تو دوسری جانب المیۂ قوم سے بھی آگاہی ہوئی۔ ایک ایک سطر ملک کی صورت حال کی بالکل صحیح عکاسی کررہی ہے اور جس انداز میں آپ نے کہانی کی صورت میں المیہ بیان کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ اسے کہانی کے طور پر پیش کیا ہے، ایک تقریر بننے نہیں دیا۔ یہ آپ کا ہی خاصہ ہے، سر۔ ایسی دلچسپ، المیے سے بھرپور، خوبصورت، حقیقت پسندانہ کہانی لکھنے پر آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اور ڈرڈائجسٹ کی مینجمنٹ کی بھی میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ دوسری کہانی جان لیوا پڑھی جو کہ حسب معمول ایک بہترین اور لاجواب کہانی ہے۔ آخری کہانی بھی پڑھی جو کہ ضخیم کہانی تھی۔ پسند آئی، مزید کوشش کریں، آپ بہت اچھا لکھ سکتے ہیں۔ فلک زاہد اور ایس حبیب خان کی کہانیاں اس مرتبہ ڈر میں شائع ہورہی ہیں۔ دل اور بھی خوشی سے سرشار ہے۔ اس مرتبہ کے لئے اتنا ہی۔ والسلام۔

☆☆ فرحین صاحبہ: لیجئے فلک زاہد اور ایس حبیب صاحبہ کی کہانیاں شامل اشاعت ہیں خوش ہوجایئے، ٹائٹل اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، جونہی کام سے فارغ ہوا

اور شہر جانے کا اتفاق ہوا۔ جب بکسٹال پر پہنچا تو ماہ اپریل کے ڈر ڈائجسٹ سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ سرورق بڑے کمال کا تھا۔ پرچہ ملتے ہی دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ مثلاً خطوط، قرآن کی باتیں، قوس قزح کے اشعار، غزلیں اور کہانیاں وغیرہ خوب سے خوب تر ہوتی ہیں۔ ہر ماہ مقررہ تاریخ پر ڈر ڈائجسٹ کا ہمیں بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے خط اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے سرشار ہو کے ہم آپ کو خط تحریر کرتے ہیں، اس بار غزلوں کا سلسلہ مختصر سا تھا جن کہانیوں نے متاثر کیا طوفانی رات، نیا گھر، اندھیرے سے اجالے تک، محبتیں شمار کرنا، اندھیرے کا مسافر وغیرہ ہے۔ تمام احباب کے خطوط پڑھ کے ڈر ڈائجسٹ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرچے کا اپنا ایک الگ معیار ہے۔ نئے نئے قلم کاروں کو اپنے پرچے میں جگہ دیتے ہیں بڑی مسرت کی بات ہے۔ میں شب و روز پرچے کی ترقی کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆☆ اسلم صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، زندگی کوشش اور مسلسل کوشش کا نام ہے، یعنی دنیا ہے سکھ سے خالی، دکھ چار سو بھرا ہے، غم کے سوا یہاں پر سوچو تو کیا دھرا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ اپریل کا شمارہ وقت سے پہلے مارکیٹ میں آ گیا۔ جو کہ ایک اچھا اقدام اور آپ سب کی پرخلوص محنت کے باعث ممکن ہوا۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ Stroy`s اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ لکھاریوں کے قلم نکھرتے جا رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔ ڈر ایک خوب صورت میگزین ہوتا جا رہا ہے جو کہ قارئین اور لکھاری اور ڈر مینجمنٹ کا خوب صورت اشتراک ہے۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ ڈر کے تمام اسٹاف اور ڈر کے خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے وویورز کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: ارسال کردہ تحریریں شامل اشاعت ہیں اور مزید تحریریں موجود ہیں جو کہ آنے والے شمارے میں شامل اشاعت ہوں گی۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ شکریہ۔

محمد دانیال جونیہ روڈہ تھل سے، السلام علیکم! جناب انکل جی آپ کیسے ہیں، امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پورے اسٹاف کو سدا خوش رکھے۔ سلامت رکھے اور لمبی عمر دے۔ ڈر میگزین کے تمام قارئین رائٹرز کو میرا پیارا بھرا سلام قبول ہو۔ اپریل کا شمارہ ایک خوفناک اور بھیانک ٹائٹل کے ساتھ 25 اپریل کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی خوفناک اور بھیانک تھا اور ساتھ ساتھ خوب صورت بھی تھا اس نے پورے شمارے کو آٹھ چاند لگا دیئے۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ ہر لحاظ سے اچھا اور سپرہٹ تھا۔ سب کہانیاں بہت بہت خوفناک اور بھیانک تھیں۔ مجھے 5 دن رات کو سوتے وقت ڈر لگتا رہا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور ہر لحاظ سے سپرہٹ تھیں۔ اگر یہ کہوں کہ فلاں اچھی تھی فلاں بری تھی تو یہ بالکل ناانصافی اور زیادتی ہوگی۔ قوس قزح میں گیا تو دل خوشی سے دوبالا ہو گیا۔ سب غزلیں بہت بہت ہی سپرہٹ تھیں۔ اپنی غزل دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں مزید ایک غزل اور شعر بھیج رہا ہوں۔ پلیز مئی کے شمارے میں ضرور لگا دیجئے گا۔ اب تک کے لئے اتنا ہی زندگی نے وفا کی تو انہی صفحات کے ساتھ آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ میری دعا ہے کہ ڈر میگزین دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ دانیال صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے اور آئندہ ماہ بھی پرخلوص تجزیہ کے لئے شکریہ قبول کریں، آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد حنیف شاکر ننکانہ صاحب سے، سلام مسنون کے بعد خیریت کا طالب خداوند قدوس کے فضل و کرم سے خیریت سے اور آپ کی خیریت کے لئے ہر وقت رب ذوالجلال سے دعا گو ہوں۔ جناب 22 مارچ کو ملتان سے گھر واپس پہنچا تو اپریل کا شمارہ میری آمد کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ غزل، شعر اور خط شائع کرنے پر بہت بہت شکریہ۔ سرورق پر ڈراؤنی شکل کے ساتھ نیلی آنکھوں والی دوشیزہ بھی کچھ ڈری سہمی بیٹھی ہے۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازگی ملی خطوط کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ جناب عجب گل اداسی صاحب! محمد خالد عباس اور جناب ڈاکٹر عامر شہزاد صاحب نے کامنی شامنی کو پسند کیا۔ سب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خطوط میں سب نے اپنی اپنی رائے سے خوب انصاف کیا، لیکن ادارہ نے خطوط کے جو جوابات دیئے یہ سب خوب سے خوب تر ہیں۔ قوس قزح میں خوب رنگ بکھرے پڑھنے کو ملے، غزل کی دنیا میں قدم رکھا تو یہ کیا اس بار تو تمام غزلیں ایک سے بڑھ کر ایک ایسے معلوم ہوا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جیسے لفظوں کے سنہرے موتی بلکہ سچے موتی ایک ہی مالا میں پرو دیئے گئے ہوں کس کس کی تعریف کروں پھر ایس حبیب خان صاحبہ، رابعہ آفرین صاحبہ اور میرے پیارے عزیز ڈاکٹر عامر شہزاد صاحب کی غزلوں نے دل کی دنیا کو اتھل پتھل کر دیا سب کو اچھی غزلیں لکھنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ مہر پرویز دولو کی کہانی نے بھی بہت متاثر کیا۔ المیہ میں احسان الحق صاحب نے ڈراؤنی کم بلکہ معاشرہ کی عکاسی کی ہے۔ طبیعت ناساز رہنے کی بنا پر باقی کہانیوں کا مطالعہ نہیں کر سکا۔ جناب میں نے 20 مارچ کو "پراسرار بیل" روانہ کی ہے جو بالکل سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے اگر اچھی لگے تو قریبی اشاعت میں شامل کر لینا۔ "گونگا بہرا جن" کو لائن میں لگانے کا شکریہ اسے بھی جلد ہی لائن سے نکال کر آگے کھسکا دینا بڑی مہربانی، آخر میں خوفناک کہانیاں رسالہ نکالنے کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ مٹھائی ادھار رہی۔ زندگی رہی اور کراچی آنا ہوا تو ضرور زحمت دیں گے۔ آخر میں سب کو بہت بہت سلام۔

☆☆ حنیف صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، نئی کہانی موصول ہو چکی ہے، آئندہ شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔ شکریہ۔

خضر حیات روڈہ تھل سے، السلام علیکم! محترم پیارے انکل صاحب آپ کیسے ہیں۔ امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی ٹیم کو سدا خوش سلامت رکھے۔ اور لمبی عمر دے۔ ڈر کے سب رائٹرز اور قارئین کو میرا پیار بھرا سلام قبول ہو۔ ڈر کو پڑھنے اور ڈر کو چاہنے والوں کو بھی سلام قبول ہو۔ اپریل کا شمارہ ایک خوب صورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ 22 مارچ کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت خوفناک اور بھیانک تھا اور ساتھ دلکش اور خوب صورت بھی تھا۔ ٹائٹل ایک طرف اور شمارہ ایک طرف جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ ہر لحاظ سے سپر ہٹ تھا۔ سب کہانیاں بہت زبردست، اچھی عمدہ بھی تھیں اور ساتھ ساتھ خوفناک اور بھیانک بھی تھیں۔ جو کہانیاں مجھے بہت بہت ہی عمدہ اور اچھی لگیں۔ ان میں سب کی سب شامل ہیں۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ قوس قزح میں گیا تو دل اور بھی خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ سب کے سب اشعار بہت ہی اچھے تھے اور ساتھ ساتھ غزلیں بھی سپر ہٹ تھیں۔ اپنی غزل اور شعر دیکھ کر خوشی سے کیا ہوا کیا بتاؤں۔ باقی شمارہ ہر لحاظ سے سپر ہٹ تھا۔ ڈر کی سب سے بڑی خاص بات یہ ہے کہ 25 سے پہلے پہلے مل جاتا ہے۔ اس سے بڑی اور کیا خاص بات ہو سکتی ہے اب تک کے لئے اتنا ہی زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ دعا ہے ڈر دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ خضر صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ آپ کے لئے بھی ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں سے نوازے اور کلی صحت عطا کرے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ ارسال کرنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں سے، السلام علیکم! اپریل 2018ء کا ڈر دیکھ کر خوشی ہوئی، سرورق نے دل موہ لیا۔ "قرآن کی باتیں" میں ضرورت مندوں کی مدد پر زور دیا گیا اور نیکی بدی کی آگاہی ہوئی۔ خطوط میں محبتوں کے حاتم طائی حضرات پیار ومحبت کے پھول نچھاور کرتے نظر آئے، محترمہ سندس اقبال آپ کی شفقت کا بہت مشکور ہوں۔ مسز زینت خان بہت مہربانی اپنے چھوٹے بھائی کی حوصلہ افزائی کی۔ میرے محترم احسان الحق صاحب مجھے آپ کے تعریفی کلمات نے ہمیشہ کے آپ کا مقروض کر دیا ہے۔ آپ سینئر ادیب ہیں۔ میں تو آپ کی تحریریں پڑھ کر سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں آپ کی رہنمائی کا منتظر ہوں۔ شاہد عظیم آپ کی چاہتوں کا ممنون ہوں۔ عامر شہزاد رانا صاحب میں نے کسی دن آ جانا ہے پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی۔ جون میں چھٹیاں ہوتی ہیں۔ انشاء اللہ ننکانہ صاحب کی سیر کی کوشش کروں گا تھوڑا سا ایڈریس سمجھا دینا، محمد خالد عباس بہت شکریہ حوصلہ افزائی کا۔ خیر جو کسی ایوارڈ تقریب کے بارے میں تھی۔ اس میں اقبال نگر کے حوالے سے میرا نام تیسرے نمبر پر تھا۔ میرا تعلق میاں چنوں سے ہے۔ اس تقریب میں مجھے کسی قسم کا کوئی ایوارڈ نہیں دیا گیا اور نہ ہی میں تیسرے درجے کا لکھاری ہوں۔ خیر الحمدللہ پاکستان کے نمبر ون رسالوں میں عظیم ادیبوں کا تخلیق کردہ ادب پڑھتا ہوں اور رسالوں کے حوالے سے بے شمار لوگ مجھے قلبی لگاؤ سے یاد کرتے ہیں۔ المیہ میں احسان الحق صاحب ایک ہوس پرست ڈاکٹر کی بے ضمیری پر روشنی ڈال رہے تھے۔ محمد قاسم رحمان محبتوں کی طلب کردہ قربانی کی وضاحت کر رہے تھے۔ ارجن کمار بیٹی کی خوشیوں کے عوض اپنی عزت کا سورج روشن کر رہے تھے۔ پنڈت جگن اور اس کی پتنی سریتا کی بیٹی کا نام عالیہ پڑھ کر عجیب لگا یہ تو خالص پاکستانی مسلمان لڑکیوں والا نام ہے۔ راشد نذیر کی جان لیوا ابھی تو قاسم ماموں کی جان ممانی سحر اور وقار سے بچا رہی ہے۔ شکیل کو خانہ بدوش شالا ملتی ہے یا نہیں آگے پتہ چلے گا۔ رضوان قیوم رانی کی غلطی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ مذاق میں وعدے کی ہاں تا حیات سوہان روح بن گئی۔ منوں بابا کا بابا بھی کر پچن

عامل کی نفرت کا شکار ہو گیا۔ نیا گھر میں نینا خان ماموں کی خوشیوں پر روشنی ڈال رہی تھی۔ لیکن وہ گھر تو عذاب کدہ بن گیا اس خاندان کے لئے، میلاد اور استخارہ کے بارے میں ایک عالم صاحب کا خطاب دو ماہ قبل سنا ہے کہ سب سے افضل میلاد پانچ وقت کی نماز کی پابندی ہے اور آج کل خواتین کے میلاد کا طریقہ چل نکلا ہے۔ شرعاً سخت منع ہے۔ عورت کو تو گھر کے اندر پاؤں زور سے اٹھا کر چلنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس آج خواتین بہ بانگ دہل ٹیلی ویژن پر محفل میلاد و غیرہ مرد حضرات کے سامنے پڑھ رہی ہیں اور آئے روز اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ استخارہ کے بارے میں حکم ہے دن کے کسی بھی کام کو ذہن میں رکھ کر دو رکعت نفل پڑھو۔ بعد میں فائدہ ہو تو وہ کام کر لو۔ نقصان کی صورت میں ترک کر دو۔ یقیناً کسی بھی دوسرے شخص کا استخارہ درست نہیں ہوتا۔ ملک فہیم ارشاد اپنے انداز میں ہندو طلبا کو تبلیغ کر کے اسلام کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ طارق محمود بہت خوب صورت سبق دے رہے تھے، فرشتہ سیرت تفتیشی افسر نے برائی کے قلع قمع کے لئے رہائی کا پروانہ تھما دیا۔ نسرین رانا، شہر خموشاں میں دلوں کے فیصلے تبدیل ہونے کی روداد بیان کر رہی تھیں۔ صبا کی نفرت بھی انتہا کی تھی اور چاہت میں بھی کمال کر دیا اور پالیا۔ گمنام گلاب خان سونگی تمام مرحومین کے واقعے کمال تھے لیکن بوڑھے چوکیدار کی موت سمجھ نہ آئی۔ اسرار خالد شاہان کی بہت دلچسپ تحریر ہے۔ راج کماری اپنے وطن پہنچ کر موت کے منہ میں چلی گئی۔ شریم جب ناگو مکار کے ہتھے چڑھا تو ایک بار تو خوف سے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ خونخوار بلی اسکول میں بچوں کی بیری کی رکھوالی کر رہی تھی۔ فرخ، خرم کو اس نے سبق تو سکھانا تھا۔ ملک فرخ ندیم خوب تحریر لائے۔ شانزہ اعوان کی رانی نے حمید اور عارف کو موت سے ہمکنار کر کے اپنی بے گناہی کا بدلہ لیا۔ مریم فاطمہ کی طوفانی رات اگرچہ نام چینی تھے لیکن فروری کے پراسرار ہوٹل کی ہو بہو کاپی تھی۔ ویران مندر کتنے ہی واقعات کا مرغوبہ تھی۔ صغراں کمہارن، گڑ کی ڈلی اور بیل گاڑی کمال کا منظر نگاری تھی۔ یہ خالص ہمارا دیہاتی کلچر ہے اور کتابوں میں بہت خوب صورت لگتا ہے۔ نمبر دار اور گاؤں والوں کا آفت کا پیچھا کرنا رشید کی ماں سے شاہ بابا کا مندر کے چبوترے پر نیلوفر کے پھول رکھوانا عجیب لگا۔ شاہ بابا تو مسلمان تھا مندر سے اس کا کیا تعلق؟ تمام کہانیاں لاجواب تھیں، چاہتوں کے امین ستاروں نے آسمان ادب کو چمکا رکھا تھا۔

☆☆ مہر پرویز صاحب: عزت دینے والی اللہ کی ذات ہے اور آپ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، ادب کے حوالے سے بے شمار لوگ آپ کو عزت کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور عزت دے۔ (آمین)

عبدالجبار رومی انصاری قصور سے، السلام علیکم! قرآن مجید کے روشن موتی زندگی کے ہر لمحے کے لئے رشد و ہدایت کا باعث ہیں۔ اے کاش اللہ کے پیارے بندے بھی ان روشن موتیوں کو سمجھنے والے اور دلوں میں اتارنے والے بن جائیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ پل کی بھی خبر نہیں۔ ایسے ہی میرے والد محترم بھی ہنستے مسکراتے 10 فروری کی صبح ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور بلند درجات عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ مسز سندس اقبال کا جامع تبصرہ اچھا لگا۔ فلک زاہد پہ آئی بلا ٹل گئی۔ اللہ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ مسز زینت خان، ایس حبیب خان، رشک نور، احسان الحق، طارق محمود، ڈاکٹر عامر شہزاد، محمد اسلم جاوید اور مہر پرویز احمد دولو کے تبصرے زبردست رہے۔ اسی طرح قوس قزح اور غزل میں سمیرہ عباس، محمد دانیال، الماس تنویر، رابعہ آفرین اور محمد اسحاق انجم کے شعر و غزل اچھی لگی۔ محبتیں شمار کرنا اچھی کہانی تھی مگر اس میں شعر و شاعری اچھی نہیں لگی۔ کہانی میں صرف ایک آدھ شعر ہو تو ٹھیک لگتا ہے۔ ورنہ کہانی کو کہانی ہی کی طرز پر لکھنا چاہئے۔ ایک نام کی طرح اسرار میں تو نئے سے نئے اسرار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سمندری عفریت سے جان چھوٹی تو راج کماری کو وحشی جنگلیوں نے پکڑ لیا ناگو کی چال ناکام بنا کے شریم نے رہائی حاصل کی تو اب راج کماری کی خبر لینا ہے عمدہ کہانی۔ اندھیرے کے مسافر مجاہد کی سرگزشت بھی اچھی رہی جو انسانیت کے دشمنوں سے برسر پیکار رہتا ہے۔ گمنام ریلوے اسٹیشن کی روحوں نے اور پراسرار گاڑی نے بوڑھے چوکیدار کو بھی زندگی سے نجات دلا دی۔ ایک دوسرے کو ڈرانے والے خود بھی عبرت انگیز تھے۔ کہانی اچھی لگی۔ جیون کا کوئی دشواش نہیں کب اکھڑ جائے اس لئے اوپر والے کا اصل اور حقیقی راستہ چن لینا چاہئے۔ برائی سے سچائی کی راہ پر لاتی عبداللہ، سنتوش، ساکھشی کاویری اور رنبیر جیسے انسانیت دوستوں کی خوب صورت کہانی بہت پسند آئی۔ ویران مندر کے عفریت نے تو گاؤں والوں کا جینا ہی حرام کر دیا۔ بھیڑیے اور کالے بلے کے روپ میں شیطان نے کئی زندگیوں کا خون پی لیا۔ آخر ان سب کے بڑے گرو سادھو پردیپ سنگھ نے ہاتھ ڈالا اور اسے مار دیا۔ تب جا کر گاؤں والوں کو کچھ نجات ملی ورنہ ویران مندر کی جانب وہ کبھی بھی نہیں جا سکتے۔ خوف دہشت سے بھرپور کہانی ویران مندر زبردست رہی۔

☆☆ عبدالجبار صاحب: آپ کے والد صاحب کا پڑھ کر دل بہت زیادہ دکھی ہوا کہ ایک شخص سالوں سال ساتھ رہتا ہے اور ایک لمحہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بھی نہیں لگتا کہ وہ گھر والوں کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے...... خیر یہی نظام قدرت ہے۔ ہر شخص نے ایک دن جانا ہے...... ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پل پل ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا رہے اور آپ تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

ڈاکٹر رانا عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب، رائٹرز دیگر لکھنے والے اور قارئین السلام علیکم، 21 مارچ کو ڈیوٹی سے واپسی پر ٹی وی ٹرالی پر پڑے خاکی لفافے پر نظر پڑی جسے دیکھ کر دل تروتازہ ہوگیا۔ فوراً رسالہ نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ ہر دلعزیز ایڈیٹر صاحب اتنی جلدی اعزازی کاپی بھیجنے پر میں تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں۔ اس بار سرورق واقعی بہت خوب صورت اور ڈراؤنا لگا ہمیشہ کی طرح قرآنی صفحہ پڑھ کر روح کو سکون ملا۔ شمارے میں اپنا لیٹر، شعر اور غزل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، مگر کہانی شائع نہ ہونے پر واقعی دلی دکھ ہوا۔ جناب کے پاس میری دو کہانیاں (جو میں نے بہت لگن اور محنت سے لکھی تھیں) ایڈوانس پڑی ہوئی ہیں۔ مگر نجانے مجھے انتظار کی لمبی سولی پر کیوں لٹکایا جارہا ہے؟ اس بار تبصروں میں مسز سندس اقبال، فلک زاہد، رابعہ آفرین، مسز زینت خان، ایس حبیب خان، خدیجہ فاطمہ، مسز فرحین حامد، مریم فاطمہ، رشک نور، فاطمہ خان، محترم احسان الحق ہر دلعزیز محمد حنیف شاکر اور خالد عباس نے عمدہ اور جامع تبصرے لکھے۔ کہانیوں میں احسان الحق کی ''المیہ'' فاطمہ خان کی ''خونی نمبر'' ایس امتیاز احمد کی ''پراسرار مخلوق'' نینا خان کی ''نیا گھر'' طارق محمود کی ''اندھیرے کا مسافر'' نسرین رانا کی شہر خموشاں، شازیہ اعوان کی ''بے چین روح'' مریم فاطمہ کی ''طوفانی رات'' اور شہزاد خان کی ''ویران مندر'' ٹاپ اسٹوریز ثابت ہوئیں۔ باقی زیر مطالعہ ہیں۔ قوس قزح میں ایس حبیب خان، سمیرہ عباس، حافظ عابد علی، محمد حنیف شاکر، محمد اسلم اور مہر پرویز صاحب کے بہترین اشعار پڑھ کر خوشی ہوئی، غزل میں ایس حبیب خان، واجد نگینوی، فلک زاہد، محمد حنیف شاکر، رابعہ آفرین، رشک نور اور خالد عباس نے اعلیٰ کوالٹی کی غزلیں لکھیں۔ نیز ایس امتیاز احمد کی ''یہ وقت'' افشیں ستار کی ''اثر'' ایس حبیب خان کی ''رزق مقدر'' نینا خان کی ''ایک حقیقت'' اور شرف الدین جیلانی کی ''گوہر آبدار'' عمدہ اور سبق آموز تحریریں دل کو لگیں۔ ماشاءاللہ تمام رائٹرز بہت محنت سے لکھ رہے ہیں۔ انہی کے دم سے ''ڈر'' اپنے عروج تک پہنچ رہا ہے۔ فلک زاہدہ صاحبہ کے لئے دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے۔ تمام رائٹرز صاحبان سے میری عاجزی سے گزارش ہے کہ براہ مہربانی آپ کہانیوں کے علاوہ اشعار، غزل اور دیگر تحاریروں پر بھی ضرور تبصرہ کیا کریں تاکہ نئے ابھرتے ہوئے شعرا اور رائٹرز کی بھی حوصلہ افزائی ہو آخر وہ بھی ڈر کا باقاعدہ ''حصہ'' ہیں۔ ایڈیٹر صاحب مجھے آپ سے ایک چھوٹا سا گلہ ہے۔ آپ میری کہانیاں شائع نہیں کررہے۔ جناب آخر بندہ ناچیز سے کیا غلطی ہوگئی ہے۔ خیر میری دعا ہے کہ پاکستان کا نمبرون ڈر ڈائجسٹ'' ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ (آمین)

☆☆ عامر شہزاد صاحب: خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، اگر آپ دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں تو دل سے یہی صدا آئے گی کہ زیادہ گلہ یا شکوہ ٹھیک نہیں، کیونکہ آپ کی کہانیاں متواتر شائع ہورہی ہیں اور اگر ایک ماہ کہانی شائع نہ ہوئی تو کوئی مسئلہ نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ بڑی کہانی لائن میں لگ کر انتظار کی سولی پر لٹک جاتی ہے۔ خوش ہوجایئے، کہانی شامل اشاعت ہے۔

محمد قاسم ہری پور سے، اسلام علیکم، 25 مارچ کو یونیورسٹی سے واپسی پر نئے ڈائجسٹ کے درشن ہوئے تو دل گل گلزار ہوگیا۔ ٹائٹل خوبصورت بھی تھا اور خوفناک بھی۔ ایڈیٹر صاحب آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تحریر کو شمارے میں جگہ دی۔ لاورث جن زادی کے شائع ہونے کا بھی شدت سے منتظر ہوں۔ احسان الحق صاحب نے ہمیشہ بہت اچھا لکھا ہے اس مرتبہ المیہ بھی ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ فاطمہ خان اور ایس امتیاز احمد کی کہانیاں بھی خوب تھیں۔ خبیث روح ٹاپ آف دی منتھ رہی۔ نینا خان کی کہانی نیا گھر نے بھی متاثر کیا۔ سفاک کون، گمنام اسٹیشن اور طوفانی رات بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ ویران مندر ایک نہایت خوفناک ناول تھا۔ قسط وار کہانیاں سرپٹ میں دوڑے جارہی ہیں، ان میں کچھ تبدیلی آنی چاہیے۔ البتہ رولوکا کی آخری قسط نا پڑھنے کا ملال ہے، کیونکہ مجھے شمارہ نہ مل سکا۔ ساحل دعا بخاری اینڈ عطیہ زاہرہ کہاں غائب ہیں؟ ان سے بھی کوئی کہانی لکھوائیں۔ اگلے ماہ تک کے لئے اجازت۔

☆☆ قاسم صاحب:

ربیعہ امجد قصور سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب امید ہے کہ آپ خیریت سے ہونگے۔ میں کافی سالوں سے ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں لیکن کہانی پہلی بار بھیج رہی ہوں۔ میں نے اس سے پہلے نئے افق ڈائجسٹ میں ہی لکھا ہے۔ اس کے

علاوہ پچھلے سال صائمہ ڈائجسٹ کے ستمبر اور اکتوبر کے شمارے میں دو قسطوں پر مشتمل میرا ایک ناول آیا تھا۔ ڈر کے لیے یہ میری پہلی کہانی ہے امید ہے کہ میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ دعاوں کی طلب گار ربیعہ امجد۔

☆☆ ربیعہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، کہانی آئندہ شمارے میں شائع ہوگی اور ہاں کہانی لکھنے کے بعد ایک مرتبہ پڑھ کر اصلاح کرلیا کریں۔ Thanks۔

فرح انیس ،السلام علیکم جناب ایڈیٹر صاحب امید کرتی ہوں کے سب خیریت سے ہونگے اور دعا ہے رب کائنات سے کہ وہ سب پر اپنا فضل وکرم رکھے) آمین (میرا نام فرح انیس ہے کراچی سے میرا تعلق ہے، پچھلے تین سال سے دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں لکھ رہی ہوں، کچھ دنوں پہلے میری محترمہ فلک زاہد سے بات ہوئی جو ڈر ڈائجسٹ کی لکھاری ہیں ان سے کافی آپ کے شمارے کی تعریف سنی، پہلی بار خریدنے کا اتفاق ہوا اور اندازہ ہوا کے محترمہ کی تعریف غلط نہیں۔ پھر کیا تھا ڈر کی محفل میں میں نے بھی ڈرتے ڈرتے پہلی حاضری لگادی، پراسرار کہانیوں سے مجھے عشق ہے اور اب اس عشق کا اظہار ڈر کے شمارے میں ایک تحریر بھیج کر کر رہی ہوں اگلے ماہ انشاءاللہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری لگاؤں گی زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ ملاقات ہوگی اللہ حافظ۔

☆☆ فرح صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، بہت بہت شکریہ کہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ، بہت اچھا لگا، کہانی آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔ کہانی لکھنے کے بعد پڑھ کر فیئر کرلیا کریں تو اچھا ہوگا۔

احسان الحق ،السلام علیکم محترم ایڈیٹرز صاحبان، رائٹرز اور قارئین کرام! اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ اپریل 2018ء کا ڈر ڈائجسٹ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کیونکہ سرورق بے حد متاثر کن ہے اور لکھنے والے تمام رائٹرز نے اس میں خوب لکھا۔ کہانیوں میں فاطمہ خان صاحبہ، ایس امتیاز احمد صاحب، قاسم رحمان صاحب، رضوان قیوم صاحب، نینا خان صاحبہ، طارق محمود صاحب، محترم دولو صاحب، نسرین رانا صاحبہ، گلاب خان سولنگی صاحب، شکیل نیازی صاحب، فرخ ندیم صاحب، شانزہ اعوان صاحبہ، مریم فاطمہ صاحبہ سب نے خوب کاوش کی۔ جان لیوا کے مصنف جناب راشد نذیر طاہر صاحب نے اس مرتبہ پھر سے پڑھنے والوں کی جان نکالنے کا بیڑا اٹھالیا اور اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے، بہت زبردست لکھا۔ شہزاد خان صاحب کی کہانی بھی خوب رہی۔ اس کے علاوہ فلک زاہد صاحبہ کی علالت کی خبر پڑھ کر دل دعا گو ہے۔ ہماری بہن ایس حبیب خان صاحبہ کے لئے دعا گو ہوں، آپ کا بے حد شکریہ کہ اس مرتبہ آپ کی کہانی سے بڑھ کر نا چیز کے لئے دوسرا کوئی تحفہ نہیں ہوگا ڈر میں۔ دولو صاحب سے التجا خاکسارانہ ہے کہ چھوٹی ہی سہی لیکن ہر ماہ مستقل ڈر میں کہانی ضرور لکھیں، شکریہ۔ ڈر ڈائجسٹ کی مینجمنٹ اور ٹیم کا خاص شکریہ کہ رسالے کو بہترین انداز میں مزین کرکے قارئین اور رائٹرز کے سامنے لاتے ہیں، بہت شکریہ۔ اب اجازت دیجئے، والسلام وخیر اندیش۔

☆☆ احسان صاحب: لیجئے جس کا انتظار تھا وہ شاہکار آ گیا۔ یعنی فلک زاہد اور ایس حبیب صاحبہ کی کہانیاں شامل اشاعت ہیں۔ اور اب قوی امید ہے کہ قارئین کی پسندیدہ یہ دونوں رائٹرز اپنی اپنی کہانیاں ضرور ارسال کریں گی تاکہ انہیں پڑھنے والے خوش ہوسکیں گے۔ اور ہاں ہم اور قارئین آپ کی صحت کے لئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا فرمائے۔

عجب گل اداسی ٹنڈوالہ یار سے، امید ہے کہ پوری ڈر ڈائجسٹ ٹیم اور رائٹر حضرات خیروعافیت سے ہوں گے۔ لیکن میں خیریت سے نہیں ہوں، کیوں کہ جو کہانیاں میں نے اپنے بچپن میں لکھی تھیں وہ میرا بڑھاپا آجانے تک ڈر میں نہیں لگیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں جب بھی خط لکھتا ہوں تو صرف اسی موضوع پر لکھتا ہوں۔ تو پھر میں کیا کروں؟ اس موضوع سے میرا پیچھا چھوٹے تو میں کوئی دوسری بات چھیڑوں، ہر بار مجھ سے کہا جاتا ہے کہ دل مضبوط کریں آپ کی کہانی لگ جائے گی۔ دل معصوم کو میں نے مضبوط کرکے پتھر بنادیا پھر بھی کہانیاں نہیں لگیں۔ اب آپ مجھے صاف صاف، سال مہینہ کا نام واضح بتائیں جس میں میری کہانی لگے گی۔

☆☆ عجب گل صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دلی دکھ ہوا، کیونکہ بچپن سے آپ کہانی لکھتے آرہے ہیں مگر افسوس صد افسوس کہ کہانی ابھی تک شائع نہیں ہوئی، ویسے بھی بچپن اور بڑھاپے کی سوچ اور شعور میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، دکھ تو مجھے بھی بہت ہے لیکن آپ نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ آپ کی کہانی کیوں شائع نہیں ہورہی۔ ایک دو کہانی لکھ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا کیا یہ ٹھیک ہے، میں اکثر اور بار بار تمام نئے رائٹروں سے کہتا ہوں کہ جناب لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔ اکثر نئے رائٹروں کی کہانی اصلاح نہیں بلکہ پوری کی پوری لکھنی پڑجاتی ہے۔ خیر آپ ان باتوں پر غور کیجئے گا اور ہاں میرا یہ پکا وعدہ ہے کہ آئندہ شمارے میں آپ کی کہانی شائع کردی جائے گی۔ ☆☆

پراتی شود

ایس حبیب خان-کراچی

چھن چھن کی زور دار آواز سنائی دی، اور پھر ایک عورت نما عفریت کی شکل نظر آئی اور پھر جب اس عفریت کا منہ کھلا تو نوجوان کی فلک شگاف چیخیں نکل گئیں کہ اتنے میں......

ایک مغرور اور ناک پر مکھی نہ بیٹھنے والے شخص کی عبرت ناک اور لرزہ براندام کہانی

"سر! لیفٹ سائیڈ بند ہے اسی وجہ سے سارا ٹریفک ایک ہی جگہ آ گیا ہے، جتین سر کے آفس پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹہ لگے گا۔" ڈرائیور نے شیشے میں سے دیکھتے ہوئے پیچھے بیٹھے ہرش سے کہا۔

"شٹ!" ہرش نے جھنجلا کر ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا پھر کچھ سوچا اور بولا۔

"گووِندا! کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے، جس سے ہم ترنت پہنچ سکیں؟" گووِند نے سوچا پھر بولا۔

"سر! شارٹ کٹ ہے پرنتو......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پرنتو کیا......؟" ہرش نے پرشن کیا۔

"سر! وہاں سے گزرنا آپ کو اوچت نہیں لگے گا وہاں پر نردھنوں کی جھونپڑیاں ہیں۔" گووِند کے کہنے پر ہرش کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ بولا۔

"تم نے ٹھیک کہا گووِند وہاں سے گزرنا ہمیں شوبھا نہیں دیتا۔ پر اس سے وہاں پہنچنا ضروری ہے بہت اہم ڈیل ہے جو میں اور جتین آج سائن کرنے جا رہے ہیں، پارٹی ڈیل کے فوراً بعد باہر چلی جائے گی اس کارن ہمیں وہاں (شارٹ کٹ) سے چلنا سویکار ہے کیول اسی سے کے لئے۔" ہرش کے کہنے پر گووِند نے گاڑی موڑ لی۔

ہرش وردھن کا شمار دیش کی جانی مانی ہستیوں میں ہوتا تھا، اس کی پتنی اور بچے دیش سے باہر رہتے تھے۔ ہرش وردھن بے حد اہنکاری تھا روپوں سے جتنا دھنی وہ تھا دل سے وہ اتنا ہی چھوٹا تھا۔ اہنکار اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ غریب خانہ بدوشوں کو کیڑے مکوڑے کی طرح سمجھتا تھا ان سے بات کرنا تو دور ان کے قریب سے گزرنا تک پسند نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ نہایت مجبور ہو کر اس طرف سے جانے پر راضی ہوا تھا۔ غریبوں کی بستی شروع ہونے سے پہلے ہی ہرش نے گووِند سے گاڑی میں اسپرے کرنے کا کہا۔ بستی شروع ہوئی تو ہرش کبھی اپنی گھڑی دیکھتا کبھی موبائل وہ باہر کا منظر دیکھنا تک گوارا نہیں کر رہا تھا ایک دم گاڑی کے نیچے کوئی چیز آئی تو گاڑی نے جمپ کیا تو ہرش کا دھیان ہٹا اور اس نے بے اختیار باہر دیکھا باہر دیکھنا تھا کہ اس کے شیطانی دماغ میں کچھ آیا اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور ناک پر رومال رکھ لیا اس کی اس حرکت پر گووِند حیران ہو گیا۔

ہرش وردھن کا چھوٹے لوگوں کا دیدار کرنا؟ گووِند کے دماغ میں نہیں سما رہا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"سر! کوئی پرابلم......؟" گووند سے رہا نہ گیا تو اس نے پوچھا۔

"پرابلم......؟" ہرش نے کہا اور قہقہہ لگایا۔

"اس سنسار میں ایسی کوئی چیز ابھی پیدا ہوئی نہیں ہوئی ہے جو ہرش وردھن کے لئے پرابلم کری ایٹ کر پائے، ہرش وردھن خود اس سنسار کے لئے بگ پرابلم ہے۔" ہرش نے غرور سے کہا تو گووند خاموش ہوگیا۔

گاڑی کچھ ہی دیر میں جتین کے آفس پہنچ گئی۔

"واؤ! ہم تو ترنت پہنچ گئے۔" ہرش نے کہا۔

"یس سر! اس شارٹ کٹ سے آدھا سے لگتا ہے۔" گووند نے بتایا تو ہرش نے سر ہلایا اور تیزی سے گھڑی دیکھتے ہوئے اندر چلا گیا۔

جتین ہرش کا صرف بزنس پارٹنر ہی نہیں بلکہ اس کے بچپن کا دوست بھی تھا اور ہرش اپنی ہر بات، اپنا ہر معاملہ جتین سے ڈسکس کرتا تھا۔

پچاس کروڑ کی ڈیل سائن کرنے کے بعد ہرش اور جتین بہت خوش تھے اور فائیو اسٹار ہوٹل میں لنچ کر رہے تھے۔ ہرش کو ایک دم کچھ یاد آیا تو وہ جتین سے بولا۔

"جتین یہ جو تیرے آفس کے پیچھے زمین ہے جہاں جھونپڑیاں ہیں وہ کس کی ہے؟"

"وہ خانہ بدوشوں کی بستی؟ وہ زمین تو گپتا جی کی ہے۔" جتین نے چمچے سے سوپ کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہی کیڑے مکوڑوں کی بستی! مجھے اپنے راستے میں آنے والی اس جگہ سے صفایا چاہئے اور ویسے بھی وہ کافی کام کی زمین ہے اگر مجھے وہ مل جائے تو میں ان کیڑے مکوڑوں کو صاف کر کے اپنے کام میں لے سکتا ہوں۔ کافی بڑی جگہ ہے ساتھ ہی میں اپنا نیا آفس وہیں بنواؤں گا تو میرا آفس تیرے بالکل قریب ہو جائے گا۔" ہرش وردھن نے سوپ باؤل میں چمچہ گھماتے ہوئے کہا۔

"ہوں! وچار تو اچھا ہے مگر یہ سب گپتا جی پر نربھر کرتا ہے کہ وہ یہ زمین ہمیں دیں گے یا نہیں۔" جتین نے نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں آج ہی گپتا جی سے بات کرتا ہوں......"

ہرش نے کہا ساتھ ہی ویٹر آ گیا اور اپی ٹائزر کے بعد لنچ سرو کرنے لگا۔

☆......☆......☆

شیکھر گپتا بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور ملازم ٹرالی میں ناشتہ لے کر آ رہا تھا، شیکھر گپتا سیدھے ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ان کا موبائل بجا تو انہوں نے اسکرین دیکھی تو اس پر ہرش وردھن لکھا ہوا آ رہا تھا انہوں نے کال ریسیو کی۔

"نمشکار گپتا جی......" ہرش کی چہکتی آواز آئی۔

"نمشکار! کہو بھئی آج کیسے یاد کیا......؟"

"گپتا جی! مجھے آپ سے ضروری کام تھا، وہ مجھے آپ کی زمین چاہئے تھی، میرے من کو بھا گئی ہے اور میں اسے خریدنا چاہتا ہوں، اسی لئے آپ کو فون کیا ہے۔" ہرش نے سیدھی اپنی منوں کا منا گپتا جی کو بتا دی۔ شیکھر گپتا کا شمار بھی ہرش کی طرح جانے مانے بزنس مینوں میں ہوتا تھا لیکن وہ ہرش کی طرح کٹھور دل اور مطلب پرست قطعی نہ تھے۔ بلکہ اس کے برعکس بڑے ہی دیالو تھے اور یہی کارن تھا کہ ان کی کروڑوں کی زمین پر غریب اور خانہ بدوش رہ رہے تھے۔

"ارے بھئی ہرش تم کون سی زمین کی بات کر رہے ہو؟ اس شہر میں تو ہماری ان گنت زمینیں ہیں!" گپتا جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ جتین کمار کا آفس تو آپ نے دیکھا ہی ہے ناں اس کے پیچھے والی زمین کی بات کر رہا ہوں میں۔" ہرش نے بتایا۔

"اچھا! اچھا اس زمین کی بات کر رہے ہو۔ پرنتو ہرش شما کرنا وہ زمین میں نے خود بھی کسی پروجیکٹ کے لئے نہیں لی کیونکہ اس پر غریب لوگ رہ رہے ہیں۔ بے چاروں کے پاس کوئی گھر نہیں تھا مجھے دیا آ گئی تو میں نے

سب کو وہاں رہنے کی انومتی دے دی اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہ زمین میں غریبوں کو ہی دان کردوں گا پربھو کی کرپا سے میرے پاس بہت زمینیں ہیں اگر ایک کسی کے کام آجائے تو اس سے بڑا پنیہ کیا ہوگا۔"

گپتاجی کی بات پر ہرش یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو، نفرت کی لہر سر سے پیر تک ہرش کے شریر میں دوڑ گئی۔ پھر اس نے بات ختم کرکے فون بند کردیا۔

"کہاں کھوئے کھوئے ہو ہرش؟" جتین نے ٹیبل بجا کر ہرش کو آواز دی جو کہ کافی دیر سے پیپر ویٹ گھما رہا تھا اور نگاہیں سامنے فش اکوریم پر ٹکی تھیں جتین کی آواز پر ہرش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔

"کن خیالوں میں گم ہے؟" ہرش نے جتین کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یار وہ گپتاجی کی زمین میں اٹکا ہوا ہوں میں اب تک۔" ہرش کی بات سن کر جتین نے آرام سے کرسی سے ٹیک لگائی اور بولا۔

"نراش کیوں ہورہا ہے؟ کوئی اور زمین دیکھ لے، زمینوں کی کمی تھوڑی ہے۔" ہرش نے گھومتے ہوئے پیپر ویٹ کو ہاتھ رکھ کر روکا اور بولا۔

"مجھے زمینوں کی کمی نہیں ہے جو چاہے لے لوں گا؟ بات یہ ہے کہ مجھے وہاں سے اس گند کو صاف کرنا ہے کسی بھی قیمت پر، اور ویسے بھی ہرش وردھن کے من کو جو چیز بھا جائے، وہ کیول اسی کی ہوتی ہے۔" ہرش کے انداز میں غرور صاف جھلک رہا تھا۔

"مگر میرے متر ہرش وردھن! مجھے شک ہے کہ اس مرتبہ تمہاری چنتا، نراشا میں نہ بدل جائے؟ کیونکہ میری گپتاجی کے پتر شنکر سے بات ہوئی تھی، گپتاجی تین دن بعد انگلینڈ جارہے ہیں اپنی ہارٹ سرجری کروانے اور وہاں وہ اپنی بیٹی کے پاس ہی رہیں گے اور واپسی چھ ماہ بعد ہوگی، اور اگر بھگوان کی اچھا سے گپتاجی پرلوک سدھار گئے تو پھر تمہاری تو چھٹی! اور اس سے بھی بڑی سمسیا یہ کہ گپتاجی نے وہ زمین ان غریبوں کے نام کردینی ہے۔" جتین نے چیئر کو موو کرتے ہوئے کہا۔

"تو ہے تو بچپن سے میرے ساتھ، پرنتو مجھے تو ابھی تک جان نہیں پایا ہے، ہرش وردھن ہوں میں، تین دن تو بہت ہیں اس سے پہلے وہ زمین میری ہوگی، ہرش وردھن کی۔" ہرش نے اٹھ کر جتین کی موو ہوتی چیئر کو روکتے ہوئے کہا تو جتین بھی مسکرانے لگا۔

☆......☆......☆

"آؤ بیٹھو ہرش!" گپتاجی نے ہرش سے کہا اور خود بیڈ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "وہ شنکر سے پتا چلا کہ آپ سرجری کے لئے انگلینڈ جارہے ہیں تو میں نے سوچا آپ سے ملاقات کرلوں۔" ہرش نے بناوٹی انداز سے کہا۔

"یہ تو تمہارا پریم ہے ہرش اور بتاؤ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟" گپتاجی نے پریم سے کہا۔

"بھگوان کی کرپا ہے، ویسے گپتاجی آپ نے مجھے وہ زمین نہیں دی، میں بہت نراش ہوا تھا آپ کا جواب سن کے۔" ہرش نے کہا۔

"ہرش میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ زمین....." گپتاجی نے اپنی بات دہرائی۔

"آپ میری بات سمجھے نہیں گپتاجی، پہلے آپ میری بات تو سن لیجیے، مجھے ان غریبوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ میں ان کے لئے کچھ کروں تو میں اس زمین پر ان کے لئے گھر اور آشرم بنانا چاہتا ہوں، ساتھ ان غریبوں کے سڑک پر پھرتے بچوں کے لئے اناتھ آشرم جہاں وہ رہیں اور کھا پی سکیں اور چھوٹا موٹا کام بھی شروع کرواؤں گا تاکہ وہ اپنے پریوار والوں کے لئے چار پیسے کما سکیں۔ اسی کارن میں وہ زمین لینا چاہ رہا تھا۔" ہرش نے چال چلتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے ہرش پہلے بتانا تھا ناں! بھئی یہ تو بہت پنیے کا کام ہے۔ ایسا کرو تم یہ زمین یوں ہی رکھ لو، میں کل تمہیں زمین کے پیپرز بھجوا دوں گا۔" گپتاجی نے خوشی سے کہا۔

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"نہیں! گپتاجی میں یہ زمین آپ سے خریدوں گا۔" ہرش نے کہا۔

"کیوں، کیا تم مجھے اس پٹنے میں بھاگی دار نہیں بناؤ گے؟" گپتاجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں گپتاجی؟ آپ جیسے دریادل اور دیالو منش ہی کے کارن تو وہ نردھن اتنے سمے سے اس زمین پر رہ رہے ہیں اتنے ورش آپ نے پٹنے ہی تو کمایا ہے، اب یہ موقع مجھے دے دیجیے۔" ہرش نے کہا۔

"پرنتو ہرش......" گپتاجی نے کچھ کہنا چاہا مگر ہرش نے اٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام کر پیار سے بھینچ لئے تو گپتاجی سر ہلانے لگے۔ ہرش وردھن نے گپتاجی کے گھر سے نکلتے ہی اپنے چہرے سے مکاری کا مکھوٹا اتار پھینکا اس کے منہ پر خباثت رقصاں تھی کس طرح اس نے چال چل کر گپتاجی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر ان کی بھاؤناؤں سے کھلواڑ کر کے زمین لے لی تھی اس نے کامیاب چال چلی تھی اس وقت بھی زمین خریدنے کے پیپرز اس کے ساتھ گاڑی میں تھے مگر اس وقت وہ کیول گپتاجی کو جال میں اتارنے آیا تھا پھر اس نے شام کو زمین خریدنے کے پیپرز اور بلینک چیک گپتاجی کو بھجوا دیئے۔

"یہ دیکھ رہا ہے جتین! کیا ہے یہ؟" ہرش نے بلیک کلر کی فائل جتین کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے یہ؟" جتین کو ابھی کچھ پتا نہیں تھا۔

"یہ میری جیت کا پروانہ ہے! گپتاجی کی زمین کے پیپرز جو کہ اب میری ہو چکی ہے۔" ہرش نے چہکتے ہوئے کہا۔

"مان گئے! ہرش کہ تو کتنا شکتی مان ہے۔" جتین نے کہا۔ تو ہرش نے گردن اکڑا کر کہا۔

"شکتی مان ہی نہیں بدھی مان بھی۔" پھر دونوں زور سے ہنسنے لگے۔

اتنے میں ہرش کا موبائل بجا ہرش نے اسکرین دیکھی تو اس کا بزنس فرینڈ منیش تھا۔

"ہاں بولو منیش۔" اس نے کال ریسیو کی۔

"یار ہرش اچھے سماچار نہیں ہیں! میں ابھی اپنی وائف کے ساتھ اسپتال آیا تھا کہ میرے سامنے شنکر، گپتاجی کو ایمرجنسی میں یہاں لایا تھا، انہیں دل کا دورہ پڑا تھا، ڈاکٹرز نے انہیں بچانے کی بہت کوشش کی پرنتو ان کا دیہانت ہو گیا۔"

منیش کی بات سن کر ہرش کچھ منٹوں کے لئے بت بن گیا پھر بولا۔ "اوہ! یہ تو بہت برا ہوا، بڑے ہی دیالو پرش تھے گپتاجی، مجھے تو شواس ہی نہیں ہو رہا ہے، ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو ان کا سکریٹری مجھے پیپرز دے کر گیا تھا ان کی زمین میں نے خرید لی ہے ناں۔" ہرش نے جان بوجھ کر زمین خریدنے کا منیش کو بتایا تا کہ وہ سب کو بتائے کہ اب وہ زمین ہرش کی ہے تا کہ کل کو کوئی ارچن نہ آئے۔

"ہاں بھئی کیا کر سکتے ہیں؟ یہ تو سنسار کا نیم ہے کہ جو جنم لیتا ہے اسے مرتیو آنی ہی ہے۔" منیش نے کہا۔

"بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے۔" ہرش نے کہا اور فون بند کر دیا ہرش نے جتین کو بتایا تو وہ بولا۔

"ہرش بہت ہی بھاگیہ شالی ہے تو، اگر تھوڑا سا بھی سے نشٹ ہوتا تو گئی تھی زمین تیرے ہاتھ سے۔" جتین کی بات پر ہرش ہنس کر بولا۔

"ہرش وردھن کا بھاگیہ، ہمیشہ روشن ہی رہتا ہے۔" دونوں نے اس چیز کو بیئر بار میں جا کر سیلیبریٹ کیا اور ہرش وردھن نے پہلا پیگ سورگ باسی گپتاجی کے نام کر کے شروعات کی اور پھر ان کی پارٹی صبح تک چلی۔

☆......☆......☆

کوشلیا کماری، اپنے پتر گوتم کی تھالی میں بھوجن پروس رہی تھی کہ ایک دم اس کے کانوں میں شور پڑا۔ "ہے رام! یہ شور کیسا ہے؟" انہوں نے چونک کر کہا اتنے میں گوتم دھوتی سنبھالتا ہوا چوکی کے آگے پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کوشلیا کماری نے چوکی پر جل بھرا گلاس رکھا اور تھالی لا کر رکھ دی جس میں ابلے چاول، کٹوری

میں دال اور ایک طرف ہری مرچ رکھی ہوئی تھیں۔

"گوتم یہ شور کیسا ہے؟" انہوں نے پرشن کیا۔

"پتا نہیں ماں ٹھیک سے، پرنتو کوئی بات تو اوشیہ ہے! میں منہ دھو رہا تھا تو کچھ ویکتیوں کی آوازیں آرہی تھیں، کنتو میں سن نہیں پایا۔" گوتم نے دال چاول کا نوالہ منہ میں رکھا اور ترنت بولا۔

"ماں! نمک تو ڈالا ہی نہیں تو نے۔" کوشلیا کماری ساڑھی سنبھالتی نمک کی برنی لائی اور نمک نکال کر تھالی کے کونے میں رکھ دیا۔

شور ایک دم تیز ہونے لگا تو کوشلیا کماری نے چنتت انداز میں کہا۔ "تو کھا! میں ذرا دیکھ کر آتی ہوں باہر آخر ہو کیا رہا ہے؟" پھر وہ جھکی ہوئی ساڑھی سنبھالتی اپنے لکڑی کے ٹوٹے دروازے سے نکلی اور باہر موجود دونوں پیپل دیوتاؤں کو نمشکار کیا، جن کے آگے سے وہ روز صفائی کرتی، انہیں جل چڑھاتی اور ان کی دیکھ ریکھ کرتی پھر وہ آگے بڑھ گئی، کوشلیا کماری اک نردھن وودھوا تھی اور اس بھرے سنسار میں اس کی کیول ایک سنتان تھی جو اس کے پاس تھی گوتم اس کا پتر، کوشلیا کا پتی ایک راج مستری تھا اور جیون بھر دو وقت کی روٹی کے لئے بھاگ دوڑ کرکے اس سنسار سے چلا گیا اور اب اس کی جگہ گوتم نے لے لی تھی۔ وہ تو بھلا ہو کوشلیا کے سسر کا جنہوں نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے پریوار کے سر چھپانے کے واسطے بستی میں یہ مکان چھوڑا تھا ورنہ پتی کے دیہانت کے بعد کوشلیا کا جیون سڑکوں پر بیتتا۔

جب وہ باہر گئی تو وہاں پوری بستی موجود تھی وہ بھی ان کی سمسیا سن کر ان سے اسی وشے میں بات چیت کرنے لگی۔

"مجھے تو یہ بات اوچت لگ رہی ہے کہ ہمیں روپے لے لینے چاہئیں۔" نٹور لال نے کہا تو باقی بھی ہاں میں گردن ہلانے لگے۔

کوشلیا کماری نے کہا۔ "کنتو! تم لوگ جاؤ گے کہاں؟ اتنے کم سے میں گھر کہاں ڈھونڈھو گے؟ زمین کہاں سے آئے گی؟"

"کوشلیا دیدی! بات تو تمہاری اوچت ہے پرنتو ہمارے پاس اس گمبھیرتا کا کوئی دوسرا اپائے بھی تو نہیں ہے! کیول یہی راستہ ہے تمہیں بتایا تو تھا کہ گپتا جی نے جسے زمین بیچی ہے اس مالک نے ہمیں روپے لے کر پندرہ روز میں یہ جگہ خالی کرنے کا آدیش دیا ہے۔" نٹور لال نے چنتت ہو کر کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھیا، پرنتو یہ زمین تو گپتا جی نے بستی والوں کو دینے کا وچن دیا تھا تم جاکر بات کرو ناں شنکر بڑا سے۔" کوشلیا کماری نے سمجھا دیا۔

"بات تو تمہاری من کو لگ رہی ہے ہم آج ہی شنکر بڑا سے بات کریں گے۔" تلسی داس جلدی سے بولا۔ پھر وہ سب مل کر گپتا جی کے گھر شنکر سے ملنے گئے اور انہیں ہرش وردھن کی چتاؤنی کے بارے میں بتایا تو شنکر نے دھیرج سے ان کی بات سنی اور بولا۔

"یہ بات تو میری جانکاری میں تھی کہ میرے سورگ باسی پتاجی نے اپنے جیون میں ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ زمین وہ آپ لوگوں کو دے دیں گے پرنتو! پھر ایسا کیا ہوا کہ انہوں نے اپنے فیصلے کے خلاف زمین ہرش وردھن کے ہاتھوں بیچ دی اس مسئلے میں میری جانکاری بالکل بھی نہیں ہے ہاں میں ایسا کرسکتا ہوں کہ ہرش وردھن سے بات کرکے یہ زمین اس سے دوبارہ خرید کر آپ لوگوں کو دے دوں گا۔ بھگوان کی بڑی کرپا ہے ہمارے پریوار پر ہمارے روپوں کی کمی تھوڑی آئے گی اگر اس میں سے تھوڑا سا دھن آپ لوگوں کے کام آجائے تو کیا برا ہے؟" سارے نردھن شنکر کی بلائیں لینے لگے اور شنکر گپتا کی آتما کی شانتی کے لئے پراتھنا کرنے لگے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

بہرحال ان کی سوچ کچھ ہی سمے کی مہمان ثابت ہوئی شنکر نے ہرش وردھن سے بات کرنے کے بعد ان لوگوں کو بتادیا کہ "ہرش وردھن نے صاف انکار کردیا ہے کہ وہ نہ تو یہ زمین بیچے گا اور نہ ہی اپنی دی

گئی چتاؤنی سے پیچھے ہٹے گا اتنا ہی نہیں اگر پندرہ روز گزر گئے تو پھر زبردستی وہ جگہ خالی کروائے گا۔‘‘ شنکر کی بات سن کر ان لوگوں کی آس نراشا میں بدل گئی۔

’’ارے بھیا اتنی مہنگائی کے دور میں، اتنے تھوڑے روپوں میں تو کچھ نہ ہو پائے گا! میں کہاں جاؤں گا اپنے پریوار کو لے کر، اب تو میری کنیا بھی ودوا ہو رہی ہے۔‘‘ تلسی داس نے سر پکڑ کر کہا۔

’’ارے بھیا! کیوں چنتا کرتے ہو، وہ جو پالن ہار ہے ناں وہ ضرور سہایتا کرے گا، تم دیکھنا۔‘‘ کوشلیا بولی۔

’’کاہے چنتا نہ کریں؟ ہم تو کھلے آکاش تلے آ گئے ہیں ہاں تمہارے لئے تو چنتا کی کوئی بات نہیں ہے ناں کوشلیا بہن، تمہارا تو اپنا گھر ہے ناں اپنی زمین ہے ہرش وردھن کی زمین کی سیما سماپت ہو جانے کے بعد تمہاری زمین ہے تو تمہارے لئے تو کوئی سمسیا ہی نہیں ہے۔‘‘ گھنشام نے تنک کر کہا۔

’’کیسی باتیں کرتے ہو گھنشام بھیا؟ تمہاری اور میری سمسیا سانجھی ہے مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں ہے، ہم کل بڑے مندر میں جا کر پراتھنا کریں گے۔ بھگوان جرور سہایتا کرے گا۔‘‘ کوشلیا کماری نے کہا تو سب لوگوں نے ایک ساتھ ہاں کی اور پھر اگلے روز وہ سب بڑے مندر گئے اور پجاری جی کے ساتھ مل کر پوجا کی۔

بھگوان نے ان کے سچے من سے کی پوجا و پراتھنا سویکار کی اور تین دن بعد شنکر نے انہیں بلاوا بھیجا وہ سب شنکر کے پاس گئے تو اس نے کہا۔

’’میرے پتا نے اپنے جیون میں آپ کو یوں نہیں چھوڑا کہ بے یار و مددگار پھریں تو میں اپنے پتا کے اس کاریہ کو بے کار کیسے ہونے دے سکتا ہوں؟ آپ سب ہرش وردھن سے روپے لے کر وہ زمین خالی کر دیں میں اپنے نئے پروجیکٹ کی زمین آپ لوگوں کو دے رہا ہوں آپ لوگ وہاں رہ لیں آپ کے گھر بھی میں بنوا دوں گا۔ روپے آپ لوگ اپنے پاس رکھ لیجیے گا بس اپنی پراتھناؤں میں میرے سورگ باسی پتا جی کو یاد رکھیے گا۔‘‘ سب خوشی سے ناچنے لگے گھنشام کوشلیا کماری سے ہاتھ جوڑ کر شما مانگی کہ اس روز میں نے بڑی کٹھورتا سے بات کی تھی۔‘‘ کوشلیا کماری مسکرا کر بولی۔

’’ارے چھوڑیئے ناں گھنشام بھیا! انت بھلا تو سب بھلا۔‘‘

کوشلیا کماری نے سوریو دیو کو نمشکار کیا، پیپل دیو کو جل چڑھایا اور سارے میں آرتی کر کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہو گئی اس کے نین دور تک پھیلی ویرانی کو دیکھ کر نیر بہانے لگے۔ سارے بستی والے کب کے جا چکے تھے اس نے ساڑھی کے پلو سے نیر صاف کئے اور اندر چلی آئی گوتم اشنان کر رہا تھا۔ کوشلیا کماری نے دروازہ بند کر کے رسوئی گھر کی اور قدم بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے کسی نے دروازہ پیٹا دھڑ! دھڑ دھڑ! کوشلیا نے آرتی کی تھالی ایک طرف رکھی اور دروازہ کھولنے جاتے ہوئے بولی۔

’’کون؟‘‘ پھر دروازہ کھولا تو سامنے کچھ لوگ کھڑے تھے۔

’’یہ مکان تمہارا ہے۔‘‘ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

’’ہاں میرا ہے۔ پرنتو کیوں پوچھ رہے ہو یہ؟‘‘ کوشلیا نے کہا۔

’’اس گھر کو خالی کر دو۔‘‘ اس آدمی نے کہا۔

’’بدھی بھرشٹ ہو گئی ہے کیا تمہاری؟ تمہارے باپ کا مکان ہے جو خالی کر دوں تمہارے کہنے پر۔‘‘ کوشلیا کماری نے کہا۔

’’یہ ہمارے صاحب کا حکم ہے!‘‘ دوسرے بندے نے کہا۔

’’تیرا مالک کیا بھگوان ہے جو اس کی آگیا کا پالن کروں؟‘‘ کوشلیا کماری نے غصے سے کہا۔

’’تو ابھی جانتی نہیں ہے ہمارے مالک کو تب ہی اتنی اکڑ دکھا رہی ہے بڑھیا اس سے پہلے کہ تیری

شامت آئے سیدھی طرح سے یہ مکان خالی کردے ! بدلے میں دوگنی قیمت ملے گی۔" انہی میں سے ایک اور نے کہا۔

"چلتے پھرتے نظر آؤ یہاں سے اور ہاں جا کر کہہ دینا اپنے مالک سے کہ کوشلیا کماری کبھی اپنا مکان نہیں خالی کرے گی۔ یہ اس کی نہیں، میری زمین ہے۔" کوشلیا کماری نے مضبوط لہجے میں کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

☆......☆......☆

ہرش وردھمن کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ "اس دوکوڑی کی بڑھیا کی اتنی مجال کہ ہرش وردھمن کو منع کرے! تجھے تو میں دیکھ لوں گا تیرا وہ کاٹھ کباڑ میرے شاندار پروجیکٹ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے جسے مٹانا بہت ضروری ہے کرتا ہوں تیرا کچھ!" ہرش وردھمن نے چیئر کو گھماتے ہوئے کہا تو جتین نے اسے شانت رہنے کا کہا اور بولا۔

"بڑھیا کو چھوڑ اس کے بیٹے کو جال میں پھانستے ہیں نیا خون ہے لالچ میں آئے گا آدشے آئے گا۔" تو ہرش منہ بنانے لگا۔

پھر جتین نے گوتم کو بلوایا اور اس سے کہا۔" دیکھو! تمہاری ماتا تو ہوگئی ہیں بوڑھی اور اپنا پورا جیون جی چکی ہیں پر تمہیں تو ابھی جیون شروع کرنا ہے اپنا پریوار بنانا ہے کیا سارا جیون راج مستری ہی رہو گے اپنا مستقبل بناؤ۔"

پرنتو گوتم نے صاف انکار کردیا یہ کہہ کر "یہ مکان اس کے پتا کی نشانی ہے اور ہم یہ مکان کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" جتین نے اس کا جواب سن کر اسے آفردی کہ "مکان ان سے تین گنا پر قیمت خریدیں گے، نیا اچھا مکان بنوادیں گے اور گوتم کو کہیں اچھی جگہ پر کام دلوائیں گے۔"

گوتم اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔" مجھے سے دیجیے میں اپنی ماتا سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔" گوتم نے ساری کتھا جا کر کوشلیا کماری کو سنائی تو اس نے کہا کہ "وہ اپنا نرنے لے چکی ہے اور اپنی انتم سانس تک اس پر قائم رہے گی۔"

گوتم نے جتین کو اپنی ماتا کی اور سے اتر دے دیا جو اس نے ہرش تک پہنچا دیا ہرش کے اندر ایک اگنی جل اٹھی جو اس کے دماغ کو کھولا رہی تھی وہ جنہیں ہرش وردھمن دھرتی پر رینگنے والے کیڑے گردان رہا تھا انہی کیڑے مکوڑوں نے اس کے سوال پر اسے اپنے دووار سے دھتکار دیا تھا۔ ہرش نے کال ملائی اور آرڈر دیا کہ "کل کام شروع کرو تو سورج نکلتے ہی شروع کرنا۔" اور فون کاٹ دیا۔

سورج نکل آیا گوتم اور کوشلیا ابھی سو رہے تھے آج کوشلیا کماری کی آنکھ ابھی تک کھلی نہیں تھی ایک دم گڑگڑاہٹ کے ساتھ زوردار دھماکہ ہوا جس سے کوشلیا کماری اچھل پڑی اس نے آنکھ کھولی تو اسے کچھ بھی نہ دکھائی دیا الٹا اس کی آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگی اور اس کا سانس گھٹنے لگا پھر اسے زوردار کھانسی آئی جو رکنے کا نام نہ لے رہی تھی کافی دیر گزرنے کے بعد وہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہوئی تو ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا دھول مٹی اڑ رہی تھی کوشلیا نے گوتم کو آواز دی مگر اس کی آواز باہر ہوتی گڑگڑاہٹ میں دب گئی کوشلیا کماری نے ہمت جمع کی اور ٹٹولتی ہوئی اٹھی اس نے آنکھیں مل کر چاروں اور دیکھا تو اسے نظر آیا کہ اس کے گھر کی ایک طرف کی دیوار گرگئی تھی پھر اسے اس دیوار کے ملبے تلے گوتم کی دھوتی نظر آئی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"گوتم......!" وہ گرتی پڑتی وہاں پہنچی اور اسے پتھر ہٹا کر نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر پتھر اتنے بڑے تھے کہ اس بڑھیا سے ہل بھی نہ پا رہے تھے وہ چیخ چیخ کر گوتم کو پکار رہی تھی پھر وہ باہر آئی اس کے گھر کے سامنے ایک بہت بڑی مشین کھڑی تھی، دیواریں گر رہی تھیں، کوشلیا نے چیخ کر اس مشین چلانے والے کو آوازیں دیں کنتو مشین کے شور میں وہ سن ہی نہیں رہا تھا کوشلیا روتے ہوئے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سر پکڑ کر دھرتی پر بیٹھ گئی پھر اس نے نیچے پڑے پتھروں میں سے ایک بڑا پتھر اٹھا کر مشین کے شیشے پر مارا تو اس میں بیٹھا شخص چونک کر اس طرف دیکھنے لگا کوشلیا رو رو کر ہاتھ ہلا رہی تھی اسے دیکھ کر اس شخص نے مشین بند کیا اور اتر کر نیچے آ گیا اسے دیکھ کر کوشلیا پاگلوں کی طرح چیخی۔ "ارے او آنکھوں کے اندھے یہ اتنا بڑا مکان تجھے نظر نہیں آیا جو تو اسے توڑ رہا ہے؟"

تو وہ شخص بولا۔ "شما کرنا! ماتاجی! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مکان نہیں گرانا ہے۔"

کوشلیا روئے جا رہی تھی۔ "ناس پیٹے مکان پر نہیں تو نے میرے کلیجے پر یہ مشین چلائی ہے میرے کلیجے کا ٹکڑا اس ملبے تلے دبا ہوا ہے نکال اسے چل جلدی۔" کوشلیا پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

"ہے رام! یہ تو گھور پاپ ہو گیا مجھ سے! ماتاجی اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ خالی بستی گرانی ہے کنتو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس مکان میں جیوت لوگ رہتے ہیں، یہ تو انرتھ ہو گیا رام رام!" اور پھر بھاگ کر اور لوگوں کو بلا لایا کر لے آیا اور پھر ان سب نے مل کر گوتم کو ملبے سے نکالا گوتم بری طرح سے گھائل تھا اس کی سانسیں چل رہی تھیں اسے اسپتال لے جایا گیا مگر اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آتما نے اس کا جسم چھوڑ دیا۔

کوشلیا کماری کو جب یہ سماچار ملے کہ گوتم جیوت نہیں ہے تو وہ اپنا مانسک سنتولن کھو بیٹھی اور سڑکوں پر دوڑ پڑی۔ اس کے پرانے بستی والوں نے اسے "پاگل خانے" میں بھرتی کروا دیا۔

ہرش وردھن نے لوہا گرم دیکھ کر اس پر چوٹ ماری اور سرکار سے کوشلیا کا گھر دوگنی قیمت پر خرید کر روپے اس کے نام سے بینک میں کھاتا کھول کر جمع کرا دیئے اور خود اپنے ذمہ اس کے علاج کا خرچہ لے لیا اور سارے سماج کی نظروں میں ماہان بن گیا۔

کنتو! ہرش وردھن کے منہ پر چڑھے مکھوٹے کے پیچھے موجود بھیانک چہرے کو کوئی بھی نہیں دیکھ پار ہا تھا۔ ان نردھنوں سے نفرت رکھنے والے ہرش وردھن نے کیول اپنی انا اور غرور کے کارن جان بوجھ کر کوشلیا کا مکان تڑوایا تھا جس میں اس کے بیٹے کی مرتیو ہو گئی تھی اور خود کوشلیا اپنا مانسک سنتولن کھو بیٹھی تھی ہرش کی یہ چال کسی کے علم میں نہ تھی اس نے جان بوجھ کر ریسکیو والوں کو اس بات سے انجان رکھا کہ یہ مکان اس کی زمین کا حصہ نہیں ہے اور یوں ہرش کی راہ کے سارے کانٹے صاف ہو گئے اور زمین اس کے ہاتھ آ گئی۔

☆......☆......☆

ہرش آج سائٹ پر کام دیکھنے آیا تھا سارے مکان گرا کر زمین صاف کی جا چکی تھی تمام ملبہ اٹھ چکا تھا اب وہاں چٹیل میدان تھا سوائے پیپل کے درختوں کے ہرش کی نگاہ ان پر پڑی تو اس کا منہ بن گیا اس نے مزدوروں کو بلایا سارے مزدور شرامک، کچھ دھارمک وچاروں کے تھے انہوں نے جان کر درختوں کو نہیں کاٹا تھا۔

ہرش بولا۔ "ان کو کیا میرے سواگت کے لئے کھڑا چھوڑ رکھا ہے؟ گراؤ انہیں اسی وقت۔" اس کی بات سن کر مزدور بولے۔

"صاحب جی! ورشوں پرانے درخت ہیں ان کو یوں نہیں کاٹتے پوجا کرنی پڑتی ہے پہلے۔" ان کا کہنا تھا کہ ہرش زور سے دھاڑا۔

"واٹ نان سنس! اسے نشٹ کرنے کے بجائے ترنت انہیں گراؤ میرے سامنے ابھی اسی سمے۔"

اس کا کہنا تھا کہ سارے مزدور مشین کی طرح حرکت میں آ گئے اور اپنے اوزار سنبھالنے لگے اتنے میں ہرش کی فون پر ایک کال آئی تو وہ آگے بڑھ کر اٹینڈ کرنے لگا اس کے آگے جاتے ہی ان مزدوروں نے اپنے گلے میں پڑی مالاؤں کو تھاما اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا پھر بولے۔

"اپنی سورکھشا تو کر لی اس کا بھگوان جانے۔" ان کا اشارہ ہرش کی اور تھا ہرش بات کر کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

واپس آرہا تھا تمام مزدور نے مل کر دونوں درخت اکھاڑ دیئے۔

"تم سب ابھی اسی سمے یہاں سے دفع ہو جاؤ اور جا کر کسی مندر میں پوجا پاٹ کرو۔" ہرش نے ان سے کہا۔

"شما کرنا صاحب...... وہ......" انہوں نے کہنا چاہا مگر ہرش نے ان کی بات بیچ میں کاٹ دی اور چلا کر کہا۔

"جسٹ گیٹ لوسٹ۔" اور وہاں سے چلا گیا۔

جتین نے اور مزدوروں کا انتظام کر دیا اور ہرش کو غصہ نہ کرنے کا کہا۔

کنسٹرکشن شروع ہوئی تو سب سے پہلے ہرش کے عارضی آفس کے لئے روم بنایا جانے لگا بعد میں وہ اپنا آفس ٹاپ فلور پر شفٹ کرنے والا تھا رات کام ختم کر کے مزدور گھر چلے گئے تھے۔

اگلی صبح جب وہ سب واپس سائٹ پر پہنچے تو حیران رہ گئے وہ سب اس اچنبھے میں تھے؟ باؤنڈری وال کے باہر کیچڑ جیسا کالا سیال گھٹنوں تک کھڑا تھا جبکہ مین گیٹ پر تالا پڑا تھا کسی منش کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا جتین کو انفارم کیا گیا تو اس نے تالا توڑ دینے کا کہا کچھ مزدور تالا توڑ کر اندر گئے تو وہ کمر تک کیچڑ نما سیال میں دھنس گئے۔

آخر یہ سب ایک رات میں آ کہاں سے گیا؟ کل تک تو کچھ بھی نہ تھا! یہ ایک ایسا سوال تھا جو سب ایک دوسرے سے کر رہے تھے۔ جتین بھی پہنچ گیا پرنتو کارکنان کسی کے بھی سمجھ نہ آیا۔

پھر مشینری کے ذریعے سارا سیال صاف کروایا گیا مشین چل رہی تھی کہ ایک دم اٹک گئی مزدور گئے اور مشین چیک کی جو چیز اٹک رہی تھی اسے صاف کیا گیا تو سب کو سانپ سونگھ گیا وہ واچ مین کی لاش تھی۔

ہرش کے علم میں سارا ماجرا آیا تو اس نے بجائے چنتت ہونے کے جتین کو آرڈر دیا کہ "معاملہ پیسے دے کر رفع دفع کرو اور وہاں کام کسی بھی طرح رکنا نہیں چاہئے۔"

اندر کے سارے کام آل موسٹ کمپلیٹ ہو چکے ہیں میں ابھی یہیں ہوں تو بھی دیکھ لے۔" جتین نے ہرش سے کہا۔

"ٹھیک ہے میٹنگ ختم کرنے کے بعد آ جائیں گے۔" ہرش نے جتین سے پروگرام طے کیا تو جتین وہاں سے نکل گیا جتین اور ہرش کی میٹنگ ختم ہوئی تو بارہ بجنے والے تھے وہ لوگ نئے آفس پہنچ گئے انہوں نے جیسے ہی آفس کا دروازہ کھولا تو وہ ٹھٹھک گئے کمرے کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا کمرے کے بیچوں بیچ جہاں ہرش کی چیئر اور ٹیبل رکھی تھی اس ٹیبل کے نیچے سے ایک موٹی درخت کی شاخ زمین پھاڑ کر ٹیبل کی بیچ کے دو ٹکڑے کرتی ہوئی نکل کر کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

دونوں ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے جتین کا تو یہ عالم تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں کیونکہ آج دوپہر کو تو اس نے اسی آفس میں کھڑے ہو کر ہرش سے بات کی تھی۔

"شٹ!" ہرش نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" جتین نے اپنے آپ سے کہا ہرش نے چیخ کر چوکیدار کو بلوایا۔ اس کے لئے بھی یہ سب حیران کن تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" ہرش نے غصے سے کہا۔

"سر وہ......" چوکیدار حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں تھا اس کے منہ سے لفظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

"ہوسکتا ہے سر کہ جو درخت کاٹے گئے تھے ان کی جڑیں زمین کے اندر رہ گئی ہوں اور اب باہر نکل آئی ہوں۔" اس نے کہا۔

"شٹ یور ماؤتھ یو ایڈیٹ!"

"درخت کی جڑ ہے یا آتش فشاں جو دھرتی چیر دے اور باہر نکل آئے تم سب ہو ہی نکمے بلاؤ مزدوروں کو اور اسے اکھاڑ پھینکو۔" ہرش نے اسے جھاڑا

اور پیر پٹختا وہاں سے چلا گیا جتین بھی اس کے پیچھے چل پڑا اس کے غصے کی انتہا نہیں تھی بنا ہوا آفس خراب ہوا تھا اس منحوس درخت کی جڑوں کے کارن جسے اب دوبارہ بنانا پڑ رہا تھا وہ جتنی جلدی کام کروانا چاہ رہا تھا اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔

ہرش پیگ پر پیگ چڑھا رہا تھا غصے سے دونوں کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں وہ صوفے سے اٹھا تو لڑکھڑا کر گر گیا پھر گھٹنوں پر چلتا ہوا بیڈ تک آیا اس پر اوندھے منہ گر گیا کچھ منٹوں میں وہ ہوش سے بیگانہ ہو چکا تھا ہرش کے پیر میں گدگدی ہوئی تو اس نے پیر سمیٹ لئے پھر اس کے دوسرے پیر میں گدگدی ہوئی تو اس نے جھنجلا کر دوبارہ پیر سمیٹ لئے پھر اس کے بائیں ہاتھ کے پنجے پر کسی چیز نے زور سے کاٹا تو تکلیف سے ہرش اٹھ گیا کمرے میں گھپ اندھیرا تھا حالانکہ وہ نائٹ بلب جلا کر سوتا تھا۔

ہرش نے سائیڈ لیمپ کا بٹن آن کیا مگر وہ آن نہیں ہوا ہرش نے ہاتھ بڑھا کر اپنا لائٹر ٹٹولا اور اسے جلا کر اس کی روشنی میں بیڈ سے نیچے اترا۔

"رامو!" اس نے نوکر کو پکارا مگر کافی سے گزرنے کے بعد بھی نہ تو کوئی آیا اور نہ ہی کسی نے جواب دیا، پھر وہ آگے بڑھا اور کمرے کی مین لائٹ ان کرنے کے لئے دیوار پر لگے بٹن کو دبانے لگا اس نے ایک ایک کر کے تمام بٹن دبائے مگر کوئی سی بھی لائٹ نہ جلی ایک دم ہرش کو زور سے سانس لینے کی آواز آئی تو وہ چونک گیا پھر اس کو سرسراہٹ سنائی دی۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا تو بیڈ کے سائیڈ میں رکھے دونوں لیمپ خود بخود جل گئے۔

ہرش واپس بیڈ کے قریب آ گیا پیچھے سے پھر سرسراہٹ سنائی دی ہرش تیزی سے مڑا تو لیمپ پھر بجھ گئے ہرش نے لائٹر دوبارہ جلایا اور بیڈ کی دراز سے ٹارچ نکال کر جلائی ایک دم اس کے بیڈ روم کا دروازہ دھماکے سے کھل گیا ہرش نے اس طرف ٹارچ کی تو ٹارچ ایک دم بجھ گئی ہرش نے جھنجلا کر ٹارچ ہاتھ پر ماری اسے پھر جلایا مگر وہ نہ جلی ہرش نے دوبارہ اپنا لائٹر جلایا جس سے ہلکی سی روشنی ہوئی کوئی کمرے کے اندر آ رہا تھا۔

"رامو؟" ہرش نے پوچھا مگر کوئی جواب نہیں آیا ہرش نے پھر پوچھا۔

"کون ہے؟" اور لائٹر اس طرف کر کے ہاتھ آگے کیا تو آنے والے پر ہلکی سی روشنی ہوئی۔

ہرش نے آنکھوں پر زور دیا اور غور سے دیکھا تو وہ کوئی عورت تھی پھر جب وہ اور قریب آئی تو بیڈ کا ایک لیمپ جل گیا کمرے میں تھوڑی روشنی بڑھ گئی جب روشنی ہوئی تو ہرش کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جسے وہ عورت سمجھ رہا تھا اس کا کیول چہرہ عورت کا تھا جس کے سر پر لگی ٹہنیاں سینگوں کا منظر پیش کر رہی تھیں عورت نے چہرہ نیچے جھکایا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں اور نیچے پورے درخت کا تنا تھا جس کے نیچے سے جڑیں نکل کر پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں جس سے سرسراہٹ ہو رہی تھی۔

ہرش اپنی جگہ جم کر رہ گیا اسے وشواس نہیں ہو رہا تھا کہ جو وہ دیکھ رہا ہے وہ حقیقت ہے؟ درخت آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا تھا کمرے کی لائٹس ایک ایک کر کے جل بجھ ہونے لگیں جب جب لائٹس آن ہوتیں ہرش کے ہوش اڑ جاتے کیونکہ کمرے میں پھیلی درخت کی جڑوں سے خون رس رہا تھا جو پورے کمرے میں پھیلتا جا رہا تھا پھر ساری لائٹس آن ہو گئیں اور ان رینگتی جڑوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ہرش کی بائیں ٹانگ جکڑ لی۔

درد کی لہر ہرش کے شریر میں دوڑ گئی پھر وہ جڑ ہرش کو ٹانگ سے پکڑ کر ہوا میں اچھالنے لگی اور ہرش کو درخت کے عورت نما چہرے کے سامنے کر کے ہوا میں معلق کر دیا ہرش کا خوف سے دم نکل رہا تھا وہ پورا کانپ رہا تھا پھر اس عورت نے منہ کھولا وہ اندر

سے بالکل خالی تھا اس میں سے آواز آئی۔

”مجھے درد پہنچایا تو یقیناً کرنی کا بھوگ اٹھائے گا انشٹ ہوگا تو۔“ اس کے ساتھ ہی عورت نے چہرہ اوپر کیا اور آنکھیں کھول دیں اف اس کی آنکھیں غضب کی تھیں ان آنکھوں میں خالی گڑھے تھے جن میں آگ جل رہی تھی اور گڑھوں سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔

ہرش نے خوف سے گلا پھاڑ کر چیخ ماری اور دھپ سے بستر سے نیچے گر گیا اور اس کی آنکھ کھل گئی اور سر زور سے بیڈ سے ٹکرایا ہرش کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے اس کا سانس انجن کی طرح چل رہا تھا اور وہ پورا پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اس نے سائیڈ لیمپ جلایا اور خوف زدہ نظروں سے چاروں اور دیکھا کمرہ بالکل خالی تھا ہرش اٹھا اور بیڈ پر بیٹھ گیا اور سائیڈ باکس پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر خالی کر دیا۔

”اف کتنا بھیانک سپنا تھا۔“ اس نے سوچا اور پھر دوبارہ بستر پر لیٹ کر سونے لگا۔

☆......☆......☆

”نتور ترنت آؤ مجھے دیر ہو رہی ہے!“ ہرش نے کانٹے سے آملیٹ منہ میں رکھتے ہوئے کہا پھر جوس پی کر ٹیبل سے اٹھ کر سامنے رکھے صوفے پر دراز ہو گیا نتور تیزی سے اس کا موبائل لے کر آیا اور ہرش کو دے کر نیچے بیٹھ گیا اور ہرش کو موزے پہنانے لگا جیسے ہی نتور نے ہرش کے بائیں پیر میں موزا پہنایا تو ہرش کے منہ سے سسکاری نکل گئی اس کے پیر میں تکلیف ہوئی تھی ابھی وہ دیکھتا ہی کہ جتین کی کال آ گئی وہ باہر اس کا ویٹ کر رہا ہے۔

ہرش اٹھ کر جلدی سے چلا گیا آفس پہنچ کر اس کے پیر میں درد ہونے لگا تو اس نے پین کلر لے لی درد تھوڑے سے میں رک گیا درد رکا تو ایک منحوس خبر نے ہرش کا سواگت کیا۔ ہرش کے پروجیکٹ کی پہلی منزل ایک دھماکے سے گر گئی تھی۔

ہرش سر پکڑ کر بیٹھ گیا یہ ہرش کی بدھی میں نہیں سما رہا تھا کیونکہ وہ ان میں سے نہیں تھا جو ناقص میٹریل استعمال کرتے ہیں ہرش وردھن کا نام تھا اور وہ اپنے ریپوٹیشن کے معاملے میں ہمیشہ ساودھان رہتا تھا وجہ کیا تھی یہ تو ابھی انجینئرز تلاش کر کے بتاتے فی الحال تو ہرش کا پارہ ہائی ہو رہا تھا اس نے غصے میں اپنا موبائل دیوار پر مار کر توڑ دیا۔

جتین نے اسے گھر بھیج دیا جاتے جاتے راستے میں اس کے پیر میں پھر درد ہونے لگا گھر جا کر اس نے بیڈ پر بیٹھ کر موزے اتارے تو اپنا پیر دیکھ کر چونک گیا اس کی پنڈلی پر دو گول چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے ہرش نے یاد کیا کہ اس کے یہ چوٹ کہاں سے لگی تھی؟ مگر اسے کچھ یاد نہیں آیا پھر اس نے سر جھٹکا اور دوبارہ منزل گر جانے کے بارے میں سوچنے لگا اب تو یہ پروجیکٹ اس کے لئے چیلنج بنتا جا رہا تھا اس کا غصہ تھا کہ قابو ہی نہیں آ رہا تھا ہرش نے سکون کی دوائی اور لائٹ آف کر کے تکیئے میں منہ دے دیا۔

صبح ہرش کی آنکھ پیر کے درد سے کھلی ہرش نے بستر پر پیر پٹخا مگر تکلیف اور زور سے ہونے لگی ہرش اٹھا اور اپنا پیر دیکھنے لگا اس کے پیر پر موجود سوراخوں کے آس پاس سے رگیں گہری لال ہو رہی تھیں اور ان میں تکلیف ہو رہی تھی۔

”اوہو اب ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا پھر اسی روز اس نے ڈاکٹر سے ملاقات کی تو اس نے کہا کہ ”چوٹ لگی ہوگی اور ریسٹ نہ کرنے کے کارن پیر پر زور پڑ رہا ہے جس سے نسوں میں تکلیف ہو رہی ہے میں میڈیسن لکھ دیتا ہوں ریسٹ کرو پیر ٹھیک ہو جائے گا چنتا کی کوئی بات نہیں۔“

ہرش ہنس کر بولا۔ ”ارے بھئی ریسٹ کریں گے تو بزنس کیسے چلے گا، پھر بھی کوشش کروں گا کہ تھوڑا سا سمے نکال کر ریسٹ کر لوں۔“

پھر ہرش وہاں سے آفس پہنچا تو جتین اس کا انتظار کر رہا تھا وہ بولا۔

”آج کی میٹنگ یاد ہے؟“ تو ہرش بولا۔

ہاں ہاں! یاد ہے، پہلے اس جھنجھٹ سے تو نکل لوں پہلی منزل گرنے کے، یار جتین اس پروجیکٹ میں تو نقصان پہ نقصان ہو رہا ہے اور اسی کارن میں دوسرے پروجیکٹس پر بھی دھیان نہیں دے پا رہا ہوں...... روز ایک نیا تماشہ ہوتا ہے۔"

جتین نے اس کی بات سن کر اسے تسلی دی اور کہا۔" اچھا چل چھوڑ! فکر مند نہ ہو، ابھی تو میٹنگ پر دھیان دے۔" پھر دونوں نے میٹنگ اٹینڈ کی اور پھر ایک کیفے میں بیٹھ کر کافی پی کر گپ شپ کرنے لگے۔

"اب تھوڑا ریلیکس فیل کر رہا ہوں۔" ہرش نے کہا اور ساتھ ہی دونوں کے موبائل بجے۔

دونوں نے کال اٹینڈ کی اور دونوں کو سانپ سونگھ گیا۔ پروجیکٹ میں کنسٹرکشن کے دوران ڈرل مشین چلاتے ہوئے شارٹ سرکٹ ہو گیا تھا در بھاگیہ کہ وہاں پانی بھی پڑا ہوا تھا کرنٹ پھیلنے سے کئی مزدوروں کی مرتیو ہو گئی دونوں فوراً وہاں پہنچے وہاں ان کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ نقصان ہوا تھا دس مزدور مر گئے تھے اور انکی ڈیڈ باڈیز کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی ان کے شریر دیکھنے کے لائق بھی نہ رہے تھے۔

ہرش اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا جتین تو کسی اور ہی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا گاڑی میں دونوں چپ تھے پھر اس خاموشی کو جتین نے توڑا۔" ہرش میری ایک بات مانے گا؟"

ہرش نے جواب میں صرف "ہوں......" کہا۔

جتین بولا۔" یہاں ہوون کروا لے، میں تو کام شروع کروانے سے پہلے کہتا مگر تیرا موڈ دیکھ کر میں نے کہا نہیں۔"

اس کی بات سن کر ہرش اور بگڑ گیا اور بولا۔" اس سے میرا نقصان پورا ہو جائے گا؟"

تو جتین بولا۔" نہیں! یہ تو نہیں ہو سکتا پر تو آگے کا نقصان شاید رک جائے؟"

تو ہرش نے لمبی سانس لی اور بولا۔" اچھا تو پھر جو تجھے اچھا لگے وہ کر، میں تو پک گیا ہوں۔"

جتین نے کہا۔" تیرا اس ہوون میں ہونا ضروری ہے۔" تو ہرش نے اسے گھورا۔

"اوہ! پلیز جتین مجھے مت گھسیٹنا ان سب میں، میرا دماغ تو پہلے ہی خراب ہو چکا ہے، میرا تو دم گھٹتا ہے ان سب چیزوں سے۔" ہرش نے جتین کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

"اچھا آخر میں تھوڑے سمے کے لئے آجانا۔" جتین نے پھر اسے فورس کیا۔

"تیرے کہنے پر ہوون کروا رہا ہوں یہ کافی نہیں ہے بس اس سے زیادہ کی آشا تو مجھ سے مت کرنا۔" ہرش نے بات ختم کر دی تو جتین بھی خاموش ہو گیا۔

☆......☆......☆

پنڈت جی ہوون کرتے ہوئے بار بار چونک رہے تھے ہوون ختم ہوا تو وہ ترنت اٹھ گئے اور مالا جپتے ہوئے آگے بڑھنے لگے پھر وہ کافی آگے تک گئے اور رک کر واپس آگئے جتین ان کی حرکت پر فکر مند ہو رہا تھا اس نے پنڈت جی سے پوچھ لیا۔

"پنڈت جی! کس پریشانی میں ہیں آپ؟"

پنڈت جی نے اس کی بات پر رک کر کہا۔" کچھ تو ہے جو بدھی میں نہیں سما رہا ہے پرنتو ایسا کچھ ہوا ہے جو سامنے نہیں ہے کوئی شکتی، کوئی راز تو ضرور ہے۔"

جتین نہ سمجھنے والے انداز میں پنڈت جی کو دیکھنے لگا پھر بولا۔" کیسا راز۔"

پنڈت جی بولے۔" پتا نہیں میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا کنتو! کچھ تو ضرور ہے اور وہ بھی شکتی شالی!" اور وہاں سے چلے گئے۔

جتین نے پریشان کن انداز میں ہرش کو جا کر سب بتایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔" یہ سب کرتب ہیں لوگوں کو پھانسنے کے ہیں؟ تجھے پتا نہیں ہے انہیں دکشنا چاہئے ہوتی ہے اس لئے لوگوں کو ایسی باتوں میں الجھاتے ہیں۔"

جتین بولا۔ "ہرش! میں پنڈت جی کو جانتا ہوں وہ ایسے نہیں......" مگر ہرش نے اس کی ادھوری بات میں ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا تو وہ چپ ہوگیا۔

ہرش نے سارے معاملات رفع دفع کر کے دوبارہ سے کام شروع کروایا ہرش اس طرف سے کافی فکرمند تھا اس لئے تمام مزدوروں سے بار بار دھیان رکھنے کا کہہ رہا تھا چار دن شانتی سے گزر گئے پر پانچویں روز ہرش کا سکون پھر غارت ہوگیا۔

صبح جب مزدور سائٹ پر پہنچے تو ایک اور تماشا ان سب کے سواگت کے لئے موجود تھا کام کے لئے آئی ہوئی سینکڑوں اینٹیں چورے کا ڈھیر بنی ہوئی تھیں سیمنٹ کی تمام بوریاں پھٹی ہوئی تھیں اور ساری سیمنٹ زمین پر بکھری ہوئی تھی جو جگہ جگہ سے کالی ہو رہی تھی جیسے کیچڑ مکس کردیا گیا ہو اور سریوں کے ڈھیر، چورے کے پہاڑ بنے ہوئے تھے جیسے کسی کرشنگ مشین میں ڈالا گیا ہو کیونکہ لمبے لمبے سریوں کے ڈھیر کو چورے میں بدلنا کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی وہ بھی رات بھر میں۔

سارے مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کردیا اور بھاگ گئے ہرش نے یہ سماچار سن کر اپنا سر پیٹ لیا اس کی کنپٹیاں ایک دم سلگنے لگیں اور اس کا بی پی ہائی ہوگیا۔

جتین اس کے ساتھ تھا ڈاکٹر نے اسے ریلیکس کرنے کا کہا۔

"کیسے ریلیکس کروں؟" ہرش نے دھاڑ کر کہا۔

"مسٹر ہرش! پلیز ریلیکس، اس وقت یہ آپ کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔" ڈاکٹر نے وارن کیا۔

تو جتین نے ہرش کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "ہرش میرے یار! مجھے پتا ہے کہ تیری چنتا بالکل درست ہے پرنتو اس سے چنتا کو دماغ سے بالکل نکال دے یہ کوئی بزنس حریف ہے جو کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے اسے ہم کھوج لیں گے اوکے۔" جتین نے تسلی دی تو ہرش نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کل تو ماریشز جا رہا ہے! میں تیرے لئے سیٹ کنفرم کرادوں گا دو چار دن گزار وہاں پھر واپس آ کر سب دیکھیں گے۔" جتین نے کہا تو ہرش نے گردن ہلا کر اس کی بات مان لی۔ ہرش ایک ہفتہ ماریشز میں گزار کر آیا تو بالکل ریلیکس تھا اس بیچ پروجیکٹ کا کام بھی رکا رہا تھا۔

ہرش شام کی فلائٹ سے واپس آیا تھا اور سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے وہ باتھ ٹب میں لیٹا ہوا تھا دھیما میوزک آن تھا ہرش کے سرہانے شیمپین کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور بھرا ہوا گلاس ہاتھ میں تھا ہرش اپنی آنکھیں بند کئے گلاس میں موجود آئس کیوبز گھما رہا تھا یہ اس کے ریلیکس کرنے کے طریقوں میں سے ایک تھا۔ ہرش نے آنکھیں بند کئے گلاس میں سے سپ لیا ابھی وہ اس کے حلق سے نیچے اترا بھی نہیں تھا کہ ہرش کو اپنے بائیں پیر میں سنسناہٹ محسوس ہوئی تو اس نے پیر ہلایا اور اسے اگنور کردیا اور پھر دوبارہ سپ لیا پھر تھوڑی دیر بعد وہ سنسناہٹ تکلیف میں بدل گئی، ہرش نے پیر اوپر کیا اور اس پر سے جھاگ ہٹائے تو وہ دھک سے رہ گیا ہرش کے پیر پر موجود سوراخ تھوڑے بڑے ہوگئے تھے اور پیر پر نسوں کا جال گھٹنے سے اوپر پہنچ گیا تھا اور ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا ہرش کو ان سے بہت خوف آیا۔

پروجیکٹ میں ہونے والے نقصان کے چکر میں ہرش نے اس طرف بالکل دھیان نہیں دیا تھا، ہرش اچنبھے میں تھا کہ کیا کرے اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گھٹنے کے اوپر موجود نسوں نے واپس نیچے کی طرف آنا شروع کردیا اوپر سے غائب ہوتی جا رہی تھیں اور نیچے کی اور بڑھتی جا رہی تھیں اور پھیلتے پھیلتے پیر کے ناخنوں تک آ کر رک گئیں اور ناخن سیاہ ہوگئے ہرش کو اپنے پیر کے ناخنوں میں اگنی کی لپٹیں اٹھتی محسوس

ہونے لگیں پھر ان کی شدت بڑھتی گئی اتنی کہ ہرش کی برداشت کی سیما کو پار کرگئی ہرش کی چیخ نکل گئی پھر ان ناخنوں سے سیاہ دھواں نکلنے لگا۔

پھر دھواں آہستہ آہستہ گاڑھا ہو رہا تھا اور پھر اس دھوئیں نے جمع ہونا شروع کردیا اور ایک وجود کی شکل اختیار کرنے لگا ہرش اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا جب اس دھوئیں نے پوری شکل اختیار کرلی تو ہرش کا خون اس کی رگوں میں جمنے لگا۔ وہ وہی درخت تھا جس کا چہرہ سیاہ عورت کا تھا اور سر پر سینگ نما ٹہنیاں نکلی ہوئی تھیں اس کی آنکھیں بند تھیں ہرش نے وشواس نہ آنے پر اپنی آنکھیں ملیں لیکن وہ درخت نما عورت یا عورت نما درخت وہیں موجود تھے پھر اس عورت نے اپنی بند آنکھیں کھولیں وہی خالی گڑھے جن میں پتلیوں کی جگہ آگ جل رہی تھی اور گاڑھا خون بہہ رہا تھا شعلے اگل رہے تھے۔

ایک دم اس عورت نے سیاہ دھوئیں میں لپٹے اپنے ہاتھ آگے کیے جنہوں نے سٹ کر درخت کی شاخوں کا روپ دھارن کرلیا اور آگے بڑھ کر ہرش کے پیر میں موجود سوراخوں میں گھسنا شروع کردیا اس کا ایسا کرنا تھا کہ ہرش کو لگا کہ اس نے ننگے تار کو چھولیا ہو اسے جھٹکے لگنا شروع ہوگئے اس کے پیر میں کھال کے نیچے نسوں کی جگہ درخت کی جڑیں پھیلنے لگیں اور پھیلتے پھیلتے ہرش کے سینے تک پہنچ گئیں ہرش کے منہ سے فلک شگاف چیخیں نکلنے لگیں اور وہ سینہ پکڑ کر تکلیف سے بے ہوش ہوگیا۔

ہرش کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اجنبی جگہ پایا اسے یاد آیا وہ تو باتھ ٹب میں تھا دروازہ کھلا اور جتین اندر آیا۔

"میں کہاں ہوں؟" ہرش نے پوچھا۔

"ش ش ش....." جتین نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

"مت بول ہرش تجھے سخت ہارٹ اٹیک ہوا ہے" جتین کی بات پر ہرش اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"ہارٹ اٹیک؟ مجھے تو کبھی کوئی ہارٹ پرابلم نہیں رہی۔" اس نے کہا۔

"یہی تو میں تجھ سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ آخر ایسا کیا ہوا تھا؟ ہرش جو تجھے ہارٹ اٹیک ہوگیا۔" جتین کے بولنے پر ہرش کی آنکھوں کے آگے وہی منظر گھوم گیا اور اس نے خوف سے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرلیں۔

"مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔" ہرش نے جھوٹ بولا۔

"اوکے! اوکے ریلیکس! تو کچھ مت یاد کر، بس آرام کر....." جتین نے جلدی سے کہا۔

"جتین! میرے پیر میں درد ہے! ذرا میرا الٹا پیر تو دیکھنا۔" ہرش نے کہا تو جتین نے اٹھ کر اس کا پیر دیکھا۔

"یار وہ جو چوٹ لگی تھی تیرے اس کی نسیں سرخ ہو رہی ہیں۔" جتین نے بتایا تو ہرش نے سکون کا سانس لیا اور دل ہی دل میں اطمینان سے سوچا۔

"یہ بھی میرا خواب ہی تھا، میں بلاوجہ چنتا کررہا ہوں۔"

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مہتا اندر آگئے وہ ہرش کے کلوز فرینڈ ہونے کے ساتھ دیش کے جانے مانے ہارٹ سرجن بھی تھے۔

"ہیلو ہرش! اب کیا حال ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اوکے....." ہرش نے مختصر جواب دیا۔

"یار مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہرش وردھن اتنا کمزور دل کا مالک ہے کہ اتنی سی بات پر دل پکڑ لے گا۔" ڈاکٹر مہتا نے ہرش کو چھیڑا۔

"مجھے کیا ہوا ہے؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" ہرش نے کہا۔

"ہرش! یہ تو تھی مذاق کی بات اور سیریس بات یہ ہے کہ تجھے سخت ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور جہاں تک میرا ایکسپیرئینس ہے مسئلہ تیرے بائیں پیر کی رگوں کا

ہے جو دل تک جارہی ہیں اگر پرابلم زیادہ ہوئی تو سرجری کرنی پڑسکتی ہے ابھی یہ صرف میرا خیال ہے ہوسکتا ہے یہ خیال غلط ہو ابھی کوئی بات ختمی نہیں ہے ہم پہلے اس سے ریلیٹیڈ کچھ ٹیسٹ کرلیں پھر فائنل بات کریں گے ابھی تو سب بھول کر تو صرف ریسٹ کر۔" ڈاکٹر مہتا نے کہا اور روم سے چلے گئے۔

جتین ڈاکٹر کی بات سے چنتت ہوگیا اور بولا۔

"ہرش یار! میں جانتا ہوں کہ تو میری باتوں کو نظرانداز کردے گا کتو میرے کہنے سے ایک بار کیول ایک بار مجھے اس معاملے میں کسی شکتی شالی تانترک سے بات کرنے دے؟"

ہرش خاموش رہا دراصل وہ جتین کی بات سن ہی نہیں رہا تھا اس کے دماغ میں تو وہ خواب والا درخت چل رہا تھا جس کا چہرہ سیاہ عورت کا تھا جس نے پہلی بار ہرش کا پیر پکڑا تھا تکلیف ہرش کو جبھی شروع ہوئی تھی ورنہ اس سے پہلے تو اس کا پیر بالکل ٹھیک تھا۔

"بول ہرش! پھر کیا کہتا ہے۔" جتین کی آواز پر ہرش سوچ سے باہر آ گیا۔

"کیا کہا......؟" تو جتین نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"رہنے دے تو، میں خود کرلوں گا۔" اس نے ہرش سے کہا تو ہرش پھر سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

"مجھے پنڈت جی نے بھیجا ہے آپ نے میری مدد کرنی ہے۔" اس شخص نے جتین سے کہا۔ جس کے حلیے کو جتین غور سے دیکھ رہا تھا ادھ ننگا تھا گیروے رنگ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی، ہاتھوں اور گلے میں دھاگے باندھے ہوئے تھے۔

"میرا نام جتین ہے؟ اور آپ کا شبھ نام؟" جتین نے پوچھا۔

"شیوا!" اس شخص نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں اور بنا دیکھے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا پھر وہ ہرش کے آفس کی جگہ آ کر رک گیا۔ جتین نے کچھ کہنا چاہا پھر کچھ سوچ کر رک گیا وہ شخص وہیں رکا رہا اور پھر کافی دیر گزرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔

"ایک کالا بکرا منگواؤ۔" اس نے کہا تو جتین اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"آج؟"

تو وہ شخص بولا۔ "ابھی ترنت۔" تو جتین نے موبائل نکالا اور اپنے بندے کو بکرا لانے کو کہا۔ جتین کا بندہ تھوڑے ہی سمے میں کالا بکرا لے آیا...... اس شخص نے اپنے کاندھے پر لٹکی جھولی میں سے مٹی نکالی اور اسے بکرے کے سر پر لگا دیا پھر دوبارہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دینے لگا اس کا ہاتھ جھولی میں گیا اور اس میں سے ایک کھونٹا نکالا پھر اس پر پھونک ماری اور چاروں طرف کمرے میں گھومنے لگا پھر ایک کونے میں رک کر اس کھونٹے کو گاڑ دیا اور اس سیاہ بکرے کو اس کھونٹے سے باندھ دیا پھر جھولی میں سے سیندور نکال کر اس کھونٹے اور بکرے کے سر پر لگا دیا اور جتین کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا اور آفس سے نکل کے باہر آ کر بولا۔

"آج کی رات بیت جائے تو کل سورج کے نکلنے کے بعد یہاں آنا اور جو دیکھنا وہ مجھے بتانا کہ یہاں کیا نظر آیا ہے؟" اور پھر وہاں سے چلا گیا جتین بھی وہاں سے چلا گیا۔

اگلے روز سورج نکلتے ہی جتین جلدی سے گاڑی لے کر پروجیکٹ سائٹ پر پہنچ گیا اور تیزی سے ہرش کے آفس گیا دروازہ کھولتے ہی جتین کے ہوش اڑ گئے، زمین نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا اس کی آنکھیں حیرت وخوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرے کے کونے میں گڑے کھونٹے سے بندھے بکرے کا صرف سر تھا جو کہ کٹا ہوا تھا اور باقی دھڑ غائب تھا اور اس جگہ خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

جتین الٹے قدموں چلنے لگا اور پھر وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور شیوا جی کے پاس جا کر ہی رکا۔ اس نے شیوا جی کو سب کچھ بتا دیا اور انہیں دیکھنے لگا۔

شیوا جی بولے۔ "ہمیں کل ہی معلوم ہوگیا تھا

کلنوتم وشواس نہ کرتے اسی کارن اس مسئلے کو دور کرنے کے لئے یہ عمل کیا تاکہ سب کچھ تمہارے سامنے آجائے اور تم اپنی آنکھوں سے حقیقت دیکھ لو۔“

جتین نے ہاتھ جوڑ کر شیوا جی سے پوچھا۔”یہ کیسی سمسیا ہے شیوا جی؟“ تو شیوا جی نے لمبی سانس لی اور بولے۔

”تمہارا دوست اپنے سروناش کا کارن سویم ہے اور یہ وہ جانتا ہے پرنتو آستیہ سے کام لے رہا ہے۔“ ان کی بات سن کر جتین بولا۔

”شما کیجیے! شیوا جی میری بدھی میں تو کچھ بھی نہیں آرہا ہے میں اپنے متر کو آپ سے ملواتا ہوں پھر اس کے سامنے اس وشے میں بات کرتے ہیں۔“

شیوا جی نے جتین کی بات سن کر کہا۔” جو بھی چاہے کرلو پرنتو تمہارا متر جس دلدل کے بھیتر جا چکا ہے اس میں سے نکلنا ممکن نظر نہیں آرہا۔“ جتین نے سمجھنے والے انداز سے شیوا جی کو دیکھنے لگا۔

ادھر ہرش نے کافی دنوں سے کوئی بزنس ڈیلنگ نہیں کی تھی بس ڈاکٹرز کی ہدایات پر آرام کررہا تھا۔ سارا کام جتین دیکھ رہا تھا اور آج اس نے ہرش سے کسی کی ملاقات کروانے کا کہا وہ بھی کسی اہم کام کے لئے۔

پھر جب جتین شیوا جی کو لے کر آیا تو شیوا جی کو دیکھ کر ہرش کا منہ بن گیا اور وہ بولا۔

”جتین یار! یہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے تو؟ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں ایسے پاکھنڈیوں کو، یہ عام لوگوں کو باتوں کے جال میں الجھا کر جانے کس لوک میں پہنچا دیتے ہیں یہ ساگری لاؤ اس کی دکشنا اب یہ چیز آویشک ہے اب یہ کردو اب وہ کردو آخر کار تنگ آکر بندہ کہتا ہے یہ روپے لو اور سب کچھ خود ہی کردو اور اس الجھاؤ کے لئے تو سارا بکھیڑا رچا جاتا ہے۔“

جتین کبھی ہرش کی شکل دیکھتا تو کبھی شیوا جی کی ،اس نے شیوا جی سے کچھ کہنا چاہا تو شیوا جی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور ہرش کی اور منہ کرکے بولے۔

”میں یہاں اپنی اچھا سے نہیں اس شخص کی خواہش پر آیا ہوں چرن نہیں چھوئے تھے کہ مجھے یہاں بلاؤ، سمسیا تمہاری ہے میری نہیں اور مورکھ ہے جو ایک گیانی کا اپمان کرتا ہے اسے نرآدر کرتا ہے تیری اشانتا ہی تیرے سروناش کا کارن ہے جس سنکٹ میں تو گھرا ہے وہ تیرے عمل کی کرنی ہے جسے تو اب بھوگے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جسے تو اپنا بھرم جان رہا ہے ناں وہ ستیہ ہے۔“ اس بات پر ہرش چونک گیا اور جلدی سے بولا۔

”کس بھرم کی بات کررہے ہو؟ مجھے کوئی بھرم نہیں ہے۔“

تو شیوا جی بولے۔”من کے بھیتر کا بھید جانتے ہیں ہم“ تو ہرش بولا۔

”اتنا گیان ہے تو بتا کیا بھید ہے؟“

ہرش کی بات پر شیوا جی ہنستے ہوئے بولے۔” میرے پاس گیان کہاں ہے؟ میں تو پاکھنڈی ہوں، میں کیسے بتاؤں؟“ شیوا جی کی بات سن کر ہرش کھسیانہ ہوگیا۔

شما کیجیے شیوا جی! اس کی بات کا ارتھ آپ کو کہنا نہیں، دوسرے پاکھنڈیوں کو کہنا ہے آپ کرپا کرکے ہمری سہائتا کریں۔“ جتین نے معاملے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا تو شیوا جی خاموش ہوگئے۔

ہرش کا موبائل بجا تو اس نے اسکرین دیکھ کر جتین سے کہا ڈاکٹر مہتا ہیں۔

جتین نے کہا” اسپیکر آن کرکیا کہتے ہیں ڈاکٹر مہتا؟“ تو ہرش نے اسپیکر آن کردیا اور بولا۔

” کہو کیسے ہو مہتا؟“ تو اسپیکر سے آواز سنائی دی۔

”میں تو ٹھیک ہوں ہرش! پر تیرے دل کا معاملہ بہت گمبھیر ہے! سب کچھ الجھا ہوا ہے اور کوئی خاص ریزن بھی پتا نہیں چل پارہا ہے۔ پر مسئلہ بڑھ رہا ہے آئی تھنک کہ ہارٹ سرجری کرنی پڑے گی ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے تو کل آ پھر اس مسئلے پر بات کرتے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

ہیں۔" جتین شیوا جی کی اور دیکھ کر بولا۔

"سہائیتا کریں شیوا جی۔" اور ہرش کو بھی اشارہ کیا کہ وہ شیوا جی سے کہے، پرنتو ہرش نے منہ دوسری اور کرلیا۔

شیوا جی بولے۔ "تمہیں کیول سمسیا کے بارے میں سوچت کرسکتا ہوں، اس کا اپائے نہیں کرسکتا۔"

جتین نے ان کی بات سن کر ہاتھ جوڑ لئے اور بولا۔

"اپنے متر کی اور سے میں شما مانگتا ہوں اس وقت اس کی دماغی سوچ ٹھیک نہیں ہے، کرپا کیجیے اب تو کیول آپ کا ہی آسرا ہے۔"

شیوا جی نے گہری سانس لی اور بولے۔ "بات تمہارے متر کے سوبھاؤ کی نہیں ہے بالک! ہم نے جو کہا کہ ہم اپائے نہیں کرسکتے تو اس کا ارتھ ہے کہ نہیں کرسکتے تمہارے متر کے لئے بالکل بھی اچھے سمار چار نہیں ہیں وہ جس سنکٹ میں پڑ چکا ہے اس سے نکلنے کا اپائے تو ہے پرنتو اس کا سمے اب بہت پیچھے رہ گیا ہے اب ہم تو کیا کوئی بھی تمہارے متر کی سہائیتا نہیں کرپائے گا اور تمہارے متر کا خاتمہ اٹل ہے۔" یہ سن کر ہرش اور جتین سناٹے میں آگئے۔

جتین نے آگے بڑھ کر ان کے چرن پکڑ لئے۔ "یہ سب کیا ہے شیوا جی؟" اب تو ہرش بھی اس اور متوجہ ہوگیا تھا شیوا جی نے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر کچھ دیر رک کر دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں اور سانس لے کر بولنا شروع ہوگئے۔

"یہ جو سنسار ہے ناں اس کے لئے ایشور نے کچھ نیم بنائے ہیں ہر شے اپنی سیما کے دھارے میں بہتی ہے اور ایشور نے اس سنسار میں کیول انسان شکتی ہی نہیں اور شکتیوں کو بھی جنما ہے اور اگر ان تمام شکتیوں میں سے کوئی بھی شکتی اپنے دھارے کی سیما سے نکل کر دوسرے دھارے میں پراوش کرتی ہے تو اس ٹکراؤ سے سنتولن بگڑ جاتا ہے اور پھر یہی بگاڑ ارچنوں کو بلاوا دیتا ہے۔ اب چاہے انسان شکتی دوسری شکتی سے ٹکراؤ کرے یا وہ انسان شکتی سے اور یہی کچھ تمہارے متر نے کیا، ہر کار کا ایک قاعدہ ہوتا ہے پرنتو تمہارے متر نے اپنے آپ کو بھگوان جانا اور اشٹنا وگھر ینا کی سیمائیں لانگ کر گھور پاپ کیا ہے، کیول ایک زمین کے ٹکڑے کے لئے ایک ماں کے کلیجے کے ٹکڑے کو کاٹ دیا یہ کیا سمجھا کہ سنسار کی نظروں میں مہان ہے تو ایشور کے ساتھ بھی چھل کرے گا اس ماتا کا شراپ لگا ہے اسے تبھی تو اس نے اپنی شامت کو آپ ہی نیوتا دیا ہے دھرتی کے سینے پر کھڑے ان برسہا برس کے پرانے پیپل کے درخت کے اندر ہزاروں چھپے ہوئے تھے جسے اس نے اپنے اہنکار میں یوں ہی اکھاڑ پھینکا بنا کوئی اپائے کے۔"

جتین نے حیرانی سے پوچھا۔ "پیپل کے درخت تو جانے کتنے ہوتے ہیں اور ایسے کاموں میں تو اکثر کاٹنے پڑتے ہی ہیں تو اس میں ایسا کیا ہے۔"

تو شیوا جی بولے۔ "وہ کوئی عام پیپل کے درخت نہیں تھے برسوں سے ایک بوڑھی عورت اس پیپل کے درخت کے نیچے پڑی رہتی تھی جب وہ صرف ایک درخت تھا وہ عورت بس آسن جمائے تپسیا کرتی رہتی، نہ کھاتی، نہ پیتی سر جھکائے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہتی کبھی پیپل کے درخت کے پھیرے لیتی رہتی تو کبھی اس کے تنے سے لپٹی پڑی رہتی اس کا اور پیپل کے درخت کا ایک سمبندھ تھا؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا اس کے جیون کا ایک ایک شن پیپل کے درخت کے ساتھ بیتا تھا ایک پتہ بھی اس پیپل کے درخت سے گرتا تو وہ دیوانوں کی طرح اسے جھپٹ لیتی۔

لوگوں کا کہنا تو یہ تھا کہ وہ بوڑھی عورت اور پیپل کے درخت پتی پتنی ہیں اور وہ بوڑھی عورت کوئی عام عورت نہیں تھی بلکہ عورت کے روپ میں کوئی نادیدہ شکتی تھی یا پھر پیپل کے درخت کی چڑیل کنتو اس نے کبھی بھی کسی کو تنگ نہیں کیا بس وہ پیپل کے نیچے رہتی تھی وہ کہاں سے آئی اس کی عمر کیا تھی اس کا نام کیا تھا؟ کسی کو بھی معلوم نہ تھا لوگ خوف سے اس کے قریب نہ جاتے تھے۔

پھر ایک روز وہ ہوا کہ سب حیران رہ گئے وہ عورت پیپل کے درخت کے نیچے سے غائب ہوگئی کہاں گئی یہ بھی آج تک راز ہی ہے پرنتو وہ جانے کے بعد اپنے پیچھے لوگوں کے لئے ایک اور کتھا چھوڑ گئی اس بوڑھی عورت کے غائب ہوتے ہی اگلے روز کیول ایک ہی راتری میں اس پیپل کے درخت کی جڑ سے ایک نیا تناور پودا پھوٹ پڑا پیپل کی جڑ سے جڑا ہوا درخت اور اوپر سے بھی پرانے پیپل کے درخت کے ساتھ جڑا ہوا لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ دوسرا درخت وہی بوڑھی عورت ہے جو تپسیا سے درخت میں پیوست ہوگئی۔ برسوں سے وہ دونوں پیپل کے درخت دھرتی پر کھڑے تھے مگر تمہارے متر نے بنا جانے بنا معلوم کرکے انہیں سنگدلی سے اکھاڑ پھینکا ارے اتنی سی بات نہیں جانتا تیرا یہ مورکھ متر کہ اتنے پرانے درختوں کے تو نیچے سے گزرتے ہوئے بھی ویکتی ساودھان رہتا ہے پرنتو اس کی مورکھتا تو دیکھو! بنا کسی پوجا کے بنا کوئی سیما باندھے بنا کسی سورکھشا کاوچ کے انہیں اکھاڑ پھینکا اب وہ شکتی اسے نشٹ کئے بنا نہیں چھوڑے گی۔"

شیواجی خاموش ہوگئے اور وہاں سے پلٹ کر واپس جانے لگے تو جتین دوڑ کر ان کے سامنے آیا اور ہاتھ جوڑنے لگا شیواجی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"تیرا پیار تیرے دوست کے لئے اپنی جگہ ہے لیکن ہم نے کہا ناں کہ سے نکل گیا ہے۔" اور وہاں سے چلے گئے۔

شیواجی کے جاتے ہی ہرش زور سے ہنسا اور بولا۔" اسے پتا چل گیا ناں کہ یہاں اس کی دال نہیں گلے گی اور یہاں سے اسے کچھ بھی مالی فائدہ نہیں ہوگا اس لئے اس کو کچھ بھی نظر نہیں آیا تو کہنے کو کچھ جڑا نہیں تو اس نے جھوٹی کہانی گھڑی اور ہمیں سنادی پیپل کے درخت کی واہ واہ! میری بیماری کو جانے کیا روپ دینے کی کوشش کررہا ہے۔ ایسے لوگ فراڈی ہوتے ہیں۔ رہی بات پریشانی کی تو وہ تو ہر دور میں آتی رہی ہیں کل میں مہتا سے مل کر سرجری کی ڈیٹ ڈیسائیڈ کرتا ہوں پھر سدا کے لئے اس سمسیا سے مکت ہوجاؤں گا۔"

جتین خاموشی سے ہرش کو تکے جارہا تھا پھر ہرش سے بولا۔" تیرا میرا بچپن کا ساتھ ہے اور ہم دونوں نے کبھی ایک دوجے سے کچھ نہیں چھپایا تو مجھ سے صاف صاف کہہ کہ شیواجی کیا کہہ رہے تھے کہ تو نے جانتے بوجھتے سب کیا ہے۔"

ہرش دوبارہ ہنسا اور بولا۔" جتین میرے یار! میں سچ مچ میں کچھ نہیں جانتا، اگر جانتا ہوتا تو تجھے بالکل بتاتا اور میرے تمام کاموں میں تو برابر کا پارٹنر ہے۔"

جتین آگے بڑھا اور ہرش کو کاندھے سے پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولا۔" یہ سچ ہے کہ اس بوڑھی عورت کا گھر تو نے جان کر گروایا تھا جس میں دب کر اس کے پتر کی مرتیو ہوگئی اور وہ ابھاگن اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی اور پاگل خانے پہنچ گئی۔"

تو ہرش نے اپنا چہرہ جتین کی اور سے موڑ لیا۔ جتین نے اسے دوبارہ پکڑ کر واپس اپنی اور کیا اور بولا۔ "ہرش اتنا بڑا پاپ کیا تو نے وہ بھی کیول ایک زمین کے لئے، وہ بھی اس زمین کے جو تیری تھی ہی نہیں تیری زمین ختم ہونے کے بعد ان کا پیڑھیوں پرانا مکان تھا جو تو نے اپنی انا اور غرور کے تحت گرادیا۔"

جتین کی بات پر ہرش ڈھٹائی سے بولا۔" میں نے کوئی پاپ نہیں کیا یہ تو ایک گھٹنا تھی جو گھٹ گئی۔"

جتین جھلا کر بولا۔" صحیح کہہ رہا ہے تو نے پاپ تھوڑی کیا ہے، تو نے کیول آنند پراپتی کی ہے۔" تو ہرش بغیر کچھ کہے کمرے سے چلا گیا۔

جتین اور ہرش نے ڈاکٹر مہتا سے مل کر ہارٹ سرجری کی ڈیٹ فائنل کرلی دو دن بعد ہرش کو ایڈمٹ ہونا تھا جتین ہرش اکے ساتھ ہی تھا ہرش اپنی تمام ضرورت کی ڈیلنگ کمپلیٹ کررہا تھا کیونکہ اس نے

سرجری کے بعد بھی کافی سے ریسٹ کرنا تھا۔اس سے وہ اور جتین اپنے اسی آفس آئے ہوئے تھے جس کا کام جانے کب سے رکا ہوا تھا پریشانی اور فکر نے ہرش تنگ کردیا تھا،ابھی بھی دونوں اس مسئلے پر بات کررہے تھے کہ جتین کا موبائل بجا اس نے اسکرین دیکھی اور کال ریسیو کی دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو جتین نے گھڑی دیکھ کر او کے کہا اور فون بند کرکے ہرش سے کہا۔''میں ابھی آتا ہوں دس منٹ لگیں گے بس۔''

''جا کہاں رہا ہے تو؟ کس کی کال تھی؟'' ہرش نے پوچھا۔

''یار! وہ ہے ناں اگروال،اس کو ہمیں پرسوں پے منٹ کرنی تھی پر تو اسے کل اچانک پونا جانا پڑ رہا ہے اور اس کی واپسی چار پانچ روز میں ہوگی تو وہ کہہ رہا ہے کہ میں ابھی چیک لے جاؤں! وہ نہیں آجائے گا کیونکہ وہ پریوار کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہے میں آتا ہوں چیک لے کر،کیول دس منٹ لگیں گے پھر ساتھ چلیں گے۔''

جتین نے بتایا تو ہرش سوچ کر بولا۔''راجن اگروال۔'' تو جتین نے ہاں میں گردن ہلائی اور ٹیبل سے چابی اٹھا کر آفس سے نکل گیا اور باہر چوکیدار سے ہرش کا دھیان رکھنے کا کہہ کر چلا گیا جتین کے جانے کے بعد ہرش نے کرسی پر بیٹھ کر آرام سے پیر اٹھا کر ٹیبل کے اوپر رکھ لئے اور آنکھیں موندلیں۔

''چھن...... !'' کی زور سے آواز نے ہرش کو چونکا دیا اس نے دیکھا تو ٹیبل پر رکھی اس کی گاڑی کی چابی نیچے گر گئی تھی ہرش دوبارہ آنکھیں بند کررہا تھا کہ اس کی نگاہ پانی کے گلاس پر پڑی جو دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور آگے سرک رہا تھا پھر وہ تیزی سے کنارے تک پہنچ گیا اور نیچے گر کر ٹوٹ گیا ہرش نے ترنت پیر نیچے کئے اور سنبھل کر بیٹھ گیا اس نے غور کیا تو آفس کا فرش لرز رہا تھا اور اس کی شدت تیز سے تیز ہوتی جارہی تھی پھر ٹیبل دھڑ! دھڑ! کرکے ہلنے لگی ہرش کو لگا کہ زلزلہ آگیا ہے وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اس کے قدموں کے سامنے فرش میں دراز پڑنا شروع ہوگئی اور فرش دو ٹکڑے ہوگیا ہرش کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ پھر اس ٹوٹے ہوئے فرش میں سے سیاہ دھواں نکلنا شروع ہوگیا اور پھیلتے پھیلتے چھت تک چلا گیا اور دھیرے دھیرے اس نے اسی سیاہ درخت کی شکل اختیار کرلی جس کا چہرہ عورت کا تھا۔اس کے وجود سے سیاہ جڑیں نکل کر سارے کمرے میں پھیلنا شروع ہوگئیں۔

ہرش بت بنا یہ سب دیکھ رہا تھا۔''لگتا ہے اس شیوا جی کی باتیں میرے دماغ میں گھسی رہ گئی ہیں۔'' ہرش بڑبڑایا اور اپنی آنکھیں ملیں مگر اس کی آنکھوں کے سامنے کا منظر تبدیل نہ ہوا پھر ان سیاہ جڑوں نے اپنا رخ ہرش کی اور کرلیا اور آگے بڑھ کر ہرش کی ٹانگوں کو جکڑ لیا اور اس کے بائیں پیر پر موجود دونوں سوراخوں میں داخل ہونا شروع ہوگیا۔

درد سے ہرش کی چیخ نکل گئی وہ جڑیں تیزی سے ہرش کے پیر کے بھیتر جارہی تھیں پھر ہرش کی کھال کے نیچے سے وہ جڑیں جھلکنے لگیں اس کے ہاتھوں،پیروں،چہرے پورے شریر میں نسوں کی جگہ وہ جڑیں جال کی طرح پھیل گئیں۔

ہرش خوف زدہ انداز میں اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اس کے شریر میں انگارے سے دوڑنے لگے اور ہرش کی تکلیف نے انتہا کو اس سے چھولیا جب اس کے شریر کی چمڑی نے پھٹنا شروع کردیا ہرش کی چیخیں آکاش ہلانے والی تھیں مگر شاید اس کی آواز کسی اور کو نہیں سنائی دے رہی تھی،جو کوئی بھی اس کی سہائتا کے لئے نہیں آرہا تھا،چمڑی پھٹنے کے ساتھ ساتھ ہرش کے شریر پر سے ماس نے ہٹنا شروع کردیا اور ساتھ ہی ہڈیوں کے اوپر درخت کی چھال نکلنا شروع ہوگئی۔

ہرش کے سینے کی کھال پھٹ گئی اور ماس ہٹ گیا تو اس سینے میں دھڑکتا دل نظر آنے لگا جنہیں اب جڑیں جکڑ رہی تھیں۔

پھر ایک دم سے ان سیاہ جڑوں نے سمٹنا شروع کر دیا اور ہرش جڑوں کے ساتھ کھنچتا ہوا اس عورت کے سامنے چلا گیا۔ اس عورت نے اپنا منہ کھول دیا اس کا منہ اتنا بڑا تھا جیسے کوئی غار ہو، ہرش چیختا ہوا اس کے منہ کے اندر چلا گیا۔

اس درخت نما عورت نے اپنا منہ بند کر لیا اور دوبارہ چیخ کر بولی۔

"پراتی شود......!" پھر منہ بند کر لیا اور دوبارہ دھوئیں میں تبدیل ہو کر دھرتی میں سمانا شروع کر دیا، تھوڑے ہی سمے میں تمام دھواں زمین میں چلا گیا اور زمین واپس برابر ہو گئی اور سب کچھ اپنی جگہ واپس آ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

جتین واپس آیا تو ہرش اپنے آفس سے غائب تھا، جتین سمجھا وہ اٹیچ باتھ روم میں ہے اس نے ویٹ کیا پر ہرش باہر نہیں آیا اس نے دروازہ ناک کر کے کھولا وہ خالی تھا ہرش کی گاڑی بھی باہر کھڑی تھی تو وہ واپس بھی نہیں گیا تھا ہرش کا موبائل اس کی گاڑی کی چابیاں دونوں ٹیبل پر ہی رکھے ہوئے تھے تو پھر آخر ہرش کہاں گیا؟ جتین نے گارڈ سے جا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ

"ہرش سر تو باہر آئے ہی نہیں۔"

اب تو جتین کی چنتا اور بڑھ گئی آخر ہرش گیا تو کہاں گیا؟ جتین نے ہرش کو ہر جگہ تلاش کیا کنتو اس کا کچھ پتا نہ چلا پھر ایک روز جتین کو گارڈ نے کال کر کے ترنت ہرش کے نئے والے آفس آنے کا کہا جتین ترنت وہاں پہنچ گیا اور اپنی جگہ ہل کر رہ گیا۔

"ہرش کے نئے آفس کے بیچوں بیچ ایک تناور درخت اگا ہوا تھا جس کے دو تنے تھے یا پھر وہ دو درخت ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے جیسا کہ شیواجی نے بتایا تھا۔ جتین نے شیواجی سے دوبارہ رابطہ کیا اور ان سے التجا کی کہ وہ اس کی سہائتا کریں وہ اپنے متر کو کھوجتے ہوئے تھک گیا ہے اور اب یہ دو درخت اس کی سمجھ کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔ شیواجی جتین کے کہنے پر ہرش کے آفس آ گئے اور جتین سے بولے۔

"ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے متر کے پاس سمے نہیں ہے مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے متر کے پاپوں میں تم حصے دار ہو یا نہیں، پرنتو تمہارے متر کے پاپوں کا گھڑا بھر چکا تھا پرابھو کے بنائے نردھنوں کو ہمیشہ کیڑے مکوڑے جان کر انہیں پیروں تلے روندا ہے اس نے اور اپنے آپ کو بھگوان سمجھا ہے کہ وہ جو چاہے کر لے گا اور جس کا چاہے بھاگ اپنی اچھا کے انوسار لکھ دے گا مگر اس بار شاید اس کی چھوٹ ساپت ہو گئی تھی جب ہی اس کا سامنا ایک عجیب شکتی سے ہو گیا یہ اس کا ڈنڈ ہے کیونکہ وہ ڈنڈ پوتر ہے میں نے پہلے ہی تمہیں سوچت کر دیا تھا کہ وہ اسے نہیں چھوڑے گی تمہارے متر کی کتھا ساپت ہو چکی ہے لے گئی وہ اسے سدا کے لئے اور تمہارے متر کے مرتیو نے دوبارہ اس کی شکتی کو جیون دان دیا ہے اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تم کیول اپنا سمے نشٹ کر رہے ہو اور کچھ نہیں پرنتو ایک بات کا ہمیشہ دھیان رکھنا یہ درخت کبھی مت کاٹنا ورنہ تمہارا انت بھی تمہارے متر جیسا ہی ہو گا اور اگر تم بھی اپنے متر کی طرح پاپ کرتے رہے ہو تو تمہارے پاس وقت ہے کہ تم اپنے پاپوں کا پرائشچت کر لو ورنہ ایسا نہ ہو کہ سمے نکل جائے۔" جتین سر جھکائے شیواجی کی باتیں سن رہا تھا۔

"جیسا آپ کا آدیش شیواجی کنتو! اس درخت نے کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو؟" اس نے کہا تو شیواجی بولے۔

اس کا اپائے یہ ہے کہ اس درخت کے ساتھ ہی شیوجی کی مورتی رکھنی پڑے گی جو اس شکتی کی سیما باندھ دے گی اور ہاں یہ بھی دھیان رہے کہ شیوجی کی مورتی یہاں سے نہ ہٹے کسی بھی طور سے اور نہ ہی کوئی اس درخت کو کاٹنے کی بھول کرے۔" ان کی بات سن کر جتین نے گردن ہلا دی اور شیواجی جتین کو شیوجی کی مورتی کی حقیقت کے بارے میں بتانے لگے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM



نادیدہ مخلوق

نیناخان-کراچی

رات کے گھپ اندھیرے میں اچانک ہوائی مخلوق کی آواز گونجی اس جگہ سے جتنی جلدی ہوسکے چلے جائو یہ ہماری جگہ ہے اور اپنی جگہ کی حفاظت ہم ہر صورت کریں گے چاہے جان لینی پڑجائے۔

خود کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھنے والا اکثر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں

1997ء میں جب ابا نے سی سینٹر کے گنجان آباد علاقے میں نیا گھر خریدا تو اس وقت اس علاقے میں اتنی آبادی نہ تھی۔ ابا ایک سخت مزاج اور انتہائی اصولی انسان تھے اور اپنی سمجھ بوجھ سے ہی چلتے تھے۔ ابا نے اپنی مرضی سے بغیر کسی کو دکھائے گھر کا سودا طے کرلیا تھا۔ جب ابا گھر خرید چکے تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بلال بیٹا میں نے سی سینٹر میں ایک گھر خریدلیا ہے۔ اور اس کی فل پیمنٹ بھی کردی ہے آج ہی مجھے گھر کی فائل ملی ہے تو تم کل اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سامان شفٹ کروادینا۔ پرسوں پھر ہم سب اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوجائیں گے۔"

ابا کی بات سن کر میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ابا جیسا آپ کہیں۔ میں کل ہی تمام سامان شفٹ کرتا ہوں۔"

ابا چونکہ بہت سخت مزاج آدمی تھے تو ان سے جرح کرنے کی ہمت کسی کی نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ میں پہلی اور بڑی اولاد تھا اس لئے ہر کام کی ذمہ داری شروع سے مجھے ہی سونپی جاتی ہے۔ اماں اور میری دونوں بہنیں ابا سے تھوڑا خائف تھیں کہ کم سے کم ہمیں ایک بار گھر تو دکھا دیتے لینے سے پہلے مگر ابا سے کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

کہتے ہیں کہ پہلی اولاد پر سختی کرو اور اس کی اچھی تربیت کرو تو باقی بچے بھی اسی طرح پروان چڑھتے ہیں بس ابا کی اسی سوچ نے جہاں مجھے بہت اچھا سکھایا تو وہیں انتہائی سختی کا سامنا بھی بس مجھے ہی کرنا پڑا۔

ابا ایک تہجد گزار پانچوں وقت نماز کے پابند ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں 17 گریڈ کے افسر بھی تھے ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ بس وہی اوصاف وہ مجھ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے بھی تہجد میں ڈانٹ کر اٹھاتے۔ پھر فجر میں بھی تو اسی لئے بچپن سے میں بھی نہ صرف تہجد گزار بلکہ پانچوں وقت کا نمازی بھی تھا۔

بچپن سے مجھے تحقیق کا بہت شوق رہا ہے اسی شوق کی خاطر ایسے ایسے کام کر دیئے کہ عام بندہ تو بس صرف سوچ ہی سکتا ہے۔ میں انتہائی نڈر انسان ہوں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں بس تحقیق کی جستجو میں رہتا ہوں۔

اگلے دن رمضان کی چاند رات تھی۔ خیر میں نے اپنے چار دوستوں کے ہمراہ نئے گھر میں سامان شفٹ کروانا شروع کر دیا۔ 120 گز کا گھر تھا جیسے ہی تالا کھولا تو ایک عجیب سی بو تھی کہ جیسے یہ گھر سالوں سے بند ہو۔ اس میں ایک بہت بڑا سا ہال تھا اس کے ساتھ ہی صحن تھا صحن کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ۔ اوپر جانے کی سیڑھیاں اور سیڑھیوں کے ساتھ ہی اٹیچڈ باتھ اور کچن تھا۔ گراؤنڈ فلور میں، میں نے تمام سامان دوستوں کی مدد سے سیٹ کروا دیا فرسٹ فلور پر کمرہ تھا جو کہ لاک تھا اور اس کی چابی ابا کے پاس تھی۔ فرسٹ فلور کے اوپر کشادہ سی چھت تھی جس پر ہم نے مل کر واشنگ مشین رکھ دی اور گراؤنڈ فلور میں تمام سامان اچھی طرح سجا دیا تھا تا کہ اماں اور بہنوں کو پریشانی نہ ہو۔

سامان سیٹ کرتے کرتے رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ دوستوں نے مجھ سے اجازت لی اور چلے گئے۔ اب رات میں مجھے اکیلے ہی رکنا تھا پھر صبح پہلی سحری بھی تھی اور میں بری طرح سے تھک چکا تھا۔

میں ہال میں ہی بڑے صوفے پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے تھکن کی وجہ سے نیند آ گئی۔ میں گہری نیند میں تھا کہ صحن میں بنے واٹر ٹینک میں پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے جا کر دیکھا تو واٹر ٹینک میں پانی گر رہا تھا مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی میں نے ہاتھوں سے ہی پانی پینے کی کوشش کی۔

اور جیسے ہی میں نے ٹینک سے پانی ہاتھ میں بھرا اور منہ تک لے جانے ہی لگا تھا کہ مجھے کسی نے کہا۔

”شش...... شش۔“ میں نے نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ پھر سے میں نے پانی پینے کی کوشش کی تو پھر مجھے آواز آئی۔

”شش...... شش......“ میں نے پھر سے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نہ تھا پھر میں نے پانی پینے کے لئے ہاتھوں کو منہ سے لگایا پھر کسی نے۔

”شش...... شش۔“ کم و بیش چار مرتبہ ایسا ہوا اور میں پانی نہیں پی سکا۔ ایک عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی مجھے۔

میں نے اٹھ کر واٹر ٹینکر کا ڈھکن بند کر کے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اوپر سے پہلے بلب کی روشنی مزید وحشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس وقت سیور اور ایل ای ڈی لائٹس تو ہوتی نہیں تھیں اور پورے گھر میں ایک ہی بلب لگا تھا وہ بھی بس ہال میں چاروں طرف اندھیرا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں صوفے پر آ کر پھر سے لیٹ گیا تو مجھے چھت پر سے برتن گرنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر لگا کہ سیڑھیوں سے کسی نے برتن زور سے پھینکے ہیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔

اب ان تمام واقعات کی وجہ سے میں مکمل طور پر چاک و چوبند ہو چکا تھا کہ چھت پر سے مجھے دو آدمیوں کی

باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں میں اٹھ کر چھت پر دیکھنے لگا ان دو آدمیوں کی آواز اب بند ہو چکی تھی میں اندر ہال میں گیا تو پھر سے ان دو آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں میں پھر جا کر دیکھنے لگا تو آوازیں بند۔ اسی طرح تین سے چار بار ہوا۔ میں جب آواز کے تعاقب میں باہر جا کر کھڑا ہوتا تو آواز آنا بند ہو جائے جب اندر آؤں تو باتوں کی مستقل آوازیں آتیں۔

عجیب ماجرا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا بہر حال میں پھر اٹھا۔ گھر کا مین دروازہ بند کر کے اپنی بائیک پر سابقہ گھر میں آ گیا۔ جہاں پہلی سحری کی خوب ذوق و شوق سے تیاری کی جا رہی تھی میں نے غسل کر کے سحری کی اور پھر نماز پڑھ کر سو گیا۔

روزہ افطار کے بعد ہمیں سی سینٹر والے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ ہم سب وہاں آ گئے اماں اور بہنیں اسماء اور عظمیٰ کچن سمیٹ کر کھانا بنانے کا انتظام کرنے لگیں اور مجھ سے چھوٹا بھائی جمال بھی میرے ساتھ مل کر چھت پر کچھ سامان رکھوانے لگا۔ ابا تو صحن کے ساتھ والا کمرہ لے چکے تھے کہ میں وہاں اکیلا رہوں گا اماں اور دونوں بہنیں ہال میں ہی رہنے کا کہہ چکی تھیں تو میں نے ان سے کہا۔

”ابا فرسٹ فلور اب تک لاک ہے اس کی چابی دیں تاکہ میں اور جمال وہاں کی صفائی کر کے اپنے رہنے کا بندوبست کر سکیں۔“

میری بات سن کر ابا بولے۔ ”چلو لاک میں کھول دیتا ہوں۔“

ابا کی بات سن کر میں اور جمال دونوں ابا کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگے ابا نے فرسٹ فلور کے کمرے کا لاک کھولا تو وہاں خون کے نشان تھے اور خون جما ہوا تھا خون کی بو بھی بہت تھی کہ سانس لینا محال ہو گیا تھا میں اور جمال بو کی وجہ سے ناک پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگے اور روم سے باہر نکل گئے ابا نے چابی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”بس کرو کھانستا۔ جا کر دونوں مل کر فرش دھولو اچھی طرح سے۔ یہاں ایک جانور مر گیا تھا یہ اسی کا خون اور بدبو ہے بس اب صاف صفائی کر کے اپنے رہنے کا بندوبست کرو۔“

ابا کے سامنے کبھی کسی نے کچھ بولا ہے جو ہم آج بولتے۔ میں اور جمال دونوں ہی فرش دھو کر اپنا روم سیٹ کرنے میں لگ گئے، اسی کام میں سحری کا وقت بھی ہو گیا تھا میں اور جمال نیچے آ کر سحری کرنے میں مصروف ہو گئے، سحری اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کی تھوڑا آرام کرنے کے بعد ہم سب اپنے اپنے مشاغل میں لگ گئے میں اس وقت یونیورسٹی کا طالب علم تھا اپنی پڑھائی میں مگن تھا ابا بھی اپنی جاب پر چلے گئے۔

دن بھر تو اماں اور بہنیں کام اور آرام میں مصروف رہیں، افطار کے بعد جب رات کا کھانا کھا کر ہم سب سو چکے تھے اپنے اپنے پورشن اور کمروں میں کہ اماں کو ایسا لگا کہ میں نے آ خران کا انگوٹھا پکڑ کر انہیں گھسیٹا ہے، وہ بری طرح چیخنے لگیں تو میں اور جمال اوپر سے نیچے آ گئے ابا بھی اپنے کمرے سے آ گئے اسما اور عظمیٰ بھی بہت خوف زدہ سی تھیں اماں کے چیخنے پر۔ اماں نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

”میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر تم نے مجھے اتنی زور سے گھسیٹا کہ میں اپنی جگہ سے گر کر یہاں آ گئی۔ تم نے ایسا کیوں کیا بلال۔“

اماں کی بات سن کر میں جمال کو دیکھنے لگا اور جمال مجھے، کیونکہ ہم دونوں ایک ساتھ ہی نیچے آئے تھے وہ بھی اماں کی آواز سن کر، میں نے کہا۔

”اماں میں تو ابھی اوپر اپنے کمرے سے آ رہا ہوں آپ کی آواز سن کر۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا۔ لگتا ہے آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے۔“

اماں میری بات پر غصہ سے کہنے لگیں۔

”میں نے خواب نہیں دیکھا جو کہہ رہی ہوں سچ ہے وہ۔“

ابا فوراً اپنی گرجدار آواز میں بولے۔

”آسیہ بیگم یہ تمہارا وہم ہے چلو سو جاؤ اب۔ سحری کا وقت بھی ہونے والا ہے کچھ دیر آرام کر لو۔“

ابا کی بات سن کر ہم سب اپنے اپنے کمروں میں آ گئے پھر سونہ سکے کچھ دیر بعد سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ روز کے معمول کے مطابق اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

افطار کے بعد رات کا کھانا سوچا کہ کھلی فضاء میں کیوں نہ کھایا جائے یعنی چھت پر۔ تو ہم سب کھانے کا سامان چھت پر لے گئے۔ اماں ہائپر ٹینشن کی مریض ہیں تو کھلی فضاء میں رہنا انہیں اچھا لگتا ہے۔

کھانا وغیرہ کھا کر ہم سب کچھ نہ کچھ سامان لے کر نیچے آ گئے باقی کے برتن اٹھانے کے لئے چھوٹی بہن اکیلی چھت پر گئی تو اس نے زور زور سے چیخنا شروع کردیا اس کی آواز پر ہم سب بھاگتے ہوئے چھت پر گئے تو عظمیٰ خوف کے مارے بہت زور زور سے کانپ اور چیخ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر عظمیٰ سے پوچھا۔

”کیا ہوا عظمیٰ اس طرح چیخ کیوں رہی ہو کیا ہوا......؟“

مجھے زور سے پکڑ کر وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

”بھائی یہاں کوئی خوف ناک سی چیز تھی جسے دیکھ کر میں بہت ڈر گئی اور وہ غائب ہو گئی۔“

ابا اور میں نے اسے اس کا وہم بتا کر اسے نیچے لے گئے اگلے دن اسماء کچن میں کھانا بنا رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اسے زور سے نوچا تو وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی مگر وہاں کوئی نہ تھا اس کے بازو میں درد ہو رہا تھا نوچنے کے باعث وہ ڈر گئی اس نے اماں اور عظمیٰ کو بتایا تو اماں اور عظمیٰ بھی گھبرا گئیں کیونکہ رات میں برتن گرنے کی آوازیں آنا اور چھت پر باتیں کرنے کی بہت آوازیں آتی تھیں۔

کوئی تھپڑ مار کر چلا جاتا۔ کوئی نوچ کر چلا جاتا۔ دیکھنے پر کوئی نظر نہ آتا۔

ہمیں اس گھر میں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اماں اسما عظمیٰ تینوں بری طرح خوف زدہ ہو چکی تھیں ابا تو ڈانٹ کر سب کا وہم بتا کر چپ کروا دیا کرتے تھے ان سے بات کرنا ہی فضول ہوتا تھا۔ میں نے بھی ان سب باتوں کو وہم کے طور پر ہی لیا تھا جمال بھی ان تمام باتوں پر سنجیدہ نہ تھا جبکہ برتنوں کے گرنے اور چھت پر باتیں کرنے کی آوازیں ہم بھی سنتے تھے۔

بریانی ہم سب بہت شوق سے کھاتے ہیں میں نے فرمائش کردی کہ آج افطار میں بریانی بنالو، میں کھجور کھا کر شربت پی کر نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور سوچا کہ آج بریانی سیر ہو کر کھاؤں گا۔ میں نے کہا۔

”اسماء تم میرے لئے کھانا نکال کر میرے کمرے میں رکھ آؤ۔ میں بس ابھی اوپر آتا ہوں۔“

اسما نے ایک پلیٹ میں بریانی نکال کر اوپر کمرے میں رکھ دی۔ میں جیسے ہی اپنے کمرے میں گیا تو بریانی غائب ہو چکی تھی پلیٹ سے، میں خالی پلیٹ لے کر نیچے آیا اور اسما سے کہنے لگا۔

”اس خالی پلیٹ کا میں کیا کروں جب تم اوپر ہی کھا کر آ گئیں تو میرے لئے دوسری پلیٹ میں نکال کر رکھ دیتیں۔“

میری بات سن کر اسماء کہنے لگی۔

”بھائی میں ابھی ابھی تو پلیٹ بھر کر بریانی اوپر آپ کے کمرے میں رکھ کر آئی ہوں۔ بھلا میں ایسا کیوں کروں گی۔“

اس کی بات پر میں نے کہا۔

”تو بریانی کہاں غائب ہو گئی مجھے اب پھر سے نکال کر دو۔“

”اسما جیسے ہی کچن میں بریانی لینے گئی تو بریانی کا بھگونا ہی غائب تھا۔ ہم نے پورا گھر ڈھونڈ لیا مگر بریانی کا بھگونا کہیں نہیں ملا۔ چھت پر برتن گرنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کر وہاں گیا تو بریانی کا خالی بھگونا پڑا تھا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

کیونکہ ہم سینٹر کے علاقے میں نئے تھے محلے والوں سے اتنے تعلقات ابھی نہ تھے ہمارا گھر سینٹر کا تھا۔ دونوں طرف پڑوس میں گھر تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ دن کے وقت تو وہ لوگ اپنی اپنی چھتوں پر آ جاتے تھے مگر رات کے وقت اس پوری گلی کے لوگوں کو میں نے

ان کے ہی گھروں کی چھتوں پر انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس ہم لوگ ہی اپنے گھر کی چھت پر جایا کرتے تھے۔

ایک دن میں اپنے دوستوں سے مل کر واپس گھر آرہا تھا کہ اپنے پڑوسی انکل کو باہر دیکھا تو انہیں سلام کرکے ہاتھ ملایا پھر اپنا تعارف کروایا۔

''میرا نام بلال ہے ہم آپ کے پڑوس میں ڈیڑھ ہفتے پہلے ہی شفٹ ہوئے ہیں ابھی تو ہم سب اپنی اپنی اسٹڈی میں مصروف رہتے ہیں پھر رمضان میں وقت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پھر شفٹنگ میں بھی مصروف رہے تو آس پڑوس میں ملنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ آپ یہاں کب سے ہیں۔''

میری بات سن کر انکل کہنے لگے۔

''پندرہ سولہ سال سے ہم یہاں ہیں۔ بیٹا آپ لوگوں نے یہ گھر کیوں خرید لیا۔''

انکل کی بات سن کر میں چونکا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں انکل آپ کی بات۔''

انکل بولے۔ ''بیٹا بلال یہ گھر تقریباً سولہ سترہ سال سے بند ہے۔ اس گھر میں آج تک کوئی نہیں رہا۔ جب سے ہم یہاں اس علاقے میں آئے ہیں اس گھر کو بند ہی دیکھا ہے۔

یہ گھر آسیب زدہ ہے یہاں تو آسیب کا بسیرا ہے۔ یہاں ایک لڑکی کا قتل ہوا تھا تو اس کے بعد اس گھر میں جو تالا لگا ہے نا اب آپ لوگوں کے آنے سے ہی کھلا ہے۔ رات اس گھر سے چیخنے چلانے اور قہقہوں کی آوازیں پورے محلے میں گونجتی ہیں۔ برتنوں کے گرنے کی آوازیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔''

رات مغرب کے بعد اس گلی میں کوئی بھی اپنے گھروں کی چھتوں پر نہیں جاتا۔ کیونکہ اس گھر کی چھت پر نادیدہ مخلوق نظر آتی ہے جو سب کو ڈراتی ہے اور منع کرتی ہے کہ رات میں چھت پر کوئی نہ آئے، بیٹا ہم تو مغرب کے بعد اپنی چھتوں پر بھی نہیں جاتے۔ آپ کیسے رہ رہے ہو۔ بیٹا میری بات مانو تو جلدی سے اس گھر کو خالی کردو۔ اس گھر میں جن نادیدہ چیزوں کا بسیرا ہے نا وہ آپ لوگوں کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہیں بہت کچھ ہوا ہے رات مغرب کے بعد اس محلے کے لوگوں کے ساتھ چھتوں پر جانے سے۔''

انکل کی بات سن کر میں کچھ پریشان سا ہوگیا پھر میں نے وہاں کے آس پڑوس کے سب ہی لوگوں سے تحقیق کرنا شروع کردی اس گھر کے بارے میں سب نے تقریباً وہی باتیں بتائیں تھیں جو کہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے خورشید انکل نے بتائی تھیں۔

مزید معلومات کرنے پر مجھے پتا چلا کہ سترہ سال پہلے اس گھر میں کلثوم نامی لڑکی کا قتل ہوا تھا، کلثوم کے والدین کا اسلام آباد میں ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا۔ کلثوم اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی کافی جائیداد کی اکلوتی وارث تھی اس نے کسی لڑکے سے شادی کرلی اور وہ کراچی شاہ فیصل کے علاقے سی سینٹر میں سیٹل ہوگئی تھی اس کے شوہر نے جائیداد کی لالچ میں فرسٹ فلور کے کمرے میں اس کا گلا کاٹ کر اسے قتل کردیا تھا وہ چیختی رہی چلاتی رہی مگر اس کے شوہر پر تو لالچ کا بھوت سوار تھا۔ وہ یہ گھر کسی طرح بیچ کر کلثوم کی ساری جائیداد لے کر کراچی سے چلا گیا۔ جس نے یہ گھر خریدا وہ خون دیکھ کر گھر کو تالا لگا کر چلے گئے۔ کوئی اس گھر میں نہیں رہا۔

سترہ سال سے یہ گھر بند ہے۔ اتنے سالوں بند رہنے اور قتل ہونے کی وجہ سے یہ گھر آسیب کا بسیرا بن گیا ہے آس پڑوس کے لوگ مغرب کے بعد اپنے گھروں کی چھتوں پر جانے سے بھی گریز کرتے ہیں کیونکہ جب بھی کوئی چھت پر جاتا ہے تو وہ مخلوق نظر آ کر بھیانک روپ میں ڈراتی ہے۔''

یہ ساری انفارمیشن جاننے کے بعد میں ابا کے کمرے میں ان سے بات کرنے گیا اور انہیں سب کچھ بتایا تو ابا کہنے لگے۔

''مجھے یہ سب کچھ پہلے سے پتا ہے تم پریشان نہ ہو اور اس بات کا ذکر اپنی ماں اور بہنوں سے مت کرنا ورنہ وہ ڈر جائیں گی۔''

ابا کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا تو میں نے کہا۔

''ابا جب آپ کو سب کچھ پتا تھا تو آپ نے یہ

گھر خریدا ہی کیوں۔ اگر اس مخلوق نے کسی کو نقصان پہنچادیا تو۔"

میری بات سن کر ابا غصہ کرتے ہوئے بولے۔

"بس کرو بلال اس طرح کی باتیں۔ اللہ نے انسان کو زیادہ طاقتور بنایا ہے اچھا بس اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی یاد رہے اماں اور بہنوں سے مت کرنا یہ بات۔"

ابا کی بات سن کر میں غصے میں اپنے روم میں آ گیا اب تو یہ روز کا معمول تھا کہ کھانا بنا کر رکھو پورا کا پورا کھانا برتن سمیت غائب، کوئی تھپڑ مار کر جاتا تو کوئی نوچ کر چلا جاتا اور جب دیکھو تو کوئی نظر نہ آتا۔

خیر ایک رات میں چھت پر اکیلا ہی تکیہ چادر لے کر سونے چلا گیا۔ رات میں، میں نے چادر بچھائی تکیہ لگایا اور لیٹ گیا۔ کھلی فضا کھلا آسمان اس پر سجے چاند ستارے اور چاند کی روشنی بہت دلکش لگ رہی تھی اوپر سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، میں بہت لطف اندوز ہو رہا تھا کہ میری نظر پڑوس کے گھر کی چھت پر پڑی جو ہماری چھت سے ذرا اونچی تھی ان کی چھت پر ایک ساڑھی پہنے ہوئے عورت مجھے مستقل دیکھ رہی تھی میری نظر جب اس پر پڑی تو میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو اس نے اپنی بھنوئیں اچکا کر اشارہ کیا کہ "کیا ہے۔"

میں بس اس کو ہی دیکھ رہا تھا کہ تین بار انہوں نے اپنی بھنوئیں اچکائیں تو میں نے پہچان لیا کہ یہ خورشید انکل کی والدہ ہیں اور وہ مستقل مجھے دیکھ رہی ہیں تو میں نے انہیں مسکرا کر سلام کیا۔

"السلام وعلیکم۔" میرا سلام سنتے ہی ان کے بال ایک دم بکھرنے لگے چہرہ بھی بگڑنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھیانک چڑیل کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

پھر میرے ذہن نے کام کیا کہ یہ ساڑھی والی خاتون خورشید انکل کی والدہ کیسے ہو سکتی ہیں وہ تو مر چکی ہیں وہ مجھے مستقل گھور رہی تھیں ان کا چہرہ انتہائی بدصورت اور خوف ناک ہو چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے خوف محسوس ہوا تھا میں پسینے میں نہا چکا تھا میرے دل کی دھڑکنیں انتہائی تیز ہو چکی تھیں میں نے اپنی تمام تر ہمت کو یکجا کر کے درود شریف پڑھنے لگا اور بھاگتا ہوا نیچے آ گیا۔

اس رات میری حالت نہ پوچھو کیسی تھی، جب میں نے ابا سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔

"اب مغرب کے بعد چھت پر نہ جانا۔"

ابا کی بات سن تو لی میں نے اور خاموش بھی ہو گیا مگر میں نے مغرب کے بعد چھت پر جانا نہیں چھوڑا، میں اکثر گرمی کی وجہ سے چھت پر جاتا مجھے وہ نادیدہ قوتیں مختلف انداز میں ڈراتیں، میں ہمت کرتا اور ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کرتا جب ڈر حد سے زیادہ محسوس ہوتا تو نیچے آ جایا کرتا تھا مگر میں نے اپنی ہمت کو آزمانا نہ چھوڑا۔

اسی طرح آسیب زدہ گھر میں رہتے ہوئے بڑی مشکل سے ہمیں ڈھائی سال کا عرصہ گزر گیا۔ ہمیں ہر طرح سے ڈرایا جاتا۔ مختلف حربے آزمائے جاتے اس ڈھائی سال کے عرصے میں ابا کو بھی ان نادیدہ قوتوں کی طرف سے دھمکیاں ملتی رہیں کہ یہ گھر ہمارا ہے یہاں ہمارا پورا خاندان آباد ہے۔ یہاں ہمارا بسیرا ہے تم اپنے خاندان کو لے کر جاؤ ورنہ تم میں سے کسی ایک کی جان لے لیں گے اگر جان پیاری ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر پھر بھی تم یہاں سے نا گئے تو ہم سب کو مار ڈالیں گے۔"

اس طرح کے واقعات ابا کے ساتھ بھی پیش آ رہے تھے مگر ابا ایک اسٹرانگ آدمی تھے نمازی عبادت گزار اور تہجد گزار تھے ان مخلوق سے روبرو باتیں کرتے رہتے تھے۔

ایک دن اماں باتھ روم گئیں تو ان کو کسی نے زور سے دھکا دیا اور وہ گر گئیں بہنوں نے جا کر اماں کو اٹھایا ہم انہیں اسپتال لے کر گئے اماں کی ٹانگ فریکچر ہو چکی تھی ان نادیدہ قوتوں کی طرف سے ملنے والی دھمکی پر ابا نے سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے ایک نیا گھر ڈھونڈا اور اس گھر کو ہم نے کم قیمت میں ہی فروخت کر دیا۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ نئے گھر میں کوئی واقعات پیش نہیں آئے۔



سایہ

طارق محمود۔کامرہ اٹک

رات کے ایک بجتے ہی ایک سایہ کوٹھی کی بڑی دیوار سے برآمد ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ کمرے کی دیوار سے گزرگیا اور دیکھنے والے اچنبھے میں انگشت بدنداں رہ گئے۔

ایک روح کی چاہت خلوص اوروالہانہ پیار کی کہانی جوکہ پڑھنے والوں کودنگ کردے گی

زندگی اچھی گزررہی تھی لیکن کچھ خشک اور بے رنگ سی تھی والدین فوت ہوگئے تھے لیکن میرے لئے دومکان اور چاردکانیں جوکہ کرایہ پر چڑھی تھیں، ان کا معقول کرایہ آرہا تھا اس کے علاوہ میرے لئے ایک تین کمروں کا پیارا سا گھر جس میں، میری رہائش ہے مکان اوردکانوں کا کرایہ اتنا آجاتا ہے کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اپنی دکانوں کے سامنے بنے تھڑے پر دن چڑھے اٹھ کر بیٹھتا ہوں اور وہاں سے گزرنے والی لڑکیوں اورخوب صورت گاڑیوں کومحبت سے دیکھتا رہا، کبھی کبھی گھومنے کے لئے بھی نکل جاتا میں نے اپنی پڑھائی پر کچھ زیادہ ہی توجہ دی تھی۔ اسی لئے دوست یار بنانے کی ضرورت ہی نہ ملی۔ جب بھی گھومنے کا من چاہا تو اکیلا ہی نکل کھڑا ہوتا ہوں اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی زندگی میں کسی چیز کی کمی سی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک دن چچا منظور جو کہ میرے کرایہ دار تھے نے مجھے کہا۔ "علی بیٹا کب تک یوں اکیلے رہو گے...... شادی کرلو۔" ان کی بات سن کر میرا دل زور سے دھڑکا اور میں اچھل پڑا بات سامنے کی تھی لیکن...... اس دن سے میں جب بھی کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتا تو من میں کھد بد سی ہونے لگتی۔ لیکن یہ کھد بد اس لڑکی کے سامنے سے ہٹتے ہی ختم ہوجاتی اور میں جو پینے بننے کی تیاری کر ہی رہا ہوتا تھا کہ اچانک واپس اپنی پوزیشن پر آجاتا۔ "اور پھر سوچا شادی کے بارے میں۔" چچا منظور نے پھر ایک دن پوچھا۔ "چچا شادی کرتو لوں لیکن کوئی لڑکی نظر میں جچے تو سہی" میں نے دل پر ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا۔ تو چچا مسکرانے لگے۔

"وہ ایک چھوٹی سی ڈنر پارٹی تھی جو کہ میرے ایک رشتہ کے ماموں کی شاندار کوٹھی میں تھی۔ جس میں مجھے بھی انوائٹ کیا گیا تھا میں ایسی محفلوں میں کم ہی جاتا ہوں لیکن یہاں ایک تو بات رشتہ داری کی تھی اور دوسرا میرے تعلق دار اور اپنے مجھے مغرور سا سمجھتے تھے۔ اسی لئے میں نے یہ پارٹی اٹینڈ کی۔

پارٹی بور سی تھی میں بھی لئے دیئے والا بندہ تھا اور میرے ماموں اور ان کی فیملی بھی رشتہ داروں سے زیادہ میل ملاپ رکھنے والے نہ تھے۔ اسی لئے میں ان کے گھر بنے چڑیا گھر اور پھر ایکوریم میں رنگ برنگی مچھلیوں سے دل بہلاتا رہا۔

کھانا ابھی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ میں دس بجے وہاں پہنچا تھا۔ اور بارہ بجنے والے تھے، ایک ویٹر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس پارٹی کا کوئی مہمان خصوصی بھی ہے اور جب مہمان خصوصی محفل میں آیا تو سب کی نظریں اس طرف لگ گئیں میں بھی اس شخصیت کو دیکھتے ہی چڑیا گھر سے نکل کر کوٹھی کے اندر سجی محفل میں آگیا جہاں ہر جوان اور بڑی عمر کا مرد اس شخصیت کے ارد گرد نظر آرہے تھے، ہلکے مہرون کلر کے کپڑوں پر سفید پھولوں والی چادر اوڑھے چہرہ پہ میک اپ کے نام پر ہلکی سی لپ اسٹک اور ہاتھ میں ٹچ موبائل اس کے تھوڑا ہی پیچھے کالی چست پینٹ شرٹ میں ملبوس دو نوجوان جو کہ اس شخصیت کے یقیناً باڈی گارڈ تھے۔

"او بھائی...... یہ لیڈی کون ہے۔" ایک ویٹر سے پوچھا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"کون سے شہر سے آئے ہو! مس شاہینہ کو نہیں جانتے۔"

"او" میرے منہ سے نکلا اور وہ ویٹر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مس شاہینہ کے آتے ہی اس محفل میں جان سی پڑ گئی کہیں سے پیانو کی مدھم دھن بجنے لگی جو کہ اس ماحول میں فسوں سا جگانے لگی۔ میں مس شاہینہ کے نزدیک تو نہیں گیا لیکن ایک کونے پر بیٹھا، وہ جدھر جاتی میری نظریں اس کا تعاقب کرتیں، اس کی عمر تیس سے کچھ زیادہ ہی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی والد والدہ دونوں حیات تھے اور جاگیردار تھے نجانے کتنے ہی رشتے آئے لیکن مس شاہینہ نے کچھ نہ کچھ بہانہ کرکے ان سے شادی سے انکار کردیتی۔ یہ سب معلومات مجھے اسی محفل میں گھومتے پھرتے مل گئی میری عمر پچیس سال تھی لیکن میں نے سامنے لگے ایک شیشہ میں اپنے آپ کو دیکھا اور ساتھ ہی تصور میں مس شاہینہ کو کھڑے دیکھا تو مجھے یہ جوڑی بہت ہی اچھی لگی۔

ادھر ادھر لوگوں کے درمیان گھومتے ہر کسی کو ہنس کر ملتے ہوئے مس شاہینہ نے دو تین بار مجھے دیکھا میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی لیکن اس کا چہرہ کسی تاثر سے عاری تھا۔ میرے رشتہ کے ماموں اس کے سامنے جیسے بچھے بچھے جاتے تھے اس پارٹی میں چند سیاسی لوگ بھی تھے جن سے مس شاہینہ کچھ زیادہ دیر تک باتیں کرتی رہی اور پھر ڈنر کا وقت ہوتے ہی ڈنر شروع ہوگیا۔

مس شاہینہ کو دیکھنے کے بعد کھد بدی میرے دل میں ہوئی تھی وہ اس کے جانے کے بعد ختم نہ ہوئی بلکہ وہ اتنا بڑھی کہ مجھے کسی پل چین نہ تھا دو دن بہت ہی بے تابی میں گزرے آخر اس کا دیدار کرنے کی ہمت باندھی اور اس کے محل کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ایک

درخت کے نیچے جا بیٹھا پورا دن وہاں بیٹھا بے چینی سے محل اور اس کے گیٹ کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید وہ نکلے اور اس کو دیکھ کر دل کی کھد بد کو کچھ سکون ملے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ ہی کچھ پینے کا، آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور محل کا بڑا سا گیٹ کھلنے لگا پھر سفید رنگ کی بڑی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر آنکھوں پر سن گلاسز لگائے مس شاہینہ تمکنت سے براجمان نظر آئی۔ اسے دیکھ کر دل کی حرکت پہلے سے تیز چلنے لگی۔ گاڑی میرے سامنے سے گزر گئی اس نے ہلکا سا بھی ادھر ادھر نہ دیکھا میں نے اسے چند ساعت نظر بھر کر دیکھا لیکن اس سے سکون نہ ملا بلکہ دل کرنے لگا اور دیکھوں اور دیکھوں پر مجھے وہاں سے اٹھنا ہی پڑا کیونکہ وہ علاقہ امیر لوگوں کا تھا۔ صنعت کار، مل آنرز اور جاگیردار اسی لئے وہاں سے خراماں خراماں چلتے ہوئے اپنے محلے کے ایک ہوٹل میں چائے پی اور پھر گھر کی راہ لی۔ بے سکونی، بے چینی اور میں، دوسرے دن صبح ہی صبح میں پھر اس محل کے سامنے کھڑا ہونے کے لئے چل پڑا۔ اپنے خیالوں میں مس شاہینہ کے خیالوں میں کھویا چپ چاپ سر نہوڑائے چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا میں نے چونک کر سر گھما کر دیکھا سامنے چچا منظور حیرانگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔

”میاں علی...... کہاں گم صم جا رہے ہو میں نے دو تین دفعہ آپ کو پکارا لیکن آپ تو سن کے ہی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔“

”نہیں چچا کچھ نہیں کوئی گڑ بڑ نہیں۔ ذرا ایک کام سے جا رہا تھا۔ اسی کام کے بارے میں تانے بانے بن رہا تھا۔“ میں نے بائیں ہاتھ سے گردن کھجاتے ہوئے جواب دیا تو چچا منظور مسکرانے لگے۔

”چلو میاں اچھی بات ہے تمہیں بھی کوئی کام تو سوجھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے ان سے اجازت لی اور پھر ایسے ہی چلتے چلتے نیشنل بینک کے سامنے سے ہوتا ہوا مس شاہینہ کے علاقہ کی طرف مڑا ہی تھا کہ میری نظر مس شاہینہ کے ایک باڈی گارڈ پر پڑی جو کہ بینک کے باہر اٹینشن کھڑا تھا میں ٹھٹک کر رک گیا میری نظریں پارکنگ میں پھرنے لگیں اور پھر میں نے مس شاہینہ کی گاڑی پارکنگ میں ایک طرف کھڑی دیکھ لی اب میں باہر ایک بنچ پر بیٹھا اس کے بینک سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ بلیو کلر کپڑوں میں سر پر سفید دوپٹہ کئے بینک سے نکلتی نظر آئی۔ اس کے پیچھے ہی ایک آدمی نکلا جو کہ مجھے کچھ مشکوک سا لگا۔ بینک کی سیڑھیاں اترتے ہی اس نے موبائل نکالا اور میسج ٹائپ کرنے لگا۔ شاید اس نے میسج سینڈ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے مس شاہینہ کی طرف ایک نظر دیکھ کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا لیکن مس شاہینہ اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ چلتے ہوئے میرے سامنے سے گزر کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ آج بھی اس نے ادھر ادھر نہ دیکھا بلکہ نیچے دیکھتے ہوئے ہی گزر گئی۔ اس کی گاڑی پارکنگ سے نکلی ہی تھی کہ ایک موٹر سائیکل سوار اسپیڈ سے پارکنگ میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ وہ سیدھا گاڑی کے ساتھ جا ٹکرایا، موٹر سائیکل سوار ہوا میں اڑ کر پارکنگ کے ساتھ بنے پلاٹ میں لگے ایک فوارہ کے پانی میں جا گرا۔ گاڑی ادھر ہی رک گئی تھی۔

مس شاہینہ اور اس کا باڈی گارڈ گاڑی سے نکل آئے۔ شاید وہ موٹر سائیکل سوار کو دیکھنا چاہتے تھے۔ میں بھی آہستہ سے بھاگ کر ادھر پہنچا۔ میں نے ان سے پہلے موٹر سائیکل سوار تک پہنچ کر اسے پانی میں سے نکالا زیادہ چوٹ لگنے سے اس کی بچت ہو گئی میں اسے نکال کر پلاٹ کے گھاس پر لایا ہی تھا کہ میری نظر سڑک پر آتے ہوئے ایک بلیک کلر کی موٹر سائیکل پر پڑی جس پر دو نقاب پوش بیٹھے تھے۔ پچھلے کے ہاتھ میں مجھے پستول کی جھلک نظر آئی۔ ان دونوں کی آنکھیں مس شاہینہ پر مرتکز تھیں۔ موٹر سائیکل کے ٹاپے پر لکھا تھا۔ ”چیف آف ڈیتھ۔“ میں نے اس زخمی موٹر سائیکل والے کو تیزی سے پلاٹ کے گھاس پر ڈالا تو میرے ذہن میں بازگشت ہونے لگی کہ ”مس شاہینہ کو بچاؤ“ پھر میں نے ایک جمپ لیا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس کے

سامنے آ گیا اسی وقت تڑتڑا گولیاں چلیں مجھے دائیں کندھے اور پیٹ میں گرم سلاخیں گھستی محسوس ہوئیں میں زور سے زمین پر گرا سر زمین سے ٹکراتے ہی ایک اور درد کی لہر اٹھی اور میرا دماغ جیسے سن ہو گیا۔

ہوش آیا تو ایک نرم سے بستر پر لیٹا تھا۔ دائیں بازو پر ڈرپ لگی تھی۔ بڑا سا کمرہ تھا پاس ہی ایک نرس کھڑی دیوار کی طرف کچھ دیکھ رہی تھی۔ یہ اتنا بڑا کمرہ یقیناً کسی اسپتال کا نہ تھا میں اٹھ کر بیٹھا تو سر چکرانے لگا۔ میں پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا کندھے اور پیٹ پر گھٹن سی تھی نرس نے محسوس کر لیا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں اس لئے وہ پلٹ کر میرے پاس آ گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ بند آنکھوں سے بھی اس کا ہیولہ مجھے نظر آ رہا تھا۔ اسے اپنے اوپر جھکے ہوئے محسوس کرتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے میری طبیعت کے بارے میں دو تین باتیں پوچھیں میں کچھ سوچ کر سر ہلا کر اطمینان کا اظہار کیا وہ سر ہاں میں ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی اس کے جانے کے چند منٹ بعد اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور باڈی بلڈر ٹائپ آدمی جو کہ بڑی عمر کا تھا۔ ہینڈسم سا بہترین تراش خراش والا سوٹ پہنے اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے آہستہ سے سلام کا جواب دیا۔

”اب کیسا محسوس کر رہے ہو۔“

”ٹھیک۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر میرے اوپر جھک گیا۔ اس نے پٹی اتار کر کندھے اور پیٹ کے زخم دیکھے۔ ”ابھی کچھ دن تک تم...... چل پھر نہیں سکتے۔“ ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا تو وہ نئی پٹی لگانے لگی۔

”لیکن میں ہوں کہاں۔“

”تم اپنوں میں ہو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس ہینڈسم آدمی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اس کا باپ ہوں جس کی تم نے اپنی جان پر کھیل کر جان بچائی ہے۔“ اس کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی نرس زیادہ تر میرے کمرہ میں ہی رہتی تھی اور ڈاکٹر دو چکر لگاتا تھا صبح اور شام، لیکن مس شاہینہ مجھے نظر نہ آ رہی تھی میں خود حیران تھا کہ جس کی میں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جان بچائی وہ تو شکریہ ادا کرنے تک نہ آئی میں یہ ہی سوچ رہا تھا کہ وہ کمرے کے دروازہ کو ناک کرتی اندر آئی میں اسے دیکھ کر آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا لیکن اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اٹھنے سے روک دیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی پھر باتوں باتوں میں اس نے بہت ہی اچھے انداز سے میری طبیعت کا پوچھا۔ میرا شکریہ ادا کیا۔ میں خود میں پھولے نہ سما رہا تھا۔

”آپ کو کیسے احساس ہوا کہ وہ موٹر سائیکل سوار مجھ پر فائر کرنے لگے ہیں۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں جب زخمی موٹر سائیکل والے کو پانی سے اٹھا کر باہر لایا تھا تو مجھے سامنے سے آتے ہوئے وہ مشکوک موٹر سائیکل والے نظر آئے...... مشکوک اس لئے کہ ان کے چہرہ نقاب سے ڈھکے تھے اور پچھلے کے ہاتھ میں پستول تھا جو کہ تیار حالت میں تھا اور وہ دونوں آپ کی طرف دیکھ رہے تھے تو بس۔“

میں نے بات ختم کی۔ ”اچھا جی اب وہ لازمی اور بہت ہی امپورٹنٹ سوال۔“ مس شاہینہ کی بات سن کر میں چونک گیا میرے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔

”آپ نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میری جان کیوں بچائی۔“ آخر اس نے وہ سوال کر دیا جس سے میں بچ رہا تھا۔

”اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا اور ہو سکتا ہے کہ کبھی نہ بتا سکوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگی لیکن کہا کچھ نہیں تقریباً ایک ماہ تک میں نے بھرپور ریسٹ کی آخر دنوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے اس محل کے بڑے سے لان میں پھولوں کی معطر فضا میں خوب سانس لیتا، میں اس محل سے نکلنا تو جیسے بھول ہی گیا۔ میرے ذہن میں ہی نہ رہا کہ یہ میرا گھر

نہیں اور جب میں ٹھیک ہو گیا زخم بھر سے گئے تو اچانک مجھے جیسے یاد آیا کہ میرا اپنا بھی ایک گھر ہے تب میں نے سوچا کہ اب ان لوگوں کے سر سے اترنا چاہئے دل تو کہہ رہا تھا کہ ڈھیٹ بن کر مس شاہینہ کا دیدار کرتا ہی رہوں لیکن مروت بھی کچھ چیز تھی۔

اسی شام میں بصیر صاحب کے آنے کا انتظار کر رہا تھا مس شاہینہ کے والد بصیر صاحب۔ وہ شام کو میرے کمرہ میں آئے اور پاس بیٹھ کر طبیعت کے بارے میں پوچھا کیونکہ اب میں ٹھیک تھا۔ اسی لئے میں نے اسے سب اچھا ہی کہنا تھا اس کے بعد میں وہاں سے جانے کے لئے ان سے بات کرنے کے لئے مناسب الفاظ سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے خود ہی بات شروع کر دی۔

”علی...... تم اپنے آپ کو یہاں گلٹی فیل نہ کرو...... تمہیں شاید احساس نہیں کہ تم نے ہماری بیٹی کی جان بچا کر ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے...... اب میں چاہتا ہوں کہ تم شاہینہ کے۔“ انہوں نے اتنا کہہ کر کچھ سوچا میرے دل کی دھڑکن حتزلزل ہونے لگی۔ شاید شاید انہیں میرے دل کی بات پتا چل گئی ہو۔

”اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بیٹی شاہینہ کے سیکریٹری پھر ایڈوائزر بن جاؤ کیونکہ وہ اس الیکشن میں ایم پی اے کے لئے لڑ رہی ہے۔“

”اوہ“ میرے منہ سے ایک لمبے سانس کے ساتھ نکلا۔ بصیر صاحب نے مجھے کچھ حیرت سے دیکھا۔

”لگتا ہے تمہیں اس بات کو جان کر حیرت ہوئی ہے...... میں اب اس پر لمبا لیکچر تو نہیں دے سکتا لیکن بس اتنا کہوں گا کہ یہ الیکشن بہت مجبوری میں لڑنا پڑ رہا ہے اور تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ ہم نے تمہیں جانے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا...... نہیں بلکہ میں نے تمہارے زخمی ہونے کے بعد تمہارے بارے میں پوری معلومات کر لی ہیں تم پڑھے لکھے ہو لائق لڑکے ہو۔

ہاں مائنڈ نہ کرنا بس تھوڑا کام سے جی چراتے ہو۔“

ان کی یہ بات سن کر میں کسمسا کر رہ گیا اور وہ مسکرانے لگے۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ مائنڈ نہ کرنا۔“

”اٹس او کے سر۔“ میرے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ ”تم اس بارے میں خوب سوچ لو اگر تمہیں یہ آفر اچھی لگے تو تنخواہ اور رہائش وغیرہ کے بارے میں بات کر لیں گے۔“

اس کے بعد وہ مجھے آرام کرنے کا کہہ کر وہاں سے چل دیئے۔

وہ رات مجھے نیند نہ آ رہی تھی یہ نہیں کہ میں اس آفر کے بارے میں غور کر رہا تھا بلکہ یہ آفر تو میں نے بصیر صاحب کے جانے کے بعد ہی قبول کرنے کا سوچ لیا تھا۔ مجھے تو مس شاہینہ کے ساتھ ایک بہترین وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ سوچ تھی کہ وہ کون سی ایسی مجبوری تھی جس کی وجہ سے مس شاہینہ کو الیکشن میں حصہ لینے کو ضروری تھا۔

رات آدھی گزر گئی تھی کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی، میری آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں کہ اچانک مجھے لگا کہ کھڑکی کے سامنے سے کوئی سایہ لہرایا ہو جیسے آہستہ آہستہ میں نیند کی وادی میں جا رہا تھا اسی طرح آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا اور پھر کھڑکی پر جا کر باہر دیکھنے لگا میری نظریں لان میں گردش کر رہی تھیں۔

مس شاہینہ کے کمرہ کی دیوار کے باہر ہی مجھے وہ سایہ کھڑا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کھولی اور اس میں سے اتر کر باہر کود گیا۔ میرے قدم زمین پر ٹکتے ہی ہلکی سی تھپ کی آواز آئی۔ اس سایہ نے پھر بھی میری طرف پلٹ کر نہ دیکھا سیدھا ہوتے ہی میں اس کی طرف دوڑ پڑا گھاس تھا۔ اور میں ننگے پاؤں اسی لئے بھاگنے سے عجیب سی دھمک پیدا ہو رہی تھی لیکن وہ سایہ اسی طرح مس شاہینہ کی کھڑکی کے سامنے مجھ سے بے پرواہ کھڑا تھا۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر اس پہ چھلانگ لگا دی لیکن مجھے ایک حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ میں اس سایہ میں سے اڑتا ہوا گھاس پر جا گرا۔ وہ حقیقت میں سایہ ہی تھا لیکن کس کا، میں نے ادھر ادھر دیکھا مجھے وہاں کوئی آدمی نظر نہ آیا جس کا وہ سایہ ہو۔ پھر میں نے جلدی

سے اس سایہ کی طرف دیکھا جو مسلسل مس شاہینہ کی کھڑکی پہ نظریں جمائے کھڑا تھا میرے جسم سے ٹھنڈا پسینہ نکلنے لگا۔ اس سایہ کی کسی آدمی کے بغیر یہاں موجودگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے کوئی ماورائی چکر لگ رہا تھا۔

میرے دل پہ ایک ہیبت سی ڈیرہ ڈالنے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ بس ابھی سانس رک جائے گا۔ میں پیچھے کی طرف گرنے لگا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکلا۔ ''لاحول ولاقوۃ'' اور اس کے فضا میں بلند ہوتے ہی اس سایہ نے میری طرف سر گھمایا، میری زبان پہ ورد جاری رہا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ غائب ہوگیا۔ میرے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی، میں ہیبت سے پیچھے الٹ کر گر پڑا، جانے کتنی دیر میں بے سدھ سا لان کے گھاس پہ پڑا تھا۔

ادھر صبح کی آذان ہوئی اور ادھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں اس لان میں بے یقینی سے اپنے آپ کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے جو دیکھا وہ واقعی میں تھا یا کوئی خواب تھا یہ سوچتے ہوئے میں وہاں سے چلتے ہوئے کمرہ میں آ کر بیڈ پر گر سا گیا۔ وہ سایہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے لہرا سا جاتا اور پھر میں نیند کی گہری وادی میں چلا گیا۔

اور جب میں اٹھا تو دوپہر گزر رہی تھی، ملازم ناشتہ کا پتہ کرنے آیا تو میں دوپہر کا کھانا اور ساتھ میں چائے منگوالی۔ اس کے کھانا لانے تک میں فریش ہوگیا۔ کھانے کے برتن اٹھاتے وقت ملازم نے بتایا کہ بصیر صاحب صبح سے دو تین دفعہ یاد کر چکے ہیں، میرے ذہن میں فوراً رات والا واقعہ پھرنے لگا جانے وہ کیا تھا کیوں تھا کس لئے تھا ملازم جب چلا گیا تو میں بصیر صاحب اور مس شاہینہ کے بارے میں سوچنے لگا جو کہ یقیناً میرے جواب کے منتظر ہوں گے۔ مجھے تو اپنی خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن ان لوگوں کو مجھ سے بہت بہتر ایسے لوگ مل سکتے تھے جو کہ سیاست میں چلتے پھرتے پرزے تھے اور وہ ایک بہترین پیکیج پر ان کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے جبکہ مجھے سیاست کی شد بد ہی نہ تھی تو پھر یہ لوگ میرا ہی انتخاب کیوں کرنا چاہتے تھے کیا اس لئے کہ میں نے مس شاہینہ کو بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگادی تھی یا پھر ان بڑے لوگوں کو قربانی کے لئے ایک بکرے کی ضرورت تھی میں تو بکرا بھی ایسا تھا کہ جس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میرے گمشدہ یا کسی قسم کی سچویشن میں پھنسنے کے بعد ایسا کوئی نہ تھا جو کہ میرے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا یہیں پر مجھے ایک بات یاد آ گئی جس کا احساس مجھے اتنی شدت سے ہوا کہ میں بصیر صاحب سے ملتے ہی اس بارے میں پوچھ لیا کہ جب مس شاہینہ پر سرعام گولیاں چلیں جو کہ میں نے اپنے جسم پر کھائی تھیں تو لازماً پولیس کیس بھی بنا ہوگا مجھ تک پوچھ تاچھ کے لئے کوئی پولیس والا نہیں آیا اور وہ آدمی کون تھے جو کہ مس شاہینہ کو مارنا چاہتے تھے۔ میرے ان سب سوالوں کا بصیر صاحب کے پاس ایک جواب تھا وہ دونوں موٹر سائیکل سوار پولیس والوں کو موٹر سائیکل کے ساتھ ہی ایسی حالت میں ملے کہ کسی نے انہیں قتل کر کے ان کی شناخت مسخ کردی تھی اور موٹر سائیکل چوری کی تھی پولیس تفتیش کر رہی ہے جلد ہی کوئی نتیجہ سامنے آئے گا میں ان کے اس جواب پر مطمئن نہ تھا۔ لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے بصیر صاحب کو مس شاہینہ کے ایڈوائزر کے طور پر اپنی خدمات پیش کردیں۔ بصیر صاحب میرے اس فیصلے پر بڑے خوش لگ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے مس شاہینہ سے ملوایا اس نے بھی میرے اس فیصلے کو سراہا۔ بصیر صاحب ہم دونوں کو وہاں بیٹھا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ میں مس شاہینہ کے بے داغ چہرے کو غور سے دیکھ کر رات کے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا تو وہ بالکل ہشاش بشاش تھی اس کا مطلب تھا کہ ابھی اس کا اس سایہ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

''علی تمہارے ذہن میں اس بارے میں بہت سے سوالات ہوں گے کہ سیاست میں تو کتنے ہی ایڈوائزر ہوں گے کتنے ہی کل پرزے ہوں گے تو ہم نے تم کو ہی کیوں رکھا...... اس کا آسان سا ہی میرے

پاس جواب ہے کہ میں کسی پہلے سے سیاسی آدمی کو رکھنا ہی نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے فائدہ کے لئے مجھے ہر طرح کے داؤ پیچ سکھائیں گے اور چاہے میں جتنا بھی بچوں ان کے داؤ پیچ میں آخر آ جاؤں گی اس لئے میری خواہش تھی کہ میرے ایڈوائزر کے طور پر کوئی نیا لیکن پڑھا لکھا اور سمجھ دار بندہ ہونا چاہئے...... تمہارا تعلق سیاست سے نہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہر آنے والے مشکل وقت میں مجھے بہترین گائیڈنس دے سکتے ہو۔"

مس شاہینہ کی باتیں سن کر میں خوشی سے پھول سا گیا۔ میرے ذہن سے خدشات کی گرد کچھ کم ہوئی۔

ہم سب نے رات کا کھانا ساتھ کھایا اس کے بعد میں اجازت لے کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔ بیڈ پر لیٹ تو گیا لیکن دن بھر سونے کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میری آنکھیں کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔

مجھے اسی سایہ کا انتظار تھا۔ گیارہ بجے میں نے اپنے لئے چائے منگوالی۔ ملازم کو تھرماس میں لانے کا کہا تا کہ رات جب بھی طلب ہو آسانی سے پی لوں۔ ایک بجنے والا تھا میری نگاہیں منتظر انداز میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھیں کہ اچانک کوئی کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا۔ میں چونک کر اٹھا اور کھڑکی کے پٹ کھول کر ادھر سے ہی باہر جس طرف کوئی گیا تھا دیکھا وہ ہی سایہ درمیانی اسپیڈ سے چلتا ہوا مس شاہینہ کے کمرہ کی کھڑکی طرف جا رہا تھا۔ میں پھولوں کے پودوں کے ساتھ چھپتا ہوا اس کے پیچھے جانے لگا۔ اب وہ سایہ کھڑکی کے عین نیچے کھڑا کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پودوں کے ساتھ چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔

اسی وقت سایہ کھڑکی کی طرف بڑھا میں اس کے انداز سے چونک اٹھا کیونکہ اس نے بھاگنے والے انداز میں دو اسٹیپ لئے اور جمپ لگا کر کھڑکی پر چڑھ گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر گم ہو گیا۔ میں پھولوں کے ساتھ حیرت سے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ قریباً پانچ منٹ سے زیادہ مجھے ادھر ہی حیرت زدہ کھڑے ہو گئے تو میں ایک لمبا سانس لے کر کشش و پنج میں مبتلا اس کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی کے پٹ بند تھے جبکہ میں نے خود کھلی کھڑکی سے اس سایہ کو ادھر کودتے دیکھا تھا میں اس کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن اوپر لٹک کر اس میں سے جھانکنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی میں سوچ میں پڑ گیا کہ اندر دیکھوں یا چپ چاپ واپس اپنے کمرہ میں چلا جاؤں۔

اچانک میں نے اندر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور لپک کر ایک جمپ لگایا اور کھڑکی کے اوپر بنے چھجے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اندر جھانک کر شیشوں سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرہ میں چھوٹا بلب جل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ میں نے پورے کمرہ میں جہاں تک ان شیشوں سے نظر آتا تھا دیکھا لیکن وہ سایہ مجھے نظر آیا اور پھر میری نظر سامنے دیوار کے ساتھ پڑے بیڈ پر پڑی میں چونک اٹھا بیڈ پر مس شاہینہ کے ساتھ کوئی تھا وہ دونوں آپس میں کمبل کے اندر گتھم گتھا تھے۔ میں اس طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک ان میں سے ایک کے سر پہ سے کمبل ہٹا کہ مجھے دیکھا اس کے دیکھتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا اور میرے ہاتھ چھجے سے چھوٹ گئے میں پیٹھ کے بل زمین پر گرا میرا جسم جھنجھنا اٹھا۔ میرا دماغ حیرت کے شکنجے میں تھا کیونکہ میری طرف دیکھنے والا سو فیصد وہ سایہ ہی تھا۔

میں نے جو کچھ اندر دیکھا تھا اس کے بعد تو میری وہاں سے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

میں آج بھی بے سدھ سا پڑا رہا جیسے کہ زمین نے مجھے اپنے ساتھ چپکا لیا ہو۔ صبح کی اذان ہوئی تو میں اٹھ کر اپنے کمرہ میں جا کر سو گیا لیکن صبح دس بجے مجھے اٹھا دیا گیا کیونکہ سیاسی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں میں نے مس شاہینہ کی طرف کئی بار غور سے دیکھا لیکن وہ بالکل ہشاش بشاش اور ہر فکر سے جیسے آزاد تھی۔

میٹنگ اور پھر کچھ فنکشن اٹینڈ کرتے رات کے دس بج گئے واپس آ کر کھانا کھاتے ہی میں اپنے کمرہ میں چلا گیا آج پھر میں اسی سایہ کا انتظار کرنے چاہتا تھا تا کہ دیکھ سکوں کہ یہ چکر کیا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا بیڈ

پر لیٹے لیٹے اونگھ آنے لگی۔ جاگنے کی بہت کوشش کی لیکن آنکھیں بند ہونے لگیں پلکیں بوجھل ہوگئیں۔

مجھے ایسا لگا کہ کمرہ میں کوئی ٹہل رہا ہو میں نے زور لگا کر آنکھیں کھول دیں وہ سایہ مجھے اپنی طرف بڑھتا نظر آیا میری زبان پہ ایک دم سے آیا۔ ''لاحول ولا قوۃ'' اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ اچانک مڑ کر بھاگا کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن وہ رکا نہیں اور بند دروازہ سے پار ہوگیا، میں اٹھ کر حیرت سے بیڈ پر بیٹھ گیا میں نے سوچ لیا کہ بصیر صاحب سے اس سایہ کے بارے میں بات کروں گا میرے جسم میں اس سایہ کو دیکھتے ہی سنسنی پھیل جاتی تھی اس کے جانے کے بعد بھی دماغ کسی بھی سوچ سے خالی رہتا تھا لیکن اس رات میں اس کے جانے کے بعد اس کا قلع قمع کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور اس کے لئے بصیر صاحب کو اعتماد میں لینا بہت ہی ضروری تھا لیکن......

جب میں نے بصیر صاحب سے اس بارے میں بات کی تو وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگے جیسے انہیں میری عقل پہ یقین نہ رہا ہو پھر بھی انہوں نے میری بات مکمل سنی اور پھر اگلی رات میرے ساتھ ہی اس سایہ کو دیکھنے کے لئے تیار بیٹھے تھے کہ وہ سایہ میری کھڑکی کے سامنے سے گزرتا نظر آیا میں نے بصیر صاحب کو مخاطب کرکے جو کہ میری طرف دیکھ رہے تھے اس سایہ کی طرف متوجہ کیا اور اٹھ کر کھڑکی سے کود کر باہر نکل آیا بصیر صاحب بھی میرے پیچھے آہستہ سے اترے، میرا رخ اس سایہ کی طرف تھا جو کہ آہستہ آہستہ مس شاہینہ کی کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا، میں نے بصیر صاحب کو اس طرف اشارہ کرکے سایہ دکھانے کی کوشش کی انہوں نے میری انگلی کی سیدھ میں اس طرف غور غور سے دیکھنا شروع کردیا روشنی کم ہی تھی لیکن اتنا اندھیرا بھی نہ تھا کہ وہ سایہ ان کو نظر نہ آتا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے آج پھر سایہ کھڑکی سے لٹک کر اندر چلا گیا میں نے بصیر صاحب کو اس کھڑکی تک لے جانا چاہا لیکن انہوں نے مجھے بازو سے پکڑا اور گیلری سے چلتے ہوئے مس شاہینہ کے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹا ڈالا۔ مس شاہینہ تیسری دفعہ دروازہ بجنے پر آواز دیتی آئی اور دروازہ کھول دیا۔

بصیر صاحب نے اس سے استفسار کیا لیکن اس نے ایسے جواب دیا جیسے کہ وہ حقیقت میں اس سایہ سے بے خبر ہے میں بھی اس کا مضبوط لہجہ سن کر حیران رہ گیا۔

اسی لئے میں نے چپ سادھ لی کیونکہ بصیر صاحب کو وہ سایہ نظر نہیں آیا یا تھا۔ اور مس شاہینہ سرے سے ہی مکر گئی تھی اس نے کسی سایہ کے بارے میں جاننے سے صاف انکار کردیا تھا اس کے بعد دو دن تو ان باپ بیٹی نے مجھے بلایا تک نہیں اور تیسرے دن بصیر صاحب ایک معزز سے شخص کو لے کر میرے کمرہ میں آگئے انہوں نے اس آدمی کا تعارف ایک قریبی دوست کی حیثیت سے کرایا اور میرا بھی تعارف کرا کر چلے گئے۔ وہ آدمی مجھے پہلے تو سیاست کے داؤ پیچ کے بارے میں بریفنگ دینے لگا اس کی معلومات میرے لحاظ سے کمپلیٹ معلومات تھیں میں بھی اس سے گھل مل گیا اور ان چند دنوں میں مختلف فنکشن میں لوگوں میں گھوم پھر کر جو معلومات سیاست کی لی تھیں وہ بتانے لگا باتوں ہی باتوں میں اس نے اچانک کہا۔

''بصیر صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہیں اس کوٹھی میں کوئی سایہ نظر آتا ہے۔''

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا لیکن چونکہ یہ گپ شپ ایک دوستانہ ماحول میں ہو رہی تھی اسی لئے میں نے پہلی رات سے جو سایہ مجھے نظر آیا تھا اس رات سے لے کر آج رات کے سایہ کے مس شاہینہ کے کمرہ میں کھڑکی سے داخل ہونے تک بتایا۔ وہ اسی طرح گپ شپ لگاتے اٹھ گئے۔

اسی رات میں نے اس طرف کے سیکورٹی گارڈ کو اپنے ساتھ تیار کیا پہلے تو وہ ڈرتا رہا کہ بصیر صاحب کو پتہ چلا تو وہ نوکری سے فارغ کردیں گے۔ آخر میرے اعتماد دلانے پر وہ تیار ہوگیا۔ کیونکہ وہ مجھے اس کوٹھی میں ایک خصوصی مہمان کے طور پر جانتا تھا۔

رات کے ایک بجتے ہی وہ سایہ کوٹھی کی بڑی دیوار سے برآمد ہوا۔ میں سیکورٹی گارڈ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی الرٹ ہوگیا اور سیکورٹی گارڈ کو الرٹ کیا وہ میرے ساتھ ہی اس کوٹھی سے نکلا اور ہم آگے پیچھے اس سایہ کے تعاقب میں چل دیئے۔ ”سر وہ سایہ کدھر ہے۔“

سیکورٹی گارڈ کی بات سنتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا سایہ تو ہمارے سامنے ہی ناک کی سیدھ میں ایسے جارہا تھا جیسے کہ کوئی آدمی نیند میں چل رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر غور سے اس گارڈ کو دیکھا میرے اچانک یوں پلٹ کر دیکھنے سے وہ کنفیوژ ہوگیا اور گڑبڑا کر بولا۔ ”وہ سر جی سایہ مجھے نظر نہیں آرہا۔“

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا میں نے اس سے ٹارچ لی اور احتیاط سے دو دفعہ جلا کر اس سایہ پر ڈالی اس سایہ نے پلٹ کر دیکھا میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”لاحول ولاقوۃ“ ان الفاظ کا فضا میں گونجنا ہی تھا کہ وہ سایہ غائب ہوگیا۔ سیکورٹی گارڈ بھی بصیر صاحب کی طرح اس سایہ کو دیکھ نہ پایا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے بصیر صاحب ذرا بڑی عمر کے ہیں تو ان کی نظر کچھ کمزور ہو لیکن اس سیکورٹی گارڈ کو بھی وہ سایہ نظر نہ آیا تو میں پریشان ہوگیا۔ میں نے اس گارڈ کو واپس اس کی ڈیوٹی پر جانے کا کہا اور خود اپنے کمرے میں جا کر اس سارے چکر کے بارے میں سوچتے ہوئے گہری نیند میں چلا گیا۔

دوسری شام ایک تھری پیس سوٹ والا میری عمر سے کچھ بڑا آدمی بصیر صاحب کے ساتھ نظر آیا۔ بصیر صاحب نے پہلے اس کا تعارف کرایا وہ بھی سیاست کا ایک چلتا پھرتا پرزہ تھا۔ پھر انہوں نے میرا تعارف کرایا تو اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اچھا اچھا تو یہ ہیں...... علی صاحب۔“ مجھے اس کا لہجہ بڑا ناگوار گزرا لیکن میں چپ رہا۔ بصیر صاحب نے بھی اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ نیچے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ نیا آنے والا آدمی مس شاہینہ کے ساتھ نظر آنے لگا۔ بصیر صاحب اور مس شاہینہ مجھے اگنور کرنے لگے اب رات کو وہ سایہ میرے اردگرد نظر آنے لگا۔ میرے اندر ڈر بسیرہ کرنے لگا۔ میرا دماغ چٹخنے لگا۔ اور وہ نیا پرزہ آتے جاتے مجھ پر طنز کے تیر برسانے لگا۔

ایک دن میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے اس کے ساتھ ہاتھا پائی کی مجھے بڑی مشکل سے قابو کیا گیا۔ میرا دماغ بہت ہی گرم تھا۔ میں بصیر صاحب کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھ تو گیا لیکن میرا دماغ سلگ رہا تھا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس نئے آدمی کو میری جگہ رکھ لیا گیا ہے۔ شاید اس سایہ والے واقعہ پر میری ذہنی صحت پر شعبہ کیا جارہا تھا۔ اچانک بیٹھے بیٹھے میں اٹھ کھڑا ہوا اور شور مچانے لگا۔ جو کچھ ہاتھ میں چڑھا ادھر ادھر پھینکنے لگا۔ سیکورٹی گارڈ آگئے مجھے قابو کرکے باندھ دیا گیا جانے کہاں سے اب ڈاکٹر وارد ہوا اور مجھے دائیں بازو پر انجکشن لگا دیا انجکشن لگنے کے بعد مجھے نیند آگئی شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا میری دھندلی آنکھوں کے سامنے وہ سایہ کھڑا جیسے مجھ پر ہنس رہا تھا۔

مجھے ہوش ایک سلاخوں والے کمرے کے اندر آیا میں فرش پر بچھی چادر پر لیٹا تھا اس کمرہ میں اکیلا تھا میرے حواس کام کرنے لگے تو مجھے سمجھ آئی کہ وہ پاگل خانے کا ایک کمرہ تھا میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا میں اٹھا ہی تھا کہ وہ سایہ سلاخوں کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور مجھے گھورنے لگا۔ فضا میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی جیسے کہ وہ کچھ بول رہا ہو میں نے غور سے سننے کی کوشش کی تو مجھے سمجھ آیا کہ وہ کہہ رہا تھا۔

”وہ صرف میری ہے۔“ اب مجھے پتہ چلا کہ مس شاہینہ اتنی خوب صورت اور مالدار ہونے کے باوجود بھی ابھی تک کنواری کیوں تھی کیونکہ اس کا عاشق ایک سایہ تھا جو کہ اس پر مکمل چھایا ہوا تھا۔

جان لیوا

راشد نذیر طاہر

قسط نمبر:4

برس ھا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگرداں انسانوں کی پراسرار هولناك داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدنداں کرکے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایك بالکل نئے طرز کی حیرت ناك دلوں پر دهشت طاری کرتی کهانی۔

ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

میں ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا، البتہ دیان کے منہ سے نکلے ہوئے ان لفظوں کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑی دیر بعد ہی جھونپڑے کا پردہ ہٹا اور ایک بوڑھا سا آدمی دکھائی دیا۔

اس کے سر اور داڑھی کے بے تحاشہ بال بکھرے ہوئے سے تھے...... اور تقریباً سارے ہی سفید ہو چکے تھے...... چہرے پر جھریاں تھیں اور آنکھیں قدرے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔

"ملاگا......؟" دیان نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

بوڑھے نے اثبات میں گردن ہلائی اور واپس اندر چلا گیا...... اب دیان میری طرف مڑا۔

"یہ ہماری علاقائی زبان ہے...... اس بوڑھے کا نام مادون ہے...... اسے کوئی اور زبان نہیں آتی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس نے کوئی اور زبان سیکھی ہی نہیں...... یہ میرے ماموں یعنی سردار کا خاص خادم ہے...... بے چارہ گونگا ہے۔"

"اوہ......!" میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں......" دیان مسکرایا۔

"شاید اسی وجہ سے یہ کوئی اور زبان نہیں سیکھ سکا...... اسے اردو بالکل سمجھ نہیں آتی......" میں نے اس سے سردار کے بارے میں پوچھا تھا۔

میں نے سر ہلا دیا، جلد ہی بوڑھے مارون کی واپسی ہوئی، اور وہ ہمیں اندر لے گیا...... اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس جھونپڑے میں بھی کمرے بنے ہوئے تھے سامنے ہی دوسرے کمرے کا دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

اس کمرے میں ضروریات زندگی کا سامان موجود تھا...... میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا، عین اسی وقت میری نگاہ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر پر پڑی اور میں بری طرح چونک اٹھا۔

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

دیان میری کیفیت سے واقف نہیں تھا، اس نے مجھے آواز دی۔

"ارے شکیل...... دروازے پر کیوں کھڑے ہو......؟ اندر آ جاؤ۔"

"آں...... ہاں......!" میں چونک کر بولا۔

اسی تصویر کو دیکھتا ہوا میں ان دونوں کے قریب آ گیا...... دیان نے فوراً ہی ادھیڑ عمر شخص سے میرا تعارف کروایا۔

"یہ میرا دوست شکیل ہے...... یہ خانہ بدوشوں کی

زندگی پر مضمون لکھنا چاہتا ہے..... اس لئے ہماری بستی میں آیا ہے..... یہ ہم لوگوں کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔"

"بہت خوب....." سردار نے یہ کہہ کر میری طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

اس کے چہرے پر ایک شفیق سی مسکراہٹ عود کر آئی تھی، میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اب دیان نے کہا۔

"اور یہ میرے ماموں ہیں..... اس بستی کے سردار بھی ہیں..... انہوں نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھا ہوا ہے۔"

"اچھا.....!" میں نے کہا۔

"تم لوگ بیٹھو....." سردار کی آواز کافی بھاری تھی۔

"میں مہمان کے لئے خاطر تواضع کا انتظام کرتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے ماموں۔" دیان نے کہا۔

"میں اسے بستی کی سیر کروانا چاہتا ہوں اور اس کے لئے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔"

"ہاں..... ہاں..... بالکل۔" سردار فوراً بولا۔

"شکیل جب تک چاہے اس بستی میں رہ سکتا ہے اور جہاں چاہے گھوم سکتا ہے میری طرف سے اجازت ہے۔"

"شکریہ....." دیان کے منہ سے نکلا۔

میں نے بھی سردار کا شکریہ ادا کیا، پھر دیان نے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا، میری نظریں بے اختیار دیوار پر لگی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ گئیں..... پھر میں بھی دیان کے ساتھ جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔

میں بہت بے چین تھا ،دیان نے اس بات کو محسوس کر لیا اور بولا۔

"کیا ہوا.....؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو.....؟"

"ہاں دیان..... میں نے شالا کو دیکھا ہے۔"

وہ چلتے چلتے رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"کہاں.....؟"

"وہ..... وہ.....!" میں بولتے بولتے رک گیا۔

"ہاں..... کہو..... رک کیوں گئے.....؟" دیان نے کہا۔

"اس کی تصویر..... میں نے سردار کے گھر میں دیکھی ہے....." میرے منہ سے نکلا۔

دیان غور سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر یک بیک وہ ہنس پڑا اور بولا۔

"کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو.....؟"

"نہیں دیان....." میں نے حیرت سے کہا۔

"میں بھلا مذاق کیوں کروں گا۔"

"اچھا ..... تو پھر میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیا.....؟"

"جس کی تصویر کو تم شالا کا نام دے رہے ہو...... وہ سردار کی بیٹی کی تصویر ہے۔" دیان نے کہا۔

"تمہیں یاد ہے جب تم مجھے شالا کا حلیہ بتا رہے تھے تو میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔"

"ہاں..... یاد ہے۔"

"دراصل میں اس وقت خود بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ تم عروا کا حلیہ بتا رہے ہو۔"

"عروا.....؟"

"ہاں ..... وہ شالا نہیں بلکہ عروا کی تصویر ہے ......اور.....!"

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ میں بے تابی سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا، اس وقت اس کا خاموش ہو جانا مجھے بری طرح کھلنے لگا۔

جب وہ چپ ہی رہا تو مجھے کہنا پڑا۔

"بولو..... تم رک کیوں گئے.....؟"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا واقعی وہ تصویر تمہاری شالا کی طرح ہے.....؟"

"ہو بہو..... بلکہ سو فیصد....."

"ہوں.....!" دیان نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا۔

"یہ تو...... بہت ہی عجیب سی بات ہے۔"

"تم مجھے پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو......؟" میں جھلا سا گیا۔

"صاف صاف بتاؤ...... ہوسکتا ہے کہ چندا نے اس کا نام غلط لیا ہو......؟"

"چندا تو عروا سے مل ہی نہیں سکتی...... نام کیسے لے سکتی ہے۔"

"کیا سردار کی بیٹی یہاں نہیں رہتی......؟"

"ہاں......"

"تو پھر...... وہ کہاں ہوتی ہے......؟"

"دوسری دنیا میں......" دیان نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب یہ ہے کہ عروا کو مرے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں...... اس کی تصویر تو یادگار کے طور پر سردار نے اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے۔"

یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔

کافی دیر تک میں گم صم رہا، پھر میرے منہ سے نکلا۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں...... شکیل......" دیان بولا۔

"عروا ایک حادثے کا شکار ہوگئی تھی، میرے ماموں یعنی سردار کو اس سے بہت محبت تھی، کیونکہ عروا کے پیدا ہونے کے دوسرے سال ہی عروا کی ماں چل بسی تھی...... تب سے ہی میرے ماموں نے اسے باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیا تھا...... لیکن پھر عروا بھی ان کا ساتھ نہ دے سکی اور میرے ماموں اب تنہا ہی رہتے ہیں...... انہوں نے دوسری شادی بھی کرنا گوارا نہیں کیا...... اپنی بیوی اور بیٹی کی یاد میں اکثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں۔" وہ بولے جا رہا تھا اور میری حالت عجیب سی تھی۔ اب تو خود میرا بھی دل چاہنے لگا تھا کہ میں رونا شروع کردوں۔

یہ سب کیا تھا...... شالا تو مجھے چندا کے ساتھ دکھائی دی تھی اور میں پہلی نظر میں ہی اسے اپنا دل دے بیٹھا تھا...... پھر شالا کا وجود سرے سے ہی غائب ہوگیا اور اس کی جگہ عروا نے لے لی لیکن عروا تو بقول دیان کے اب اس دنیا میں ہی نہیں تھی...... تو پھر...... جس سے میری ملاقات ہوئی تھی وہ کون تھی......؟

اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا، میں نے دیان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"سنو دیان...... میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔"

"کیا......؟"

"ہوسکتا ہے کہ شالا تمہارے ماموں کی بیٹی کی ہم شکل ہو۔"

"یہ بات ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں...... ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔"

"خود سوچو...... اگر یہ ممکن ہوتا تو کیا سردار کو یا مجھے اس کا علم نہ ہوتا......؟ سردار تو اسے اس کے گھر والوں سے مانگ کر اپنے ساتھ ہی رکھ لیتا، تاکہ اسے عروا کے بدلے میں اپنی بیٹی بنا سکے۔"

"ہوں...... یہ بات تو ہے......" میں نے سر ہلایا۔

شاید میں بہت زیادہ الجھ گیا ہوں، اس لئے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوجھ رہی...... اور اب میرا خیال ہے کہ اس بستی میں شالا کی تلاش بھی فضول ہے کیونکہ اگر وہ عروا کی ہمشکل ہے تو اس صورت میں تو وہ مشہور ہوتی...... یہ کسی کو اس کے بارے میں پتا ہوتا۔"

"ہاں...... یہ تو ہے......" دیان نے کہا۔

"عروا کو اس بستی کا بچہ بچہ جانتا ہے۔"

"بس تو پھر میں شالا کے خیال کو اسی بستی میں دفن کردیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال اب یہ ہے کہ میں نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا...... میں جا رہا ہوں دیان۔ تمہاری مدد اور خلوص کا بہت بہت شکریہ۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا رخ بدل لیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"ارے......کہاں جارہے ہو......؟" دیان نے چونک کر پوچھا۔

"میں واپس جارہا ہوں......" میں نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

"میرا اب یہاں رکنا فضول ہے کیونکہ مجھے شالا نہیں ملے گی...... یہاں رک کر میرا دل مزید پریشان اور مایوس ہوگا اس لئے میں جارہا ہوں۔"

"چلو......پھر میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں دیان......میں چلا جاؤں گا......" میں نے کہا۔ "تم صبح سے میری وجہ سے خواہ مخواہ پریشان ہو...... اب تم یہیں رہو اور آرام کرو......میں چلا جاؤں گا۔"

دیان نے کافی اصرار کیا تھا، لیکن میں نے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لے جانا مناسب خیال نہیں کیا...... کیونکہ وہ پہلے ہی میری وجہ سے دو چکر لگا چکا تھا...... چنانچہ اسے میں نے سمجھا بجھا کر وہیں روکا اور بستی سے باہر نکل آیا۔

یہ حقیقت تھی کہ اس وقت میرا عجیب حال تھا...... دل چاہ رہا تھا کہ اپنے گھر کی طرف جانے کے بجائے اسی جنگل میں کسی طرف نکل جاؤں۔

کیا زندگی تھی......؟ بچپن سے لے کر اب تک نہ جانے کس گرداب میں پھنسا ہوا تھا...... آقال قبیلے کے زیر سایہ میں پروان چڑھا......وہ قبیلہ...... جو جادو ٹونے اور کالے علم کا ماہر تھا......لیکن میرے باپ کے مرنے کے بعد اس قبیلے کا نہ تو کوئی نام لیوا تھا اور نہ ہی کوئی اس علم کو آگے بڑھانے والا تھا۔ کیونکہ میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس کالے دھندے کو بھی اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ ہی زمین میں دفن کردوں گا۔

وہ لوگ خون اور نسل کی بنا پر میرے لئے قابل احترام تھے......لیکن ان ہی کی بدولت نہ جانے کتنے گھر اجڑے ہوں گے...... نہ جانے کتنے انسانوں کا سکون تباہ ہوا ہوگا......کیا یہ غلط نہ تھا۔

یہ سب باتیں مجھے رحیم بابا نے بتائی تھیں...... چنانچہ مجھے اسی وقت اپنے قبیلے سے نفرت ہوگئی تھی......

لیکن یہ نفرت صرف ان لوگوں کے پیشے کی حد تک تھی...... مجھے پالنے پوسنے اور جوان کرنے میں جو میرے باپ کا احسان تھا وہ اب بھی میرے سر آنکھوں پر تھا۔

لیکن جن حالات سے میں گزرا تھا میری نظر میں اس کا سبب میرے باپ کا پیشہ ہی تھا...... اور اب مجھے محبت ہوئی اور میرے دل کے نہاں خانے میں کوئی چپکے سے آ کر بیٹھا تو اس کا مسئلہ بھی عقدہ لاینحل بن گیا تھا۔

آخر شالا کا کیا اسرار تھا......؟ وہ کون تھی......؟ ایسا حسن تو میں نے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا......لیکن وہ تھی کہاں...... کیا وہ سردار کی بیٹی کی روح تھی......؟ کیونکہ شالا اور عروا، میں بال برابر بھی کوئی فرق نہیں تھا......تو......تو کیا......واقعی شالا، عروا ہی کا کوئی روپ تھی......جو اپنی ایک جھلک دکھا کر کسی چھلاوے کی طرح اوجھل ہو چکی تھی۔

میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے، اور ذہن الجھتا جارہا تھا...... میں اب جنگل کے پگڈنڈی والے راستے سے گزر رہا تھا...... جہاں تھوڑے ہی فاصلے پر قدرتی چشمہ موجود تھا۔

اچانک ہی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"شش......شش......!"

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا......لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔

"شش......!" پھر سے کسی نے مجھے چھیڑا۔

اس بار بھی مجھے کوئی نظر نہ آیا البتہ میرے اٹھتے قدم ضرور رک گئے تھے۔ مجھے اس خیال نے ستایا کہ کہیں یہ وہی ہیولہ تو نہیں ہے، جو اکثر مجھے دکھائی دیتا ہے۔

چنانچہ میں نے دل کڑا کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم......سامنے آؤ......"

"میں یہاں ہوں......!" ایک نسوانی سریلی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ساتھ ہی ہنسی کی آواز گونجی، مجھے کافی حیرت ہوئی تھی......میرا اندازہ تھا کہ یہ آوازیں سامنے والے درخت

کے عقب سے آ رہی ہیں اور وہاں کوئی موجود ہے۔
"سامنے تو آؤ...... کون ہو تم......؟" میں نے پھر کہا۔
"مجھے شرم آ رہی ہے...... سامنے کیسے آؤں......؟" اس کا لہجہ بے حد دلکش تھا۔
میں سوچ میں پڑ گیا...... آخر یہ لڑکی کون تھی......؟ اور اس جنگل میں کیا کر رہی تھی۔
میں قدرے ڈر بھی رہا تھا، لیکن پھر تجسس میرے ڈر پر غالب آ گیا اور میں اس درخت کے قریب جا پہنچا۔
اب میں نے دوسری طرف جھانکا اور مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا...... درخت کی آڑ میں شالا کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔
بالکل...... یہ شالا ہی تھی۔
میں حیرت کا بت بنا ہوا تھا اور پتھرائی ہوئی سی آنکھوں سے اس وجود کو دیکھ رہا تھا۔
شالا کے جسم پر معمولی سا لباس تھا، لیکن اس کے باوجود اس کا حسن میری آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہا تھا۔
لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی طرح کے اندیشے بھی میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں......؟
وہ مسلسل مجھے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ خود ہی بولی۔
"کیسی لگی یہ ملاقات......؟"
"اچھی ہے......" میرے منہ سے نکلا۔
"لیکن...... لیکن تم کون ہو......؟ بستی میں تو تمہارا وجود ہی نہیں ہے۔"
"اوہ......!" وہ ہنسی۔
"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں سردار کی وہ بیٹی ہوں، جو مر چکی ہے...... ہے ناں......!"
"یہ لو......" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔
"تمہارے خیال میں اگر میں کوئی روح ہوں، تو میرا جسم نہیں ہونا چاہئے۔ لو دیکھو...... میں گوشت پوست کی مالک ہوں۔"
اس کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا لیکن مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں وہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں......
حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس وقت کافی ڈرا ہوا تھا مجھے ساکت دیکھ کر وہ خود ہی دو قدم آگے بڑھی اور پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
اوہ...... نرم و ملائم سادہ سبک ہاتھ...... جس میں خون اور جوانی کی گرماہٹ تھی...... سرشاری کی تھرتھراہٹ تھی...... وہ ہاتھ اب میرے ہاتھ میں تھا۔
"اب بولو......" وہ پھر گویا ہوئی!
"کیا کہتے ہو...... کیا میں سردار کی وہ بیٹی ہوں، جو مر چکی ہے۔"
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......" میں نے الجھ کر کہا۔
"اور نہ ہی میں کوئی فیصلہ کر پا رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"
یہ سن کر وہ پھر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔
"میں تمہارے حال سے واقف ہوں...... جو کچھ ہوا اس میں نہ تو میرا کوئی قصور ہے اور نہ ہی تمہارا کوئی دوش ہے۔"
"تو پھر...... یہ سب کیا ہے......؟" میری آواز قدرے بلند تھی۔
"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔" اس کی آواز میں التجا تھی۔
"آؤ...... ہم دونوں کہیں بیٹھتے ہیں...... اس کے بعد میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی...... آؤ۔"
یہ کہہ کر وہ گھومی اور اس نے آگے قدم بڑھا دیئے۔
میں بھی چپ چاپ اس کے عقب میں چلنے لگا۔
اس کی خراماں چال بھی بے حد دلکش تھی...... اس کا داہنا پاؤں ایک ادا سے زمین پر پڑتا تھا اور اس وقت کمر پر آنے والا بل میرے دل میں گدگدی سی کرنے لگتا تھا...... وہ سراپا قیامت تھی...... کسی حسین خواب کی طرح۔

اس نے ایک بار مجھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر دوبارہ آگے بڑھ گئی...... جلد ہی ہم دونوں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں درختوں کے درمیان کھلی جگہ میں ایک خیمہ نصب تھا۔

میں نے حیرت سے اس خیمے کو دیکھا...... شالا میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔

"میں یہاں رہتی ہوں اور میرا نام شالا ہی ہے...... آؤ...... اندر آجاؤ...... پھر میں تمہیں اپنی کہانی سناتی ہوں...... آؤ۔"

میں اس کے ساتھ خیمے کے اندر داخل ہوگیا، یہاں باقاعدہ بستر بھی موجود تھا اور ایک طرف کھانے پینے کا سامان اور کچھ برتن بھی موجود تھے...... یہاں ایک انگیٹھی بھی رکھی ہوئی دکھائی دی۔

"بیٹھو......" شالا نے بستر کی طرف اشارہ کیا اور پھر خود بھی چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

"خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے......؟" میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"ورنہ ممکن ہے کہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں بھی پیال پر بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں پاگل نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھا۔

"کیونکہ تم نے نہ جانے اب تک کیا کیا سوچ لیا ہوگا...... میں اب تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے یہاں ایک مجبوری کے تحت رہنا پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب......؟ کیسی مجبوری......؟"

"میں سردار کی بیٹی کی ہم شکل ہوں......" شالا نے کہا۔

"اور ہم دونوں میں کوئی بھی رشتہ نہیں تھا...... لیکن یہ صرف قدرت کا کرشمہ تھا کہ میں ہو بہو اسی کی طرح تھی...... ہم دونوں کی دوستی بھی بہت گہری تھی...... ساتھ رہنا، ساتھ کھانا پینا اور ساتھ ہی کھیلنا کودنا ہمارا شیوہ تھا۔ اس میں اور مجھ میں صرف رنگت کا قدرے فرق تھا...... وہ زیادہ گوری تھی اور میرا رنگ سانولا ہے...... اسی بنا پر بستی کے لوگ ہمیں پہچانتے تھے لیکن پھر اچانک ہی عروا بیمار پڑی اور اسی بیماری میں ایک دن اس کا انتقال ہوگیا...... سردار کو اس سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی...... کیونکہ سردار نے بن ماں کے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا...... چنانچہ عروا کے مرنے کے بعد سردار گویا اپنے حواس ہی کھو بیٹھا تھا...... میں اس کے سامنے آتی تو وہ پاگلوں کی طرح چیختا تھا...... اور اس کی طبیعت بگڑ جاتی تھی...... چنانچہ سردار کے حامیوں اور اس کے وفاداروں نے سردار کی اس تکلیف دہ حالت کا یہ حل نکالا کہ ان لوگوں نے مجھے بستی سے باہر کردیا۔

"ارے...... یہ کیوں......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ جب بھی سردار سے میرا سامنا ہوتا تھا تو اسے عروا کی یاد آجاتی تھی...... اس لئے بستی والوں نے میرے لئے یہاں جگہ بنادی...... یوں تو میرا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے...... مجھے یہاں کھانے پینے کو بھی ملتا ہے...... اور جب رات کو سردار سو جاتا ہے تو بستی کے چند لوگ مجھے آکر لے جاتے ہیں...... اس طرح میں رات کے وقت بستی میں ہی سوتی ہوں۔"

"بڑی عجیب کہانی ہے......" میں بڑبڑایا۔

"تم تو بڑی مشکل قسم کی زندگی گزار رہی ہو۔"

"ہاں...... لیکن مرجانے سے تو اچھا ہے......" وہ غمگین لہجے میں بولی۔

"تم بستی کے لوگوں سے واقف نہیں ہو...... وہ لوگ تو سردار کی حالت کے پیش نظر مجھے بھی مار دینے کے حق میں تھے...... تب ہی میری ماں نے ان لوگوں کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے تو مجھے زندگی کا نذرانہ ملا۔"

"اوہ...... یہ تو...... یہ تو سراسر ناانصافی اور درندگی ہے۔" میں کانپ اٹھا۔

"ہاں...... بس کوئی نیکی ہی کام آگئی...... جو میری جان بخشی ہوگئی...... ورنہ میں بھی موت کی نیند سو چکی ہوتی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور اس کے چہرے پر

اداسی کے بادل لہرانے لگے۔ دفعتاً ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔

"یہ بتاؤ کہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں جنگل سے گزر رہا ہوں......؟" میں نے غور سے اسے دیکھا۔

"تم کیا جانو کہ میں اس وقت یہاں ہوں۔" یہ سن کر وہ مسکرائی اور بولی۔

"تم یہ بات کررہے ہو؟ ارے۔ میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ تم صبح سویرے ہی بستی چلے گئے تھے...... اور تم وہاں مجھے ڈھونڈنے کی غرض سے گئے تھے۔"

یہ سن کر میں اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا، پھر میرے منہ سے نکلا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا...... یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟"

"تم خود اندازہ لگاؤ......" وہ بھرپور انداز میں مسکرائی اور پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھائی دینے لگی۔

میں اس کی خوب صورتی میں کھوسا گیا، پھر سنبھل کر بولا۔

"تم خود ہی بتادو...... میں اس وقت بہت زیادہ الجھا ہوا ہوں۔"

"اچھا تو سنو...... چندا مجھے تھوڑی دیر پہلے ہی ساری تفصیل بتا کر گئی تھی کیونکہ وہ دیان کی گہری دوست ہے...... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔"

میں حیرت کا بت بنا ہوا اس کی شکل دیکھ رہا تھا...... وہ پھر بولی۔

"کیا تمہیں ان باتوں پر حیرت ہورہی ہے؟"

"بہت زیادہ......" میں بول اٹھا۔

"وہ اس لئے کہ دیان تو صبح سے میرے ساتھ تھا پھر چندا کیسے تمہارے پاس آگئی؟"

"تم شاید ایک بات بھول رہے ہو......" وہ سنجیدہ ہوگئی۔

"تم دیان سے کل شام میں ملے تھے، اور میرے متعلق اس نے کل رات میں ہی چندا کو بتادیا تھا۔"

"اوہ......" میرے منہ سے نکلا۔

"تو...... یہ بات ہے۔"

"ہاں......" وہ بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہارا نام شکیل ہے۔ اب خود سوچو کہ تمہارا نام مجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر دیان مجھے بستی میں لے کر کیوں گھوم رہا تھا......" میں نے کہا۔

"اس نے مجھے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا......؟"

یہ سن کر وہ اداس انداز میں مسکرائی اور بولی۔

"بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماموں سے بہت ڈرتا ہے...... اگر تمہاری وجہ سے میری کہانی ان کے سامنے کھل گئی تو اس کی شامت آجائے گی...... وہ آنے والے وقت سے ڈر رہا ہے...... شاید اسی لئے وہ فیصلہ نہیں کر پارہا ہوگا کہ تمہیں میرے متعلق بتائے کہ نہ بتائے۔"

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔" میں نے ایک طویل سانس لی۔

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلادیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، پھر شالا بولی۔

"تم پہلی نظر میں ہی میرے دل میں اتر گئے تھے...... یہ محض اتفاق تھا کہ میں چندا کے ساتھ سیر کرنے نکلی تھی، ورنہ وہ اکثر یہاں آتی ہے، تو ہم دونوں اسی جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اور وقت گزار دیتے ہیں۔"

"اس نے بھی تمہارے وجود سے انکار کیا تھا......" میں نے بتایا۔

"میں اس سے مل چکا ہوں......"

"ہاں...... مجھے معلوم ہے......" وہ سر ہلا کر بولی۔

"اسے بھی دیان ہی کے کہنے پر جھوٹ بولنا پڑا تھا۔"

میں کچھ کہے بغیر ہی اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھے بے حد حسین لگ رہی تھی، میرے دل میں کئی طرح کے خیالات لہرانے لگے۔ دل چاہا کہ اسے اپنی بانہوں میں بھرلوں...... لیکن یہ پہلی ملاقات تھی اور مجھے ابھی محبت

کی منزل تک پہنچنے کے لئے طویل راستہ طے کرنا باقی تھا..... چنانچہ میں نے کہا۔

"میں تمہیں کیسا لگا ہوں.....؟"

"کیا مطلب.....؟" اس نے مجھے دیکھا۔

"مطلب یہ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو چکی ہے....." میں نے کہا۔

"کیا تم میری محبت کو قبول کرتی ہو.....؟ کیا تم میری محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہو.....؟"

"میں کل بتاؤں گی....." اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ابھی تم چلے جاؤ..... کیونکہ چندا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے..... میں ابھی کسی سے بھی تمہارا ذکر نہیں کرنا چاہتی ابھی ہماری اس ملاقات کو پوشیدہ ہی رہنا چاہئے۔"

میں نے سر ہلا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا، وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"دل تو نہیں چاہ رہا کہ تم جاؤ..... لیکن مجبوری ہے..... تم کل صبح ضرور آنا میں انتظار کروں گی۔"

پھر شالا نے مجھے بڑی اپنائیت سے الوداع کہا اور میں وہاں سے نکل آیا۔

میں گم صم سا تھا..... قدرے پریشان اور عجیب طرح کی سوچوں میں گم..... ایک طرف شالا سے ملنے کی خوشی تھی، تو دوسری طرف شالا کی بتائی ہوئی داستان نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

بہر حال فی الوقت تو یہی کافی تھا کہ مجھے شالا مل گئی تھی..... ابھی کسی اور سمت میں ذہن کو دوڑانا فضول تھا۔

دوپہر کے وقت میں حویلی میں داخل ہوا تو بھوک کے مارے برا حال تھا..... میں نے فوراً ہی اماں جی کو دیکھ کر کھانے کا نعرہ لگایا اور باتھ روم میں جا گھسا۔

نہا دھو کر باہر نکلا تو خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا..... میں کمرے میں داخل ہوا تو اماں جی کھانا لے کر میرے انتظار میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

میں کھانے پر ٹوٹ پڑا..... اماں جی خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھیں جب میں پیٹ بھر کر کھا چکا تو وہ بولیں۔

"روحی آئی تھی۔"

"یہ کون ہے ماں جی.....؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"وہی..... جس نے ہمارا گھر کرائے پر اٹھوایا تھا..... تمہیں بتایا تو تھا۔"

"اوہ..... اچھا۔"

"ہاں.....! اس نے کرائے داروں سے بات کی تھی..... لیکن وہ لوگ اب کسی صورت بھی یہاں رہنے کو تیار نہیں ہیں..... اور اسی مہینے وہ مکان خالی کردیں گے۔" اماں جی نے بتایا۔

"اچھا..... لیکن انہوں نے وجہ تو بتائی ہوگی.....؟"

"نہیں....." وہ بولیں۔

"روحی نے فراصت علی سے بھی بات کی تھی، لیکن وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔"

"ارے تو جانے دیں ان لوگوں کو....." میں نے منہ بنا کر کہا۔

"جب ان لوگوں کے نخرے نہیں مل رہے تو پھر منت سماجت کرنے کا کیا فائدہ..... چھوڑیں..... کوئی اور آجائے گا کرائے پر....."

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں....." وہ سر ہلا کر بولیں۔

"ویسے میرا ارادہ تھا کہ میں خود ان لوگوں کی طرف جاؤں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے ماں جی....." میں نے کہا۔

"ان کو گھر خالی کرنے دیں۔ میں اب سدو سے بات کروں گا وہ کوئی اچھا سا کرائے دار بتا دے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے..... جیسے تم کہو....." یہ کہہ کر انہوں نے برتن اٹھانا شروع کردیئے۔

اس وقت میرے دل میں آئی کہ میں انہیں شالا

کے متعلق بتادوں...... لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔

اتنی جلدی اماں جی کو بتادینا مناسب نہیں تھا، ابھی تو محبت کی ابتداء تھی۔ ابھی مجھے شالا سے ایک تفصیلی گفتگو کرنی تھی۔

میں تو اسے اپنی زندگی کا ہمسفر بنانے کے لئے تیار تھا، لیکن مجھے اس کے دل کا حال بھی تو جاننا تھا...... کیا اسے بھی مجھ سے محبت ہوگئی تھی......؟

یہ بات معلوم کرنے کے لئے مجھے صبح کا انتظار کرنا تھا...... کیونکہ شالا نے مجھے دوسرے دن بلایا تھا۔

☆......☆......☆

شام کے وقت ایک بار پھر دیان سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ کیرم کھیل رہا تھا۔

اس وقت سدو میرے ساتھ نہیں تھا، دیان نے مجھے دیکھا اور پھر فوراً ہی اشارہ کیا۔

میں رک گیا تھا، دیان جلد ہی کھیل ختم کرکے میرے پاس آ گیا۔ اس نے کافی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔

"کیا حال ہیں میرے دوست......؟" اس نے بڑے خلوص سے پوچھا تھا۔

میں نے ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"دوست بھی بولتے ہو اور غیروں والا سلوک بھی روا رکھتے ہو...... بہت خوب......"

"کیا مطلب......؟" وہ چونکا۔

"میں سمجھا نہیں......"

"چھوڑو...... کیا کروگے سمجھ کر......" میں مسکرایا۔

"آؤ ہوٹل میں چلتے ہیں......"

"ضرور......!" اس نے قدم آگے بڑھائے۔

"لیکن اگر تمہاری مراد شالا سے ہے تو میں اس کی حقیقت تمہیں بتا چکا ہوں...... تم نے اسے جس ہستی سے مشابہ کیا ہے، وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔"

یہ سن کر میں معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں شالا سے مل چکا ہوں۔"

"کیا مطلب......؟" اس نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔

"وہی شالا...... جسے میں نے چندا کے ساتھ دیکھا تھا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟" دیان نے کہا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس دوران ہم ہوٹل پر پہنچ گئے، ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد دیان نے میری طرف تجسس انداز میں دیکھ کر کہا۔

"مجھے بتاؤ...... تم کیا کہہ رہے ہو......؟"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں...... اسے تم اچھی طرح جانتے ہو......" میں نے کہا۔

"اب اتنے انجان مت بنو۔"

اس سے پہلے کہ دیان کچھ کہتا، سدو ہوٹل میں داخل ہوا، وہ شاید ہماری ہی تلاش میں تھا، وہ فوراً ہماری میز کی طرف لپکا اور پھر دور سے ہی پکار اٹھا۔

"اچھا...... اکیلے اکیلے پارٹی ہورہی ہے...... بھائی کو پوچھا بھی نہیں۔"

پھر وہ بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ابھی آئے ہیں ہم دونوں......" میں نے سدو سے کہا۔

"میں بھی اتفاق سے ابھی گھر سے نکلا تھا......" سدو نے جواب دیا۔

"یار...... بچوں کو پڑھا پڑھا کر دماغ خشک سا ہوجاتا ہے۔ جانو بھائی کے کیرم پر آیا تو ارشد سے تمہارے بارے میں معلوم ہوا میں نے فوراً ہی اندازہ لگالیا کہ تم دونوں ہوٹل پر ہی آئے ہوگے اور پھر میں یہاں چلا آیا۔"

"تمہیں تو جاسوس ہونا چاہئے۔" دیان مسکرایا۔

"کوئی خاص بات ہورہی تھی؟" اس نے غور سے ہمیں دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ بہت ہی خاص تھی......" دیان

نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"زیادہ بہتر تو شکیل ہی بتا سکتا ہے۔"
اتنی دیر میں چائے آ گئی، آج بیرا کچھ پوچھے بغیر ہی تین کپ لے آیا تھا، پھر اس نے انہیں میز پر سجایا اور فخریہ انداز میں ہم لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا واپس پلٹ گیا۔
"بھئی واہ......" سدرو نے فوراً ایک کپ اپنی طرف کھسکایا۔
"بیرا کافی عقل مند ہے۔"
"ہاں تو شکیل میاں...... اگر مناسب سمجھو تو ہمیں بھی بتاؤ۔"
"ضرور......" یہ کہہ کر میں نے شالا سے ملاقات کی مختصراً تفصیل بتادی۔ بہت سی باتیں میں گول بھی کر گیا تھا خاص طور پر وہ باتیں کہ جن کا تعلق بستی کے سردار اور دیان سے تھا۔
یہ سن کر سدرو نے کہا۔
"بھئی بہت خوب...... عشق نے حسن کو آخرکار پا ہی لیا...... اسے کہتے ہیں محبت۔"
"لیکن اس بات پر مجھے حیرت ہے۔" دیان نے دخل دیا۔
"کیسی حیرت......؟" سدرو نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
"شالا نامی کسی لڑکی کا وجود ہی نہیں ہے۔"
دیان بولا۔
"ارے......" سدرو کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔
"یہ کیا بات ہوئی......؟"
"میں شکیل کو یہی بات سمجھا رہا ہوں۔"
دیان بولا۔
"اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ شالا سے ملا ہوں......" میں تیز لہجے میں بولا۔
"کیونکہ میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ دیان شالا سے انکاری کیوں ہے؟"

"ارے بھئی...... آپس میں بے وجہ کیوں بحث کر رہے ہو......" سدرو نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا۔
"ہو سکتا ہے کہ دیان اس لڑکی کو سرے سے جانتا ہی نہ ہو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم شالا سے کہاں ملے تھے؟"
"جنگل میں......!" میں نے جواب دیا۔
"جنگل میں کہاں......؟" دیان نے پوچھا۔
میں نے ایک انداز سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔
"وہ وہاں ایک خیمے میں رہتی ہے...... میں نے کافی دیر اس سے بات چیت کی ہے۔"
"حیرت ہے......" دیان بڑبڑایا۔
"اس کا مطلب یہ ہے کہ بستی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے...... شاید اسی لئے میں اس سے ناواقف ہوں۔"
"شاید یہی بات ہو......" میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔
"اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری بستی سے اس کا بہت خاص تعلق ہو۔"
"تم الجھی ہوئی باتیں کیوں کر رہے ہو......؟"
دیان نے غور سے مجھے دیکھا۔
"صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" میں نے طویل سانس لی۔
"میں صرف یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں شالا سے ملاقات کر چکا ہوں...... وہی شالا...... جس سے چندا بھی انکاری ہے۔"
دیان نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سدرو ہاتھ اٹھا کر بولا۔
"آپس میں بحث بازی سے کوئی فائدہ نہیں...... اگر شکیل اس لڑکی سے مل چکا ہے تو یہ خوشی کی بات ہے...... اس میں کوئی عیب تو نہیں ہے۔"
"واقعی کوئی عیب نہیں ہے۔" دیان بولا۔

"لیکن میں شکیل کی اس شالا سے ملنا چاہتا ہوں۔" یہ سن کر میں نے کہا۔

"میں تمہیں شالا سے ضرور ملواؤں گا...... تھوڑا سا انتظار کرو...... بس...... تھوڑا سا انتظار۔"

☆......☆......☆

وہ رات میں نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزاری تھی۔ دوسرے دن میں صبح ہی صبح گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

"آج کہاں چل دیئے۔" اماں جی نے پوچھا تھا۔

"کالج جا رہا ہوں ماں جی۔" میں نے جھٹ سے کہا۔

"اچھا......" اماں جی نے سر ہلا دیا۔

میں کان دبا کر وہاں سے نکل آیا، میں پھر کہیں بھی رکا نہیں تھا۔ میرے قدم تیزی سے جنگل کے اس حصے کی طرف اٹھ رہے تھے، جہاں شالا میری منتظر تھی۔

وہ واقعی خیمے سے باہر ٹہل رہی تھی...... آج اس نے سفید رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور وہ گزشتہ دن سے بھی زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور میرے نزدیک آ کر بولی۔

"ت...... تم آ گئے......؟"

"ہاں شالا......" میں نے محبت بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

"مجھے تو آنا ہی تھا۔"

"میں رات بھر جاگی ہوں......" اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"آؤ...... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ چلتا ہوا خیمے کے اندر آ گیا...... پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے، نہ جانے کتنی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد شالا کے ہونٹ ہلے۔

"کیا دیکھ رہے ہو......؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے پہلے کیوں نہ ملیں......" میں نے کہا۔

"نہ جانے زندگی کے کتنے دن بے کیف ہی گزر گئے۔"

"میں بھی رات میں یہی سوچتی رہی۔" شالا نے کہا۔

"اور تمہاری محبت میرے دل میں اور بھی بڑھتی چلی گئی۔"

"شالا...... ایک بات کہوں......؟"

"ہاں...... کہہ دو......" وہ پیار سے بولی۔

"میں تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں......" میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد تمہیں اپنی ماں جی سے ملوا دوں۔"

"اچھا......" اس نے سر ہلایا۔

"تمہارے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"ماں جی کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔

"اور بھی لوگ تھے، لیکن وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"کیوں...... کیسے......؟" شالا حیران ہو کر بولی۔

"کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟"

"کوئی ایک حادثہ نہیں تھا......" میں نے بات گھمائی۔

"بس یہ اتفاق ہی تھا کہ مختلف حادثے ہوئے اور پہلے میری دو بہنیں انتقال کر گئیں اس کے بعد ایک اور حادثے نے میرے باپ کی جان لے لی۔"

"اوہ...... مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔" شالا نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہت دکھی ہو۔"

"ہاں شالا۔" میرا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

"میرے سینے میں بہت سے زخم ہیں۔"

"تم پریشان نہ ہو......" شالا نے مجھے دلاسہ دیا۔

"میں اب تمہاری زندگی میں آ چکی ہوں......

میں سارے زخم بھر دوں گی۔ میں تمہیں اتنی محبت دوں گی کہ گزرے ہوئے وقت کے غموں کو تم بھول جاؤ گے۔"

"سچ......؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"ہاں شکیل......" شالا نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیئے میرے وجود میں ٹھنڈی ٹھنڈی سی لہریں گردش کرنے لگیں۔

میں اس کے قریب ہو گیا۔ اور میں نے اپنا سر اس کے چہرے پر لٹکا دیا، اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو نے میری روح کو معطر کر دیا۔

"شکیل......" اس نے دھیرے سے مجھے آواز دی۔

"ہاں......شالا......کہو......" میں نے مخمور لہجے میں کہا۔

"کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ......زندگی بھر میرے ساتھ رہو گے......؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں......میرا وعدہ ہے......" میں نے اس کا نرم وملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حامی بھری۔

"دیکھو......سوچ لو۔" اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"اس میں سوچنے والی کیا بات ہے......؟" میں نے فوراً کہا۔

"میں یہ بات ایک وجہ سے کہہ رہی ہوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"کیا وجہ ہے......؟ بتاؤ میری جان۔"

"چھوڑو......تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے گی۔" اس نے کہا۔

"کیوں......؟ ایسی کیا بات ہے؟" میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

نہ جانے کیوں شالا اداس ہو گئی۔ یہ بات میں نے صاف طور پر محسوس کی تھی۔

"بس......! مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔"

"تم بتاؤ......میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری محبت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"میں تمہیں اب بھی چاہتا ہوں......اور تمہاری بات معلوم ہو جانے کے بعد بھی یہ محبت اپنی جگہ قائم رہے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" شالا نے کہا۔

"میں تمہیں بتا دوں گی......سب کچھ بتا دوں گی۔"

"بس......مجھے تھوڑی سی مہلت دو......میں جلد ہی اپنی کہانی تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں گی۔"

"ابھی بتا دو......" میں بے تابی سے بولا۔

"میں سننے کے لئے بے چین ہوں۔"

"ابھی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں موقع دیکھ کر تمہیں رات میں بلاؤں گی......پھر ہم بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے۔"

"رات میں......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم......رات میں مجھ سے کس طرح ملو گی......؟ کیسے ملو گی؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو......" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں کل رات میں یہاں پہنچ جاؤں گی۔ تم آ جانا۔"

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر آہستہ سے بولی۔

"اب تم جاؤ......! چندا آنے والی ہے۔"

"لیکن یاد ہے......کل رات میں ضرور آنا۔"

پھر شالا میرے ساتھ کچھ دور تک آئی تھی، پھر اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے رخصت کیا اور درختوں کے عقب میں چلی گئی۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں ایک طویل سانس لے کر مڑ گیا۔

لیکن ابھی میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ایک

آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
''شکیل......!''
جانی پہچانی آواز تھی، میں نے گھوم کر دیکھا تو دیان سامنے سے چلا آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔
''تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟''
''میں......'' میں بولتے بولتے رک گیا۔
''میں یہاں شالا سے ملنے آیا تھا۔''
''تو پھر......؟ ملاقات ہوگئی؟'' اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔
مجھے غصہ آگیا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو۔
''دیکھو دیان...... تم چاہے کتنی ہی حقیقت مجھ سے چھپاؤ...... لیکن مجھے ساری باتوں کا علم ہے...... میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہوگے۔''
''میں قسم کھاتا ہوں کہ اس قدر عقل مند ہرگز نہیں ہوں......'' دیان نے جیسے پرخلوص لہجے میں کہا۔
''تم ساری بات کھل کر مجھے بتادو۔''
''شالا نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے......'' میں نے کہا۔
''اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم ساری باتوں سے واقف ہو۔''
''چلو میں نے مان لیا......'' دیان نے طویل سانس لی۔
''لیکن میں تمہاری شالا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟''
''اسی خیمے میں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''جہاں تم لوگوں نے اسے رکھ چھوڑا ہے۔''
''یار...... تم مجھے ابھی اس سے ملاؤ۔'' دیان جھلاہٹ کے عالم میں بولا۔
''میں اس سے خود ہی بات کرلوں گا۔''
''میں تمہیں اس سے ملاؤں؟''
''ہاں......''

''چلو پھر......'' میں کچھ سوچ کر بولا۔
دیان کو ساتھ لے کر میں خیمے والی جگہ کی طرف چل پڑا۔ دیان میرے ہم قدم چل رہا تھا۔
لیکن پھر ہم دونوں ہی ٹھٹک کر رک گئے۔ اچانک ہی ایک درخت کی آڑ سے کالے رنگ کا ایک خوف ناک اور بھاری بھرکم کتا برآمد ہوا تھا
اس کا رخ ہماری طرف ہی تھا، وہ آگے نہیں بڑھا تھا...... لیکن خون خوار انداز میں ہمیں دیکھ رہا تھا۔
''یہ کتا کہاں سے آگیا......؟'' دیان بڑبڑایا۔
''یہ تو ہے بھی بہت خطرناک۔''
دفعتاً کتے نے زوردار آواز میں بھونکنا شروع کردیا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکنا چاہتا ہو۔
''یہ کیا مصیبت ہے؟'' میں پریشان ہوگیا۔
''واقعی......'' دیان نے کہا۔
''ہے تو یہ مصیبت ہی۔''
''میں نے کبھی اس جنگل میں اسے دیکھا نہیں ہے۔''
''چلو پھر......'' مجھے اب گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔
''میں تمہیں کسی اور دن شالا سے ملوادوں گا۔''
دیان خاموش تھا، پھر ہم دونوں ہی واپس پلٹ گئے تھے۔

☆......☆......☆

گھر پہنچا تو رحیم بابا میرے منتظر تھے، اماں جی نے انہیں ایک کمرے میں بیٹھا دیا تھا۔
مجھے دیکھتے ہی وہ بول اٹھے۔
''ارے بھئی شکیل میاں...... تم کہاں...... ہو؟''
''جی......! میں ذرا کام سے گیا تھا......'' میں نے گول مول جواب دیا۔
''ہوں......! اور سناؤ کیا حال ہیں...... ؟ کافی دنوں بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔''
''بس میں ٹھیک ہوں......'' میں نے جواب دیا۔
''گزر رہی ہے زندگی۔''

"چلو...... اچھی بات ہے۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"ویسے میں بھی آپ کو یاد کر رہا تھا۔ میں نے دو دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا...... لیکن مجھے شک ہے کہ وہ خواب ہی تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے انہیں اس دن کی کہانی سنا دی، جب دوپہر کے وقت جان لیوا سے میری ملاقات ہوئی تھی اور پھر اس کے ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھے تھے۔ لیکن پھر وہ سب کچھ ایک خواب کی مانند رہ گیا تھا اور مجھے اماں جی نے بے ہوشی کے سے عالم میں چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

یہ سن کر رحیم بابا کے چہرے پر تفکر کے بادل چھا گئے...... پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولے۔

"ڈراوا...... صرف ڈراوا۔"

"کیا مطلب رحیم بابا......؟"

"مطلب یہ ہے کہ وہ شے تمہیں صرف ڈرا رہی ہے...... اور...... اگر تم اس سے ڈر گئے تو اس کی جیت ہو جائے گی۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"میں نے حساب کتاب لگایا ہے۔" رحیم بابا نے کہا۔

"اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ شے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ تم اپنے باپ دادا کی طرح کالے اور گندے علم سے پاک ہو۔"

"اگر یہ بات ہے، تو میری بہنوں نے کیا قصور کیا تھا......؟" میں نے جرح کی۔

"وہ بے چاریاں کون سا علم جانتی تھیں......؟"

"اس وقت تمہارا باپ زندہ تھا۔" وہ بولے۔

"اور گندے علم کے اثرات تمہارے پورے گھر پر موجود تھے۔ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ہی وہ اثرات ختم ہو گئے تھے۔ اسی لئے اب وہ شے تمہیں جانی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

"لیکن وہ مجھے کسی وقت بھی دھمکا سکتی ہے...... ڈرا سکتی ہے۔" میں نے تڑپ سے کہا۔

"اور میں بے بسی سے اس کا تماشہ بنا رہوں گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" رحیم بابا نے اعتماد سے کہا۔

"میرا ہاتھ تمہارے سر پر ہے۔ اور میں تمہیں اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ سن کر میرا دل بھر آیا...... ضبط کا بندھن ٹوٹا اور میری آنکھیں بھرا گئیں یہ دیکھ کر رحیم بابا اٹھے اور مجھے اپنے سینے سے لگا کر بولے۔

"میرے بچے رو کیوں رہے ہو......؟ یہ بات غلط ہے۔"

"کیا کروں رحیم بابا...... میں تو اب ایک نئی اور اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ لیکن اپنے مقدر سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تم فکر مت کرو...... خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس وقت میرے دل نے چاہا کہ میں انہیں شالا کے متعلق بھی بتا دوں۔ کیونکہ اب وہ میری زندگی کی نوید بن چکی تھی۔

مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"کیا ہوا......؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں......" میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"دراصل مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے......" وہ مسکرائے۔

"کون ہے وہ......؟ کہاں رہتی ہے۔"

"یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے......" میں نے سر کھجایا۔

"میری محبت کی داستان بھی میری زندگی کی طرح عجیب و غریب ہے۔"

"اچھا......" انہوں نے کہا۔

"تم مجھے ضرور بتاؤ...... میں سمجھ جاؤں گا۔"

اب میں نے انہیں شالا کے متعلق بتا دیا، وہ غور سے سن رہے تھے، کئی جگہ انہوں نے مجھے روکا بھی تھا، اور کچھ سوالات بھی کئے تھے۔

جب میں خاموش ہوا تو وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے، میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا پھر انہوں نے ایک طویل سانس لی اور بولے۔

"تم اس سے ملنے کب جاؤ گے؟"

"اس نے مجھے کل رات میں بلایا ہے۔"

"اچھا......" انہوں نے سر ہلایا۔

"تو پھر ایک کام کرو۔"

"جی بولیں۔"

"تم وہاں اکیلے نہیں جاؤ گے۔" انہوں نے کہا۔

"میں بھی وہاں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"آپ...... لیکن......!" میں بولتے بولتے رک گیا۔

"تم فکر مت کرو...... میں تم سے فاصلے پر موجود رہوں گا۔ دراصل رات میں جنگل کا تنہا سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ میری موجودگی تمہارے لئے مناسب رہے گی...... میں دور کھڑا رہوں گا، جب تم اس سے ملاقات کرلو گے تو میرے ساتھ واپس چلے آنا...... کیا خیال ہے؟"

"لیکن آپ کو میری وجہ سے زحمت ہوگی......"

"اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"دراصل میں تمہیں اکیلا نہیں بھیجنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر کسی سوچ میں گم ہوگئے تھے۔

☆......☆......☆

یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ چودھویں کی رات تھی۔ چاند اپنی آب وتاب پر تھا اور میں صحن میں کھڑا ہوا رحیم بابا کا انتظار کررہا تھا۔ آج انہوں نے میرے ساتھ جنگل میں چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور مجھے شالا نے رات میں ہی وہاں بلایا تھا۔

اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ رحیم بابا نے بالکل درست فیصلہ کیا تھا، میں نے جذبات میں آکر شالا سے وعدہ تو کرلیا تھا، لیکن رات کے وقت جنگل میں جانا کافی دل گردے کا کام تھا...... مجھے اس بات پر حیرت بھی ہورہی تھی کہ اس وقت شالا وہاں کیسے پہنچ سکے گی۔

بہرحال وہاں جانا ضروری تھا...... اور میں رحیم بابا کا منتظر تھا...... وعدے کے مطابق تو انہیں آنے میں دیر ہوچکی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نہ آسکیں...... اس صورت میں مجھے تنہا جانا پڑتا...... اور شالا کی خاطر شاید میں یہ ہمت کر ہی بیٹھتا۔

آخرکار دروازے پر دستک ہوئی اور میں جلدی سے آگے بڑھا۔ اماں جی سوچکی تھیں...... اور ان کی اسی غفلت میں ہمیں اپنا کام پورا کرنا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی رحیم بابا کی شکل دکھائی دی۔

"کیا تم تیار ہو......؟" انہوں نے فوراً ہی پوچھا۔

"جی......!"

"چلو پھر......" وہ بولے۔

"تمہاری والدہ سو رہی ہیں؟"

"جی ہاں......"

"یہ بہتر ہے۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"مجھے امید ہے کہ جلد ہماری واپسی ہوجائے گی۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

"اور میں بھی۔" رحیم بابا عجیب سے انداز میں مسکرائے جسے میں کوئی معنی پہنانے سے قاصر رہا۔

"آپ کو دیر ہوگئی......" میں نے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......! مجھے تمہارے قاسم ماموں نے ایک کام کے سلسلے میں روک لیا تھا، اسی لئے میں دیر سے پہنچا۔"

"جی اچھا...... ویسے ان کا کیا حال ہے؟"

"کیا ہوگا...... اداس اداس رہتے ہیں بے چارے۔" انہوں نے بتایا۔

"یوں بھی وہ گھر میں نکلتے ہی کب ہیں۔"

"اداس تو ہوں گے ہی......" میں نے طویل سانس لی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

"ان کے ساتھ بہت ہی غلط ہوا ہے۔"

"لیکن زندگی بہت طویل ہے...... اب ان کو اپنا نیا ہم سفر چن لینا چاہئے...... آخر کب تک تنہا رہیں گے۔"

"ماں جی نے انہیں سمجھایا تھا۔" میں نے بتایا۔

"لیکن انہوں نے شاید کان نہیں دھرے۔ اب میں کسی دن انہیں ساتھ لے کر ماموں کے پاس آؤں گا، پھر وہ خود ہی ان کی خبر لیں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" رحیم بابا نے ہنس کر کہا۔

☆......☆......☆

چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ رات کا اندھیرا سناٹا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایسے میں حشرات الارض کی آوازیں گونج رہی تھیں، خاص طور پر جھینگروں کی جھائیں جھائیں عجیب سا سماں پیدا کررہی تھیں۔

میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور اس کی روشنی میں رحیم بابا میرے ساتھ ساتھ تھے۔ ایسے میں مجھے اس کتے کا خیال آیا، جس سے گزشتہ روز "ملاقات" ہوئی تھی۔

میں نے رحیم بابا سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے۔

"وہ اس وقت نہیں ملے گا...... تم پرواہ مت کرو۔"

میں ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا...... وہ اتنے یقین سے کہہ رہے تھے جیسے اسے اچھی طرح جانتے ہوں۔

ان سے دوبارہ استفسار کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، میں محسوس کررہا تھا کہ وہ اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔

واقعی دور دور تک کسی کتے یا اور کسی جانور کا وجود دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخرکار میں رحیم بابا کو اس جگہ لے آیا، جہاں درختوں کے دوسری طرف شالا کا خیمہ نصب تھا۔

میں رکا اور رحیم بابا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"منزل آگئی ہے رحیم بابا......"

"اچھا......" انہوں نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے...... تم جاؤ...... میں یہاں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

"آپ یہ ٹارچ رکھ لیں۔"

"نہیں اسے ساتھ لے جاؤ......" وہ بولے۔

"میں اندھیرے میں بھی آسانی سے دیکھ سکتا ہوں...... اب جاؤ۔"

میں نے ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ سامنے شالا کا خیمہ اپنی جگہ پر موجود تھا، اور اس سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔

میں خیمے کے قریب آ گیا، دروازے کی صورت میں ملتے ہوئے پردے سے ہی شالا کا وجود کسی سائے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

شاید اندر کیروسین لیمپ روشن تھا۔ میں نے آواز لگائی۔

"شالا...... میں آ گیا ہوں......"

فوراً ہی شالا کا وجود متحرک ہوا اور اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"اندر آ جاؤ شکیل۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا...... ایک طرف واقعی کیروسین لیمپ روشن تھا اور پیال پر شالا سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔

میری طرف دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"مجھے ڈر لگ رہا تھا...... اس لئے اٹھ کر تمہارا استقبال نہیں کرسکی...... میں معافی چاہتی ہوں۔"

"یہ تو حقیقت ہے......" میں نے سر ہلایا۔

"رات کے اس پہر تمہاری یہاں موجودگی واقعی بہت دل گردے کا کام ہے۔"

"میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔" وہ دوزانوں ہو کر بیٹھ گئی۔

"آؤ...... میرے قریب آ جاؤ۔" میں تم سے مل کر سارے غم بھلا دینا چاہتی ہوں۔"

میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا...... لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی حسین دکھائی دے رہا تھا...... ماتھے پر امڈ کر آنے والی زلفوں نے گویا قیامت ڈھا دی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اٹھایا اور میرے ہاتھ

پر رکھ دیا...... دونوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ مخمور سے لہجے میں بولی۔

"میں...... میں اپنی محبت کا اقرار کرتی ہوں...... میں ساری زندگی تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

"سچ......" میں محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"ہاں...... بالکل سچ......" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو پھر...... میں تمہیں اپنی ماں سے کب ملواؤں؟"

یہ سن کر وہ سوچ میں ڈوب گئی، پھر آہستہ سے بولی۔

"میں جھوٹ بولوں یا سچ؟"

"کیا مطلب......؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیسا جھوٹ اور کیسا سچ......؟"

"جھوٹ یہ ہے کہ تم مجھے اپنی ماں سے ملوا دو......" وہ پھر مسکرائی۔

"اور سچ...... اس سے ذرا مختلف ہے۔"

"سچ کیا ہے؟" میں نے غور سے اسے دیکھا۔

"کیا تم میری ماں سے ملنا نہیں چاہتیں؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے......" وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"تم غلط سوچ رہے ہو۔"

"تو پھر...... سچ کیا ہے؟"

"سچ......!" اس نے ایک طویل سانس لی۔

"سچ یہ ہے کہ...... میں تمہاری ماں سے مل چکی ہوں۔"

"مل چکی ہوں...... کب......؟" میں حیرت کا بت بن گیا۔

یہ بات تو اس نے بے حد عجیب کہی تھی...... میں تو ابھی تک اسے اپنے گھر بھی لے کر نہیں گیا تھا، اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔

"ہاں...... مل چکی ہوں...... بلکہ کئی بار مل چکی ہوں......" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"آخر کیسے......؟" میں چیخ اٹھا۔

"ت...... تم انہیں کیسے جانتی ہو......؟"

میری جھلاہٹ سے گویا وہ محظوظ ہو رہی تھی، کیونکہ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

پھر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرنے لگے۔ میں انہیں کوئی معنی پہنانے سے قاصر تھا۔ دل نہ جانے کیوں گھبرانے سا لگا تھا۔

ایک بار پھر شالا کے ہونٹ ہلے، لیکن یہ آواز شالا کی تو نہیں تھی...... یہ تو...... بھاری اور مردانہ آواز تھی۔

"میں تمہاری ماں سے بھی واقف ہوں...... اور تمہارے مرے ہوئے باپ سے بھی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا، میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے شالا کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت خیمے کا پردہ ہٹا اور رحیم بابا کی آواز خیمے میں گونجی۔

"بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی جان لیوا...... یہ بھی بتاؤ کہ تم اس کے باپ کے باپ کو بھی جانتے ہو...... کیونکہ تم شاقال قبیلے کے دشمن ہو، اور تم نے ہی ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

میری توجہ شالا سے ہٹ کر رحیم بابا پر مرکوز ہو گئی...... میں جلدی سے پلٹا اور ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔

یہ حقیقت تھی کہ میں شالا سے خوف محسوس کر رہا تھا...... رحیم بابا اب خاموش ہو چکے تھے۔

میں دوبارہ پلٹا تو شالا اپنی جگہ سے غائب تھی۔

خالی پیالہ میرے سامنے تھا، شالا کا وجود اس طرح غائب تھا، جیسے میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہو۔

میں سناٹے میں آ گیا، اسی وقت رحیم بابا بولے۔

"چلو شکیل بیٹا...... کھیل ختم ہو گیا...... آؤ...... گھر چلیں۔"

"یہ...... یہ سب کیا تھا......" میرے منہ سے نکلا۔
"یہ سب اسی جان لیوا کا کیا دھرا تھا......" رحیم بابا نے کہا۔
"اس نے تمہیں شالا کا روپ دھار کر بے وقوف بنایا تھا۔"
"یعنی...... یعنی...... شالا کا کوئی وجود ہی نہیں تھا؟" میری حالت قابل دید تھی۔
مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں جان ہی باقی نہ رہی ہو...... میں تو شالا کے خواب دیکھنے لگا تھا...... اپنے دل میں اس کے لئے ارمانوں کا تاج محل بنا لیا تھا...... لیکن یہ تاج محل چند لمحوں میں ہی مٹی کے تودے کی طرح زمین بوس ہو گیا تھا۔
اسی وقت کیروسین لیمپ خود بخود بجھ گیا اور خیمے کے اندر اندھیرا چھا گیا۔
"ٹارچ نکالو شکیل......"
"آں...... ہاں......" میں خیالوں سے چونک کر بولا۔
پھر میں نے ٹارچ نکال کر روشن کرلی...... رحیم بابا نے کہا۔
"اب نکلو یہاں سے گھر چلو......"
میں ان کے ساتھ خیمے سے باہر نکل آیا تھوڑی دور چلنے کے بعد رحیم بابا نے آہستہ سے کہا۔
"پرسوں دوپہر میں جس کتے نے تمہارا راستہ روکا تھا...... وہ بھی جان لیوا کا ہی روپ تھا...... تاکہ تم دیان کو خیمہ نہ دکھا سکو۔"
"اوہ......" میرے منہ سے نکلا۔
دس منٹ بعد میں اور رحیم بابا گھر میں خاموشی سے بیٹھے ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔
میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے، لیکن رحیم بابا کو کسی گہری سوچ میں گم دیکھ کر میں خاموش ہی رہا۔
تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی مجھ سے مخاطب ہوئے۔
"شکیل بیٹا...... جب تم نے اس لڑکی کی کہانی سنائی تھی تو میں اسی وقت جان لیوا کی اس چال کو سمجھ چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہارے ساتھ جنگل میں چلنے کا ارادہ کیا۔"
"اگر آپ نہ ہوتے تو شاید آج میری زندگی کا آخری دن ثابت ہوتا......" میں کانپ اٹھا۔
"نہیں......!" رحیم بابا بولے۔
"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔"
"جی...... کیا مطلب......؟"
"ہاں...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔
"اگر تمہیں کچھ ہوتا تو خود اپنی ہی وجہ سے ہوتا۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"میں سمجھاتا ہوں......" انہوں نے سر ہلایا۔
"دراصل جان لیوا کسی وہم کی طرح ہے۔ اس نے تمہیں اس ویرانے میں آنے پر آمادہ کرنے کے لئے اتنا لمبا چوڑا چکر چلایا تھا کیونکہ جب اس ماحول میں وہ شالا سے تبدیل ہو کر اپنے اصل روپ میں آتا تو پھر تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا اس کے ذمہ دار تم خود ہوتے...... اگر تم ڈر جاتے تو تمہارے دل کی دھڑکن خوف کے مارے بند ہو سکتی تھی...... اور اگر تم دلیری سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے، تو وہ اسی طرح غائب ہو جاتا، جس طرح میرے خیمے کے اندر آنے کے بعد غائب ہوا تھا۔"
"اوہ...... تو یہ بات ہے......" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔
"اب میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔"
"وہ تمہارا ابھی دشمن ضرور ہوگا...... وہ تمہیں بھی ختم کرنا چاہتا ہوگا...... کیونکہ اب تم ہی اپنے خاندان کے واحد ایسے فرد بچے ہو جو شاقال قبیلے کی نسل کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہارے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا...... اور شاقال قبیلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا لیکن جان لیوا تم پر براہ راست حملہ نہیں کر سکتا۔"
"اس کی وجہ......؟" میں پوچھ بیٹھا۔
یہ سن کر رحیم بابا مسکرائے اور بولے۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اب نوری علم کے زیر سایہ ہو...... کالے علم کے اثرات تمہارے باپ کے ساتھ ہی دفن ہوگئے۔"

"میں اب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اور اب میں...... جان لیوا کے مقابل آنا چاہتا ہوں۔"

"جان لیوا کے مقابل......؟" رحیم بابا نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"ہاں رحیم بابا......" میرے لہجے میں عزم تھا۔

"میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ اب یا تو خود مرجاؤں گا، یا پھر مارڈالوں گا۔ اس کے لئے یہ نئے نئے پینترے اب میرے لئے ناقابل برداشت ہوچکے ہیں...... اگر آج آپ نہ ہوتے تو میرا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ اس نے شالا کے فرضی وجود میں خود کو ڈھال کر میرے دل کو دھوکا دیا ہے آپ یقین کریں کہ میں شالا سے مل کر اپنے سارے غم بھلا بیٹھا تھا...... میں اس سے شادی کرکے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا...... لیکن...... اس نئی زندگی کا خواب میرے لئے دھوکا تھا...... فریب تھا۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو......؟"

"مجھے جان لیوا سے مقابلہ کرنا ہے......" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"یا تو میں مارڈالوں گا یا مرجاؤں گا۔"

یہ سن کر رحیم بابا کچھ سوچنے لگے، پھر بولے۔

"سوچ لو...... یہ اتنا آسان نہیں ہے، تمہیں مشکلات کے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ قدم قدم پر تمہیں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اور مقابلے کے لئے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔"

"مشکلات تو اب بھی میرا دامن پکڑے ہوئے ہیں رحیم بابا۔" میرا لہجہ شکایت بھرا تھا۔

"ایک بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔"

"کیا بات ہے...... بتاؤ۔"

"میں نے انہیں کرائے داروں کے متعلق بتادیا

وہ خاموشی سے سنتے رہے اور سر ہلا کر بولے۔

"میں سمجھ گیا ہوں...... خیر...... انہیں جانے دو۔"

"لیکن رحیم بابا...... اس طرح تو ہم بھوکے مرجائیں گے۔" میں نے کہا۔

"اس طرح کے حالات رہے تو جلد ہی دنیا سے رخت سفر باندھ لیں گے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا...... کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا...... ان لوگوں کے جانے کے بعد اسے پھر کرائے پر اٹھادیں گے۔"

"لیکن وہ بھی نہ رہ سکیں گے......" میرا لہجہ زہرخند تھا۔

"یہ جان لیوا ہماری بے بسی کا تماشہ دیکھنا چاہتا ہے، کرائے داروں کو بھگانے میں ضرور اسی کا ہاتھ ہے۔"

"ہاں...... میں جانتا ہوں......" رحیم بابا بولے۔

"تو پھر...... میں اب آر یا پار کرنا چاہتا ہوں۔" میں زچ ہوکر بولا۔

"میں ڈٹ کر اس کا مقابلہ کروں گا۔"

"یہ بہت مشکل ہے بیٹا......" وہ بولے۔

"تم کہہ تو رہے ہو، لیکن...... عمل کے میدان میں اترنے کے لئے تمہیں بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔"

"میں تیار ہوں......" میرا جواب تھا۔

"آپ یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"بتادوں گا۔" انہوں نے کہا۔

"حویلی کا وہ حصہ خالی ہونے دو...... میں وہیں تمہیں بتادوں گا کہ کیا کرنا ہے...... تم اپنے اخراجات کی پرواہ مت کرو...... یوں سمجھو کہ میں تمہاری حویلی کا وہ حصہ کرائے پر لے رہا ہوں۔"

"لیکن...... آپ یہ سب کیسے کریں گے؟"

"یہ میں اسی وقت بتاؤں گا جب تمہارے کرائے دار مکان خالی کردیں گے۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"کیونکہ مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی رہنا پڑے

گا۔ اب میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ جان لیوا حد سے گزر رہا ہے...... اور اب اسے انجام سے دوچار کرنا بہت ضروری ہے۔“

☆......☆......☆

اور پھر کرائے داروں نے حویلی کا حصہ خالی کیا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

ان کے جاتے ہی اماں جی کے چہرے پر اداسی پھیل گئی...... میں ان کی دلی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا، چنانچہ میں نے انہیں دلاسہ دیا۔

”اماں جی...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے دوسرا کرائے دار فوری طور پر ڈھونڈ لیا ہے۔“

”کیا واقعی......؟“ انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”ہاں......“ میں نے کہا۔

”آپ بالکل فکر مت کریں۔“

”اچھا......! وہ کون لوگ ہیں......؟“

”کل آئیں گے...... میں آپ سے ملوا دوں گا۔“

”کیا تمہارے جاننے والے ہیں......؟“

”جی ہاں...... بہت قریبی......“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”اماں جی...... ایک بات کہوں......؟“

”ہاں بیٹا...... بولو۔“

”دراصل بات یہ ہے کہ جب تک ہم لوگ دشمن کی زد میں ہیں اور وہ ہماری تاک میں ہے تو ہم اسی طرح پریشان رہیں گے ہمارے یہ مسئلے اس وقت حل ہوں گے جب ہم مضبوط ہوں اور دشمن کمزور۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”دشمن......؟“

”ہاں......“ میں سنجیدگی سے بولا۔

”میرے خاندان کو مٹی میں ملا دینے والا ابھی آرام سے نہیں بیٹھا...... اس نے میرے باپ کے ذریعے میری بہنوں کو ہلاک کروایا اور پھر تمہارے ہاتھوں اباجی کو بھی انجام سے دوچار کر دیا۔“

”تم نے...... تم نے پھر وہی بات کی......؟“

”ہاں...... میں یہی بات کہوں گا......“ میرا لہجہ تیز تھا۔

”کیونکہ میں اس قتل کا چشم دید گواہ ہوں...... آپ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھیں...... اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ شے آپ پر حاوی تھی...... خیر...... آپ اس بات کو مانو یہ نہ مانو...... لیکن اب وہ مجھ پر اپنے داؤ آزما رہا ہے...... کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن آپ مجھ سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔“

”ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو......“ وہ بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

”خاموش ہو جاؤ۔“

”خاموش ہونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، ماں جی۔“ میں طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”وہ ایک دن کاری وار کرے گا اور......“

”دیکھ لو...... آپ کے اندر سننے کی سکت نہیں ہے، تو ہوتے ہوئے کیسے دیکھو گی...... اس لئے اپنے دل کو مضبوط کرو اور غور سے میری بات سنو...... رحیم بابا بہت اچھے انسان ہیں، بلکہ انہیں فرشتہ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ وہی اب ہمارا گھر کرائے پر لے رہے ہیں اور وہ مجھے جان لیوا سے مقابلہ کے قابل بنائیں گے۔“

”رحیم بابا......؟“

”ہاں......“ میں نے سر ہلایا۔

”اب وہی اس معاملے میں میری مدد کریں گے۔ اور میں اس میدان میں آترنے سے پہلے آپ کی رضا مندی چاہتا ہوں۔ کیونکہ چوہے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ شیر کی طرح مقابلہ کیا جائے۔“

یہ سن کر اماں جی کسی سوچ میں ڈوب گئیں پھر کافی دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا اور پرعزم لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہے...... میں تمہیں اجازت دیتی ہوں۔ تم اس کا مقابلہ کرو اور اسے نیست و نابود کر دو۔“

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

☆......☆......☆

رحیم بابا کے آنے سے ہمارے گھر میں رونق سی آ گئی تھی، انہوں نے اماں جی کے ہاتھ میں جب ایڈوانس کی رقم رکھنی چاہی تو وہ فوراً بولیں۔

"میں یہ ہرگز نہیں لوں گی کیونکہ یہ آپ ہی کا گھر ہے اور آپ میرے بھائی ہیں......"

"جب بھائی کہہ دیا تو یہ بہن کا حق ہے، جو میں دے رہا ہوں۔" رحیم بابا بولے۔

"میں نے قاسم میاں کے یہاں جب سے نوکری کی ہے، میری تنخواہ میرے پاس جمع ہوتی رہی، کیونکہ میرا ہے کون کہ جس پر میں خرچ کرتا...... اب تو موقع ہاتھ لگا ہے کہ میں اس رقم کو کسی کام میں لاسکوں...... ورنہ میرے لئے تو اتنی رقم کافی ہے کہ میرا کفن آ جائے۔ اور مجھے اب کیا کرنا ہے۔"

"خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ ایسی باتیں نہ کریں۔"

"مرنا تو ہے ایک دن...... اور یوں بھی موت کو یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے خیر...... ابھی آپ یہ رکھ لو بہن...... اور میں ماہانہ کرایہ بھی دوں گا میں یہاں رات میں آیا کروں گا، کیونکہ دن میں قاسم میاں کے گھر کا کام سنبھالنا ہے......"

یہ کہہ کر انہوں نے اچھی خاصی رقم زبردستی اماں جی کے ہاتھ پر رکھ دی مکان خالی ہو چکا تھا، چنانچہ وہ میرے ساتھ اسی حصے میں آ گئے...... اور ہال نما کمرے میں پہنچ کر بولے۔

"بس...... یہ کمرہ ہی ہمارے کام کا ہے...... یہیں سے ہمارے مشن کا آغاز ہوگا۔ اور مجھے امید ہے کہ جلد ہی جان لیوا سے آمنا سامنا ہو جائے گا۔"

"کتنی جلدی ممکن ہے رحیم بابا......؟"

"جتنی جلدی تم...... عملیات پر عبور حاصل کر لوگے...... کیونکہ صرف عملیات ہی کے ذریعے اسے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔"

اور پھر...... میں نے عملیات کی دنیا میں قدم رکھ دیا...... رحیم بابا کسی ڈیوٹی کی طرح اپنی آمد و رفت نبھا رہے تھے...... دن بھر قاسم ماموں کے گھر میں رہتے اور رات کے وقت حویلی آ جاتے۔

میں ابتدائی عملیات سے گزر رہا تھا...... رحیم بابا میرا ذہن اس طرف مائل اور مرکوز ہونے کے طریقے استعمال کر رہے تھے۔

لیکن یہ سب کچھ خیر کے نسخے تھے، یعنی شر سے ٹکر لینے کے لئے خیر کی پرورش ہو رہی تھی۔

مجھے آج بھی یاد تھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں میرے باپ کی جان گئی تھی اور جس نے ان کی جان لی تھی میں اب خود اس کی جان کے درپے تھا۔

مختلف عملوں کے ساتھ ساتھ رحیم بابا خود اعتمادی پر بھی بے تحاشہ زور دیتے تھے...... اور پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔

"اب تم تیار ہو جاؤ...... آج رات میں تمہیں ایک اہم چلہ بتاؤں گا...... اور اسے تم لگاتار تین دن تک کرتے رہو گے...... اس کے بعد تم میرے ساتھ قبرستان چلو گے جہاں تم نے آخری چلہ کاٹنا ہے۔"

"قبرستان میں......؟"

"ہاں......!" انہوں نے گردن ہلائی۔

"اس کے بارے میں وہیں بات ہوگی...... بہرحال آج رات سے تمہارا مقابلہ شروع ہو جائے گا۔"

رحیم بابا چلے گئے، اور میں سوچ میں ڈوب گیا...... میں جس راستے پر چل نکلا تھا، اس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میرا باپ بھی عملیات کا ماہر تھا، لیکن اس کی وقتی محبت اور شفقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اس حصے میں چلا آیا تھا، ورنہ ذاتی طور پر مجھے ان سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن آج میں اسی حصے میں بیٹھ کر رحیم بابا سے عملیات سیکھ رہا تھا......

رحیم بابا کو گئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اماں جی آ گئیں۔

مجھے ان کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے، وہ

مجھے خون خوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں، پھر اچانک ہی مجھ پر برس پڑیں۔

"میں نے تجھے منع کیا تھا نا کہ اپنے باپ کے نقش قدم پر مت چلنا...... لیکن تو نے میری ایک نہ سنی...... اب تو زندگی بھر مجھ سے بات نہ کرنا...... ہاں۔!"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"لیکن اماں جی...... میں تو آج کی اجازت سے یہ کام کر رہا ہوں...... میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔"

"ہاں...... میں جانتی ہوں...... تم نے مجھے بتایا تھا......" وہ قدرے نرم ہو گئیں۔

"لیکن میں اس وقت شاید ہوش میں نہ ہوں گی...... اب میں اپنے ہوش و حواس میں تمہیں حکم دے رہی ہوں کہ تم ان چیزوں سے دور رہو...... کیا تم نے اپنے باپ کا انجام نہیں دیکھا تھا......؟ کیا تم وہ سب کچھ بھول گئے......؟"

"نہیں...... اماں جی...... مجھے سب کچھ یاد ہے...... اور ان ہی یادوں نے مجھے اس بات پر مجبور کیا ہے کہ میں اس راستے پر چلوں۔"

"چھوڑ دو یہ راستہ......" انہوں نے سخت لہجے میں تنبیہ کی۔

"اور رحیم بابا کو بھی بھگاؤ یہاں سے۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں اور میں انہیں تکتا رہ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں خود بھی اماں جی والے حصے میں چلا آیا تھا، لیکن خلاف توقع ان کا موڈ نارمل تھا جب انہوں نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا تو میں سمجھ گیا کہ یہ اسی "جسم بے وجود" کی کارستانی رہی ہوگی۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں کھانا کھاتے ہی گھر سے باہر نکل گیا...... سدو سے بھی کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

چنانچہ اس کی طرف جا نکلا...... سدو نے مجھے دیکھتے ہی شکایتوں کے ٹوکرے کھول دیئے۔

"بیٹا...... اتنے دنوں بعد شکل دکھا رہے ہو...... میں تو خود تمہارا امتحان لے رہا تھا...... محبت کیا ہوئی تم نے تو اپنے دوست کو بھی بھلا دیا...... ہاں بھئی۔"

"ارے کیسی محبت کہاں کی محبت......" میں نے سر جھٹکا۔

"شالا میرے لئے صرف اور صرف ایک ڈراؤنا خواب تھا۔"

"کیا مطلب......؟ میں سمجھا نہیں۔" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں سمجھا بھی نہیں سکتا......" میں نے ایک طویل سانس لی، پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"میں شالا کو بھلا چکا ہوں، تم بھی بھول جاؤ...... وہ صرف ایک دھوکا تھا فریب تھا۔"

"کیا بات کر رہے ہو یار...... ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وہ دراصل ایک بدروح تھی......" میں سنجیدگی سے بولا۔

"بدروح......؟"

"ہاں...... میں جس سے ملا تھا، اس لڑکی کا اصل وجود تو کئی سال پہلے دنیا سے ہی رخصت ہو چکا تھا...... اس بدروح نے اسی لڑکی کا روپ دھار لیا تھا۔"

"کیوں ڈرا رہے ہو مجھے......" وہ ہچکچا کر بولا۔

"تم تو اس کی محبت میں دیوانے ہو چکے تھے، پھر یہ راز کیسے کھلا؟"

"مجھے دیان نے بتایا تھا کہ وہ لڑکی مر چکی ہے۔"

"کیا تم مذاق کر رہے ہو......؟"

"کیا تم کو ہنسی آ رہی ہے......؟" میں نے اسے گھورا۔

"میں دیان سے پوچھوں......؟"

"نہیں...... بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کہانی کو دفن کر دو...... اب کوئی اور بات کرو......!"

"اچھا...... یہ بتاؤ کہ اگر شالا نہیں ملی تو پھر تم کہاں غائب تھے؟"

"اسی کے غم میں پڑا ہوا تھا۔ تمہیں توفیق نہیں ہوئی

کہ تم خود آ کر میرا حال چال پوچھ لیتے؟"

"میں نے سوچا کہ رنگ میں بھنگ کیوں ڈالوں جب عشق کا بھوت اترے گا تو خود ہی تمہیں میری یاد ستائے گی۔"

"وہ واقعی بھوت تھا......"میں نے ایک طویل سانس لی۔

"لیکن عشق کا نہیں بلکہ......حقیقی بھوت۔"

☆......☆......☆

رحیم بابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق میں نے چھری پر پھونک مار کر اپنے گرد حصار کھینچنا شروع کردیا۔

میں اس وقت کمرے کے عین وسط میں موجود تھا اور میرا منہ دروازے کے رخ پر تھا...... اسی کمرے کے ایک کونے میں رحیم بابا آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔

یہ حصار دراصل میرے اپنے گرد کا حفاظتی حصار تھا......رحیم بابا نے مجھے عمل شروع کروانے سے پہلے بہت کچھ سمجھایا تھا اور پھر آخر میں کہا۔

"کچھ بھی ہوجائے، لیکن تمہیں اس دائرے سے باہر نہیں نکلنا...... خود میں بھی اگر تمہارے سامنے دم توڑ رہا ہوں، تو بالکل پرواہ مت کرنا...... کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں اس عمل سے روکا جائے گا...... یہ عمل تمہیں یہاں تین دن مسلسل کرنا ہے اور پھر ایک آخری مرحلہ ہوگا جو کافی کٹھن ثابت ہوگا۔"

"اس میں کیا کرنا ہوگا رحیم بابا......؟" میں قدرے پریشان ہوگیا۔

"وقت آنے پر بتاؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

"ابھی جو عمل تم حصار کھینچ کر کرنے والے ہو...... یہ بھی اتنا آسان نہیں ہے......اس کے دوران تمہیں کچھ ایسی چیزیں نظر آسکتی ہیں، جو تمہیں ڈرا کر، یا پھر پریشان کرکے اس عمل سے روکنے کی بھرپور کوشش کریں گی...... لیکن تم نے کسی بات کا کوئی اثر نہیں لینا...... جو کچھ بھی ہوتا رہے...... تمہارا دھیان صرف اپنے ورد پر ہونا چاہیے۔"

"جی......میں اپنی پوری کوشش کروں گا......" میرا لہجہ مضبوط تھا۔

"کیونکہ میں نے اپنے دل سے ڈر نکال دیا ہے میں اب جان لیوا کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔"

"شاباش...... مجھے تم سے یہی امید ہے۔" وہ بولے۔

"بارہ بجنے میں صرف تھوڑی دیر باقی ہے جیسے ہی میں اشارہ کروں، تم عمل شروع کردینا۔"

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی میں نے رحیم بابا کا بتایا ہوا ورد لبوں پر جاری کرلیا۔

ابھی مجھے پڑھتے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ میرا حلق خشک ہونے لگا۔ اچانک ہی شدید قسم کی پیاس کے احساس نے مجھے تنگ کرنا شروع کردیا۔

اب کیا کروں...... میرا ذہن بھٹکنے لگا...... لیکن اس عمل کو ابھی کئی گھنٹے جاری رکھنا تھا اور اس پیاس کے ہاتھوں مجھے کچھ دیر بھی ورد کرنا بھاری لگ رہا تھا...... میں نے خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش صرف کردی...... ممکن تھا کہ اس عمل کی بدولت ہی میرا یہ حال ہو رہا ہو...... چنانچہ میں نے حلق میں پڑنے والے کانٹوں کی طرف سے اپنا ذہن یکسر ہٹالیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ حیرت انگیز طور پر میری پیاس کی شدت خود بہ خود کم ہوتی چلی گئی میں کافی حیران تھا۔

ایک بار پھر میں ذہنی یکسوئی کے ساتھ عمل میں مصروف ہوگیا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ پیاس عمل کی تکمیل میں پہلی رکاوٹ تھی...... جسے میں نے قدرے مشکل سے دور کرلیا تھا۔

میں پڑھ رہا تھا...... مسلسل پڑھتا جا رہا تھا...... میں کبھی آنکھیں کھول لیتا اور کبھی بند کرلیتا...... کئی بار نیند نے بھی مجھ پر حملہ کیا، لیکن میں نے کمال ضبط سے اسے بھی خود سے دور بھگا دیا۔

ہر تھوڑی دیر بعد مجھے پیاس کی شدت اس طرح محسوس ہونے لگتی تھی کہ اگر سمندر بھی سامنے ہوتو میں اسے

پی جاؤں...... لیکن میں نے اس پیاس کو مسلسل شکست دیتا رہا۔

آخرکار میں اپنا عمل مکمل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

یہ تین دن کا عمل تھا جو میں نے رحیم بابا کی نگرانی میں کامیابی سے پورا کرلیا تھا۔

چوتھے دن رحیم بابا آئے تو ان کے چہرے پر گمبھیر قسم کی سنجیدگی طاری تھی وہ مجھے کسی سوچ میں گم دکھائی دیئے تو میں پوچھ بیٹھا۔

''کیا ہوا رحیم بابا...... آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں......؟''

''نہیں......!'' وہ قدرے مسکرائے۔

''میں پریشان نہیں ہوں...... البتہ تمہارے لئے فکرمند ضرور ہوں۔''

''میرے لئے......؟''

''ہاں......؟''

''کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ جان لیوا مجھے کوئی گزند پہنچاسکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولے۔

''دیکھو...... جو اس وقت تم کررہے ہو...... وہ ایک کھلی جنگ ہے اور جنگ میں دشمن کو کمزور سمجھنا بے وقوفی ہے۔ اب تم جس اگلے عمل کا آغاز کرنے والے ہو وہ کسی حملے سے کم نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مقابل بھی وار کرسکتا ہے۔''

''اب تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے رحیم بابا......!'' میں نے طویل سانس لی۔

''اب موسلوں سے ڈرنے کا کیا فائدہ......؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو......!'' انہوں نے سرہلایا۔

''اب پیچھے ہٹنا بزدلی ہے...... گویا میدان چھوڑ کر بھاگنے کے مترادف ہے۔''

''بالکل......'' میں نے سرہلایا۔

''اس لئے آپ کسی اور طرف نہ سوچیں اور مجھے بتائیں کہ اب کیا کرنا ہوگا۔''

''اب ذرا مشکل مرحلہ ہے......'' انہوں نے اپنی سفید داڑھی میں انگلیوں سے خلال کیا۔

''ہمیں پرانے قبرستان جانا ہوگا...... جہاں متواتر چالیس دن تک تمہیں چلہ کاٹنا ہے...... اور عین ممکن ہے کہ چالیس دن سے پہلے ہی وہ تمہارے سامنے آجائے...... کیونکہ اس چلے کے مکمل ہوتے ہی میں اس سے تمہارا مقابلہ کروادوں گا اور مجھے یقین ہے کہ کامیابی سے چلہ کاٹنے کے بعد تم اسے آسانی سے زیر کرسکتے ہو۔''

''ہوں......! تو کیا ہمیں چالیس دن تک قبرستان میں ہی رہنا ہوگا۔''

''نہیں...... لیکن رات بارہ بجے سے پہلے وہاں موجود ہونا لازمی ہے...... اور پھر وہاں سے فجر کے بعد ہماری واپسی ہوگی۔'' انہوں نے بتایا۔

''اوہ......!'' میرے منہ سے نکلا۔

''تو یہ بات ہے......''

''ہاں...... اب تم کمرکس لو......'' وہ بولے۔

''کیونکہ آج تمہیں اس چلے کے بارے میں تفصیل سے بتانے کے بعد میں کل سے تمہیں وہ عمل شروع کروادوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں۔''

''شاباش......'' وہ جوش سے بولے۔

''کسی بھی موقع پر ہراساں نہ ہونا...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

☆......☆......☆

دوسرے دن رات کو میں رحیم بابا کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا، میرے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جس میں رحیم بابا کی ہدایت پر کچھ ضروری سامان رکھا گیا تھا۔

اس روانگی سے اماں جی قطعی لاعلم تھیں کیونکہ رحیم بابا نے اس سلسلے میں کافی رازداری سے کام لیا تھا، اور ماں جی کے نیند کی آغوش میں جانے کے بعد ہی ہم دونوں باہر نکلے تھے۔

وہ رات نہ جانے کچھ زیادہ ہی تاریک تھی، یا پھر مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا ویسے آسمان کافی حد تک بادلوں

سے ڈھکا ہوا تھا اور اسی وجہ سے شاید چاند کی روشنی انہی بادلوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

پرانا قبرستان یہاں سے کافی دور تھا، چنانچہ ایک رکشے میں بیٹھ کر ہم وہاں تک پہنچے تھے البتہ رحیم بابا نے تھوڑے فاصلے پر رکشہ رکوالیا تھا۔

یہ ایک نوآباد علاقہ تھا...... جہاں تعمیری کام جاری تھا اور کئی گھر ادھورے پڑے ہوئے تھے...... شاید اسی بناء پر ان میں ابھی رہائش نہیں ہوئی تھی...... یہاں لائٹ کا انتظام بھی ابھی بہتر نہیں تھا...... اس کے باوجود لوگ یہاں کافی تعداد میں آباد ہوچکے تھے...... لیکن ان کے مقابلے میں ابھی خالی مکانوں اور ادھوری ادھوری چہاردیواریوں کا تناسب زیادہ تھا...... اس علاقے سے ذرا ہی دور پرانا قبرستان موجود تھا۔

بھونکنے والے کتوں کی آوازیں گویا چاروں طرف سے گونجتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں...... لیکن رحیم بابا ان سے لاپرواہ تھے اور نپے تلے ہوئے قدموں سے اندھیرے کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

میں ان کے عقب میں چل رہا تھا...... تھوڑی دیر بعد ہی پرانا قبرستان شروع ہوچکا تھا...... کیروسین لیمپ کی روشنی میں یہ قبرستان مزید ہیبت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

کیروسین لیمپ رحیم بابا کے ہاتھ میں تھا...... اور چند لمحے پہلے ہی انہوں نے اسے روشن کیا تھا۔ کیونکہ اب چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا...... دور دور تک سوائے کتوں کی ہذیانی آوازوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

یہ وہ قبرستان تھا جسے پرانے قبرستان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا...... کیونکہ اب یہاں کافی عرصے سے کسی کو دفنایا نہیں گیا تھا...... اڑی اڑی خبر تھی کہ یہ قبرستان کچھ عرصے بعد مسمار کردیا جائے گا۔

اب میں مکمل طور پر رحیم بابا کی ہمراہی میں قبرستان کے اندر داخل ہوچکا تھا جھینگروں کی خوف ناک "جھائیں جھائیں" اب اور زیادہ گونجنے لگی تھی...... یوں لگ رہا تھا جیسے کانوں میں سوئیاں چبھ رہی ہوں۔

"کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟" دفعتاً رحیم بابا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں چونک اٹھا۔

"جی...... نہیں رحیم بابا۔"

"ہوں...... پھر اتنے خاموش کیوں ہو؟"

"ماحول کا اثر ہے جناب......" میں طویل سانس لے کر بولا۔

"چاروں طرف اس قدر سناٹا اور خاموشی ہے کہ میری زبان بھی چپ ہوگئی ہے۔"

"ہاں...... یہ بات بھی ٹھیک ہے۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"انسان پر ماحول کا بھی بہت اثر ہوتا ہے...... خیر آؤ...... اس طرف آجاؤ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہموار جگہ کی طرف اشارہ کیا جو قدرے وسیع تھی اور اس کے قریب ایک بوڑھا اور گھنا برگد کا درخت موجود تھا۔

"کیا آپ یہاں پہلے بھی آچکے ہیں......؟" میں نے چلتے چلتے پوچھا تھا۔

"ہاں...... میں یہاں متعدد دفعہ آیا ہوں...... اور اس کے چپے چپے سے بہ خوبی واقف ہوں...... میں نے کئی تنہا راتیں یہاں گزاری ہیں۔"

"اوہ......!" میرے منہ سے نکلا۔

"لیکن یہاں اکیلے رہنا تو بڑے دل گردے کی بات ہے۔"

"میں یہاں وہی چلہ کاٹ چکا ہوں جواب تم کاٹنے جارہے ہو۔" انہوں نے انکشاف کیا۔

"میں تمہارے دشمن کو زیر کرنے کی کوشش کرسکتا ہوں، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ کام خود کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ تم خود اپنے آباؤاجداد کا بدلہ لوگے تو اسی طرح تمہارے دل کو ٹھنڈک مل سکتی ہے یوں بھی میں اب بوڑھا ہوچکا ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے رحیم بابا۔" میں نے سر ہلایا۔

"میں تو خود اپنے ہی ہاتھوں سے اس کا قصہ پاک

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اسی ارادے نے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔"

"تمہاری بات سن کر میں خوش ہوا۔" وہ بولے۔

"اور مجھے امید ہے کہ تم ضرور کامیابی حاصل کرو گے۔"

☆......☆......☆

اب صورت حال یہ تھی کہ رحیم بابا اسی بوڑھے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے اور میں ان سے قدرے فاصلے پر کھینچے ہوئے حصار میں آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں ان کا بتایا ہوا وظیفہ شروع کرنے ہی والا تھا کہ رحیم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"شکیل بیٹا...... میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ اسی حالت میں بیٹھے رہو اور میری بات غور سے سنو...... تمہارے سامنے کچھ بھی ہو جائے...... لیکن تم اس دائرے سے مت نکلنا...... جو حصار کھینچا ہے اگر کسی بنا پر تم نے اپنے جسم کا کوئی بھی حصہ اس حصار سے باہر نکالا تو کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے...... اگر تم یہ بھی دیکھو کہ کوئی مجھے یعنی تمہارے رحیم بابا کو قتل کر رہا ہے تو تب بھی اپنی جگہ مت چھوڑنا مجھے امید ہے کہ تم میری باتوں پر عمل کرو گے بس اب عمل شروع کرو۔"

میں نے اپنی آنکھیں قدرے نیم وا کر لیں......

اور پھر میرا ورد شروع ہو گیا یہ وظیفہ اس سے کافی مختلف تھا جو میں نے حویلی میں پڑھا تھا کافی دیر تک میں پڑھتا رہا اور کوئی واقعہ وارد نہ ہوا لیکن پھر اچانک ہی کسی کے رونے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں بری طرح چونک اٹھا۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔

وہ...... کچھ ایسی ہی نسوانی قسم کی آواز تھی۔ بے حد دردناک اور...... کچھ عجیب سا تاثر تھا اس آواز میں...... جسے بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔

ہاں وہ بین تھا...... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں چھوٹا تھا تو محلے میں نصرت خالہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور خود نصرت خالہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسی طرح رویا کرتی تھیں۔

میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تھا کیونکہ یہ آوازیں اب بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت روتی ہوئی اسی طرف قدم بڑھا رہی ہو۔

اور تیز...... اور تیز میں بے چین سا ہو گیا البتہ میں بدستور وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

عین اسی وقت رحیم بابا کی آواز مجھے اپنے قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"دھوکا ہے شکیل......! یہ سب دھوکا ہے۔ تم اپنا کام جاری رکھو...... لمحہ بھر کے لئے بھی غافل نہ ہونا...... خبردار۔"

میں مڑ کر دیکھ نہ سکا، کیونکہ اس حرکت سے بھی انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا ہوا تھا...... میں کسی بت کی مانند اپنی جگہ جما ہوا تھا۔

شاید کوئی تصور کر سکے...... اس شکستہ حال قبرستان میں آدھی رات کے وقت اس عورت کی آواز کس قدر بھیانک اور لرزہ خیز محسوس ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ آواز اچانک ہی بند ہو گئی اور چاروں طرف موت کا سناٹا چھا گیا۔

یوں بھی یہاں موت کا ہی راج تھا...... ہاں...... یہ پرانی اور بوسیدہ ٹوٹی پھوٹی قبریں مجھے موت کی کہانیاں سنا رہی تھیں۔

ایک بار پھر اس فضا پر جھینگروں کی جھائیں جھائیں غالب آ گئی اور میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

میرے ہونٹوں پر بدستور وظیفہ جاری تھا۔

میں نے وظیفہ ختم کیا تو صبح کا نور چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔

عین اسی وقت رحیم بابا اٹھ کر میرے سامنے آ گئے اور بولے۔

"کامیابی کی سیڑھی پر پہلا قدم مبارک ہو۔"

"جی رحیم بابا...... شکریہ۔" میرے منہ سے نکلا۔

"چلو اب گھر کا رخ کرتے ہیں......" وہ بولے۔

"اس وقت سواری بھی ذرا مشکل سے ہی ملے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

گی.....آ ؤ۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے پورا جسم اکڑ کر رہ گیا ہو۔ ہڈیاں کڑکڑانے لگیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان باقی نہ رہی ہو...... میں بھرپور قسم کی کوشش کے بعد اٹھنے میں کامیاب ہوا تھا۔

میں نے اپنی کیفیت رحیم بابا سے چھپالی تھی...... پھر ہم دونوں نے سامان سمیٹا اور قبرستان سے باہر نکل آئے۔

اتفاق سے آبادی میں داخل ہوتے ہی ایک رکشہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

جلد ہی ہم حویلی کی طرف اڑے جارہے تھے۔ راستے میں رحیم بابا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم نے کمال خوبی سے وظیفہ ختم کیا ہے...... آج تمہارا پہلا دن تھا...... میں جانتا ہوں کہ عورت کے بین کی آوازوں نے تمہارے وظیفے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی...... بس...... تم ایسی تمام چیزوں کی طرف ہرگز دھیان مت دینا...... اسی میں تمہاری کامیابی ہے...... جیسے جیسے دن گزریں گے تو رکاوٹوں کے کئی پہاڑ تمہارے سامنے کھڑے ہوں گے...... تمہیں ان کو سر کرنا ہے......"

"میں بھرپور کوشش کروں گا رحیم بابا......" میں بھی آہستہ سے بولا۔

رحیم بابا نے امید بھرے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

اور پھر دن آہستہ آہستہ گزرتے چلے گئے...... میں اب اس قبرستان میں کافی حد تک مانوس ہو چکا تھا...... ایک بے حد طاقتور قسم کی دلیری تھی...... جو نہ جانے کہاں سے میرے اندر عود کر آئی تھی۔

اس دوران مجھے کئی طریقوں سے غافل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی...... ڈرایا گیا...... دھمکایا گیا...... لیکن رحیم بابا کے دست شفقت نے مجھے کسی بھی موقع پر گھبرانے اور کوئی چوک ہونے کا موقع نہیں دیا۔

وہ میری کامیابی کا آخری ہفتہ تھا...... اب میری منزل زیادہ دور نہیں تھی کہ اچانک ہی رحیم بابا کی طبیعت ناساز ہو گئی۔

اس چلے کے دوران وہ مستقل حویلی میں ہی رہ رہے تھے...... انہوں نے قاسم ماموں سے ڈیڑھ ماہ کی باقاعدہ چھٹی لے رکھی تھی۔

انہیں بخار نے آلیا تھا...... جو کہ تھا بھی زوروں پر...... اپنی طبیعت سے زیادہ انہیں اس بات کی فکر لاحق تھی کہ میرے چلے کا کیا ہوگا...... کیونکہ اس میں ایک دن کی بھی غیر حاضری ساری محنت پر پانی پھیر دیتی۔

کافی دن چڑھے وہ گہری نیند سو رہے تھے...... میں آتے جاتے ان کا جسم چھوتا تو یوں لگتا جیسے میرا ہاتھ جل جائے گا۔

اس نئی صورت سے میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔

چنانچہ شام ہوتے ہی میں ایک ڈاکٹر کو گھر پر لے آیا۔

اس نے رحیم بابا کا باقاعدہ چیک اپ کیا، فوری طور پر ایک انجکشن لگانے کے بعد اس نے کچھ دوائیں دیں اور بولا۔

"کافی تیز بخار ہے، اور اس وقت اسی کی وجہ سے ان پر نیم بے ہوشی طاری ہے...... خیر...... میں نے انہیں ڈوز دے دی ہے جلد ہی بخار ہلکا ہوگا اور پھر انہیں یہ دوا دینی ہے...... پھر مجھے بتانا...... اگر طبیعت بہتر ہو جائے تو مجھے کل پھر بلوالینا...... کم از کم تین دن علاج کروانا ہوگا۔"

"جی بہتر......" میں نے سر ہلایا۔

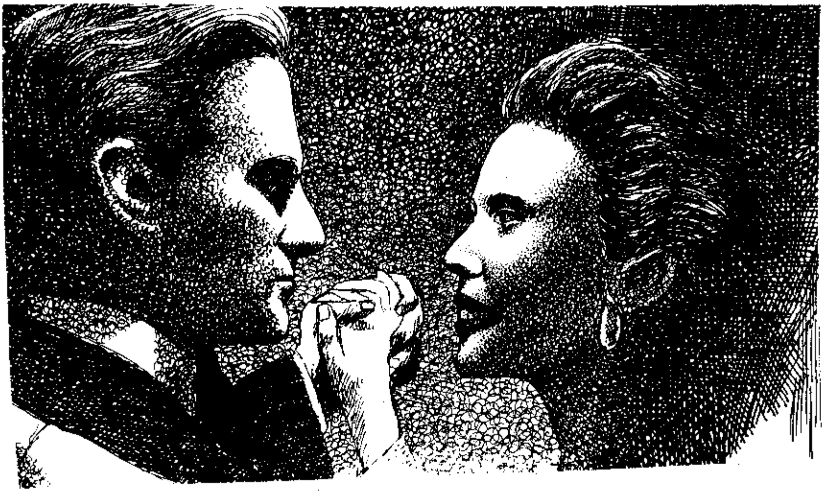
"......اور جب یہ ہوش میں آجائیں تو انہیں کچھ کھلا کر دوائی دے دینا میں اب چلتا ہوں۔"

ڈاکٹر چلا گیا...... تو میں رحیم بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا...... تھوڑی دیر گزری تھی کہ رحیم بابا کے جسم میں حرکت ہوئی اور پھر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

میری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"شکیل...... کیا وقت ہو گیا......؟ ہمیں قبرستان جانا ہے......"

(جاری ہے)



نیم شب

ایس امتیاز احمد-کراچی

نوجوان کے پاس اب قطعی وقت نہیں تھا اس کا قہقہہ رات کے اندھیرے میں قرب و جوار کو دہلا کر رکھ دیا، وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوگیا تھا اسے پتا تھا کہ اصل سراغ لگاتے پولیس تھک جائے گی۔

دوسروں کو بے وقوف سمجھنے والا...... خود بڑا بے وقوف ہوتا ہے...... ایک حقیقی کہانی

ٹریکر خون آشام چمگادڑ کی مانند ہوگیا۔ اس نے واقعتاً خون نہیں پیا تھا بلکہ اس نے بھیانک منظر کی فلم بندی کی تھی۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ مردہ جسموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا تھا۔ اس کا معمولی ٹرک پولیس سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ پولیس نے اسے شہر میں ہر طرح کی مصروفیت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ایک ماہر کیمرہ مین تھا۔ اسے توقع تھی کہ ایک دن اس کی کہانی نہ صرف اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گی بلکہ اس کے ذریعے وہ خوش حال اور دولت مند آدمی بھی بن جائے گا۔

اس کی کہانی کا آغاز نصف شب کے بعد سے صبح چھ بجے تک ہونا ضروری تھا۔ اس وقت تمام ٹی وی اسٹیشنوں کے نیوز روم بند ہوجاتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ٹی وی والوں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے وہ ایسے ہی مناظر خود بھی فلمبند کر سکتے تھے۔

وہ ہر رات دعا کرتا کہ ٹی وی اسٹیشن سے متعلق ہر آدمی خواب خرگوش میں کھو جائے تاکہ وہ جو کچھ منظر عام پر لانا چاہتا ہے اس کی بھنک بھی کسی کے کان میں نہ پڑ سکے۔ وہ اس کام میں مسلسل جدوجہد کر رہا تھا اور اب اسے اپنے کام کے تمام نشیب و فراز کا علم ہوگیا تھا۔

ٹریکر اپنی یادداشت پر ہنستا اور خوف ناک مناظر اس کے دماغ میں رقص کرتے رہتے تھے۔ ابھی یہ کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ اپنی چادر کے نیچے دبکا چیخ رہا تھا۔ رول

کرو۔ رول کرو۔ کیمرہ سے متعلق افراد اس منظر پر ہر وقت نہیں پہنچتے تھے ایک حادثے کا منظر تھا اور اسے دوبارہ حقیقی انداز میں سامنے لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اس قسم کے حادثات کی اس کے ذہن میں کمی نہیں تھی وہ بچپن میں بہت سے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس کے ذہن میں ایک مکمل کہانی تھی۔ یہ کہانی ہر لحاظ سے اس کی اپنی تھی اور اس سے وہ منافع کمانے کی فکر میں تھا۔ وہ پوری قوت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس کام میں مہارت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

وہ بے ثمر رات گزارنے کے بعد گھر جا رہا تھا کہ پولیس ریڈیو سے اسے ایک لاش کے متعلق معلوم ہوا لاشوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی کیونکہ ان کی فلمبندی میں صرف چند فٹ فلم کا زیاں ہوتا تھا۔ لیکن وہ اس حادثے کے مقام سے ایک میل دور تھا۔ اس لئے وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیا مصیبت ہے۔“

وہ پہلی پیٹرول کار سے پہلے اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔

اب وہ خوش دلی سے سیٹی بجاتا ہوا ہالی ووڈ کی طرف جا رہا تھا۔ جب اس نے چینل کے سامنے گاڑی روکی تو مارے جوش کے اس کی بری حالت تھی۔ اس نے اپنی پک اپ کی کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور گاڑی کی طرف دیکھ کر زندہ دلی سے چیخ پڑا لیکن۔ گارڈ کو شاید اس انداز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اس کی طرف سخت نگاہ سے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی نمودار نہیں ہوئی تھی حالانکہ وہ اس سے پہلے بارہا مل چکے تھے اور اس طریقہ کار سے بھی وہ کئی بار گزر چکے تھے۔

”تمہیں کیا کام ہے؟“ گارڈ نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”نیوز روم کے لئے فلم لایا ہوں۔“ ٹریکر ہمیشہ یہی جواب دیتا تھا۔

”کس سے ملنا چاہتے ہو؟ مجھے اپنے رجسٹر میں نام درج کرنا پڑتا ہے۔“

”وائن گوسٹ۔ انچارج نیوز ایڈیٹر۔“

”وہ چھ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔“

”بہر حال میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔“ ٹریکر نے کہا۔

زیادہ باز پرس کئے بغیر گارڈ نے بڑی سرد مہری کے ساتھ اسے انگوٹھے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی بڑھائی اور سیدھا نیوز بلڈنگ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں پارکنگ ممنوع تھی۔ اس نے بڑی کاہلی سے اسٹیئرنگ کے نیچے دبا ہوا سیٹ نکالا اور گوسٹ سے ملاقات کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

انچارج نیوز ایڈیٹر اسے ایک نوعمر دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے کسی طرح زیادہ نہیں تھی۔ جیسے ہی اس نے ٹریکر کو دیکھا وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ وہ ٹریکر جیسے آدمی کو انتظار کی زحمت دے کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس لئے یہ بات اس کی عادت میں شامل ہو گئی تھی۔

ٹریکر نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور دھوئیں کا بادل سا اڑا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیوز ایڈیٹر تقریباً سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں جب سے ٹریکر نے فلمبندی کا کام شروع کیا تھا۔ اس نے ان طویل برسوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہر فلم خریدنے کو ایک ایسا مسئلہ بنا دیتے تھے کہ ٹریکر کو کسی خطرناک جنگ کا گمان ہوتا تھا۔

ٹریکر بولا۔ ”میرے پاس ایک اہم فلم ہے۔“

گوسٹ نے اشارہ کیا اور پھر ٹریکر کی طرف پشت کر کے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹریکر تلملا کر رہ گیا۔ پرانے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا اس جیسے آزاد رہ کر کام کرنے والوں کی بہت مانگ تھی۔ ان دنوں رات کے وقت حادثات کی فلمبندی کرنے والوں کی کمی تھی اس لئے ٹریکر کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ اب اس کے پاس ذاتی عملہ تھا جن میں ساؤنڈ مین سے لے کر باقی ضروری آدمیوں تک سب ہی موجود تھے۔

پہلے تو لوگوں نے کبھی ٹی وی نیوز کے متعلق سنا بھی نہیں تھا۔ سولہ ملی میٹر کیمرے کی کارکردگی کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ان دنوں ٹریکر کی مانگ

تھی۔ رپورٹر اسے نام کے پہلے حصے سے پکارتے تھے اس کے لئے دوپہر کا کھانا خرید کر لانا ان کے معمول میں شامل تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر کھل کر ہنستے تھے جیسے صرف اسی طرح اس کی خوشنودی حاصل ہوسکتی تھی۔ نہ معلوم کب ان کا مستقبل ٹریکر کی فلم سے وابستہ ہوجائے۔

ٹریکر زیرلب بڑبڑایا۔ اور اس یونین کو کوسنے لگا جس کی وجہ سے ٹی وی کے محکمے میں اس قدر انقلاب آگیا تھا آج کل تو وہ بہ مشکل پیٹ بھرنے کی حد تک کمارہا تھا۔ بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرنا تو محض خیال ہوکررہ گیا تھا۔ اسی لئے وہ بالکل تنہا تھا کوئی اسے ایک عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا جس کا نام ٹریکر تھا۔ نیوز روم میں اسے برداشت کرنے کی صرف ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ ٹریکر رات کے ان لمحات میں حادثات کی فلمبندی کرتا تھا جب ساری کائنات میٹھی نیند سوئی ہوتی تھی۔

وہ اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ماضی واپس آجائے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی زندگی روز روشن کے ہنگاموں سے ہمکنار ہوجائے۔

گوسٹ نے فون بند کیا اور ٹریکر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے آج دن بھر کے لئے جن فلموں کی ضرورت تھی انہیں پہلے سے خرید چکا ہوں۔“

ٹریکر نے ایک نگاہ گلاس کی طرف ڈالی جہاں نصف درجن خبروں کے نشانات موجود تھے وہ جانتا تھا کہ اس تعداد سے دوگنا زیادہ خبریں بھی آجائیں تو صرف ایک گھنٹے کا پروگرام مکمل ہوسکتا ہے۔

”اس وقت میں جو کچھ لے کر آیا ہوں تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔“ ٹریکر نے کہا۔

”تمام لوگ یہی کہتے ہیں، پھر بھی بتاؤ کیا خاص بات ہے؟“

”یہ ایک قتل کی واردات ہے۔“ ٹریکر نے کہا۔

گوسٹ کی آنکھیں سرک گئیں لیکن اس نے قبولیت کی چمک ظاہر نہیں ہونے دی۔

”گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کاٹ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوف ناک باتیں بھی موجود ہیں۔“ ٹریکر نے کہا۔

گوسٹ نے ایک دراز جھٹکے سے کھولی اور فلم خریدنے کا فارم نکالا، ٹریکر کا نام پر کرنے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

”اس کے علاوہ تم نے کیا کچھ معلوم کیا ہے؟“

”شکار ایک ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا۔ مین اسٹریٹ پر واقع ایک کیفے کی عقبی گلی میں اس کی لاش دریافت کی گئی ہے۔“

”مین اسٹریٹ۔“ گوسٹ نے مداخلت کی۔

”آخر وہ کون تھا؟ کیا کوئی بدمعاش؟“

”شرابی......“ ٹریکر نے کہا۔

ایڈیٹر زیرلب بڑبڑایا۔ ”اس دور میں ایک یا دو پیگ شراب پینا عام بات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی دلچسپی کی کیا بات ہے؟“

”میں وہ واحد آدمی ہوں جس کے پاس لاش کی فلم موجود ہے۔“

گوسٹ نے غیر دلچسپی کا اظہار کرنے کے لئے انکار میں گردن ہلائی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔“

”حادثے کے بعد میں واحد کیمرہ مین تھا جو اس جگہ موجود تھا۔ میرا کام ختم ہوا تو پولیس نے لاش اٹھوادی تھی میرا خیال ہے اس وقت کارونر لاش پر کام کررہا ہوگا۔ اس طرح کسی اور فلم کا ہر امکان ازخود ختم ہوجاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری فلم کو دیکھیں گے۔“

ٹریکر نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ جانتا تھا کہ آدھی جنگ ختم ہوگئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جب فلم کو تکنیکی مراحل سے گزارنے کے لئے منظور کرلیا جاتا ہے تو عموماً وہ فلم خرید لی جاتی ہے ورنہ اس قدر دردسری مول لینے سے کیا فائدہ؟

”ادائیگی کیا ہوگی......؟“ ٹریکر نے سوال کیا۔

”اگر ہم نے اسے قابل استعمال سمجھا تو حسب معمول 75 ڈالر کی ادائیگی ممکن ہے۔“

”یہ ایک اہم فلم ہے۔ اس کی قیمت بھی زیادہ ہونی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

چاہئے۔"

"رات بھر کے کام کا معاوضہ اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے میرا خیال ہے میں نے پہلے ہی زیادہ پیش کش کردی ہے۔" ایڈیٹر نے روکھائی سے کہا۔

"گویا اگر میں ایک ہفتے میں ایسی فلم حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو میری ضرورتوں کے لئے کافی ہوگی۔" ٹریکر نے تلخ لہجے میں کہا۔

گوسٹ نے لاپرواہی سے کندھے جھٹک دیئے۔ "قتل کی وارداتوں کا صاف مطلب ہے ڈھیر سارا خون۔ رات کے کھانے پر دکھائے جانے والے پروگرام میں ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا منظر دیکھ کر ہمارا پروگرام دیکھنے والے اپنی بھوک ہی کھو بیٹھیں۔"

"میں اپنے کام میں محتاط ہوں۔" ٹریکر نے کہا۔

"میں نے ان زاویوں سے فلم بندی کی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" گوسٹ نے ڈرامائی انداز میں اپنے ڈیسک اسپیکر پر ہاتھ مارتا کہ ٹریکر بھی صورت حال سے آگاہ رہے۔ ایڈیٹر کا یہ دوسرا حربہ تھا۔ جس سے وہ ٹریکر جیسے کیمرہ مینوں پر قابو پالیتا تھا۔ بعض اوقات پولیس والے اس واردات کی کہانی کو انتہائی بے زارکن بنادیتے تھے اس لئے فلم کا تاثر بھی کم ہوجاتا تھا۔

لیکن اس بار جاسوس غیر متوقع طور پر باتونی ثابت ہوا۔ "یہ ٹریکر تو خون آشام ہے۔ اس نے لاش کے معاملے میں ہم سے بھی اولیت حاصل کرلی۔ کیا ہم اس وقت اسپیکر پر ہیں؟"

"ہاں......" ایڈیٹر نے کہا۔

"غالباً ٹریکر بھی تمہارے پاس ہی موجود ہے؟"

ایڈیٹر کے حلق سے بے معنی آواز نکلی جو غراہٹ سے مشابہہ تھی۔

"اس سے کہو کہ فلم کا بغور مشاہدہ کرے۔ اس بار ایک عجیب قاتل ہے سے پالا پڑا ہے۔ اس نے لاش پر کچھ اس قدر کام دکھایا ہے کہ ہم تفصیلات کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہتے ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگوں پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔" جاسوس کی آواز سنائی دی۔

"ہم اسے احتیاط سے پیش کریں گے۔" گوسٹ نے وعدہ کیا۔

"کیا تم اس واردات کے بارے میں کوئی سرکاری بات بتاسکتے ہو۔"

"ابھی وقت نہیں آیا۔ فی الحال شناخت بھی عمل میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ آلہ قتل ایک ریزر تھا لیکن تمہیں کارونرز کی رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا اس سے پہلے کوئی بات نشر نہ کرنا۔"

"چونکہ ہم اس واردات کے بارے میں کوئی خیالی بات نہیں کہہ سکتے اس لئے فلم کی قیمت 75 ڈالر سے زیادہ ہونی چاہئے۔" ٹریکر نے شکایت کی۔

"اب پرانے وقتوں کی جیسی بات نہیں ہے، کیا تمہیں کینڈی کی وہ کہانی یاد ہے جس نے میلی بیو میں جنم لیا تھا؟"

"وہ بات دوبارہ منظر عام پر نہیں آسکتی۔"

ٹریکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "یہ 2006 کا واقعہ ہے۔ ممکن ہے 2007ء میں پیش آیا ہو۔ ان دنوں کینڈی ساحل کے ساتھ ساتھ گاڑی چلا رہا تھا کہ اچانک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چند لمحے سمندر کی جھاگ میں چہل قدمی کرکے محظوظ ہو۔ اس وقت صرف ایک کیمرہ مین وہاں اتفاق سے موجود تھا۔ اس نے فلم بندی کی اور بعد میں اسی فلم کا اسے ایک ہزار ڈالر معاوضہ ملا تھا۔"

"وہ ایک اتفاق تھا۔" گوسٹ نے کہا۔

"اب ایسا اتفاق دوبارہ کبھی پیش نہیں آسکتا۔ اب اسٹیشن بہت بڑے ہوگئے ہیں۔ اور فلم کا عملہ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔"

"نہیں۔" ٹریکر نے احتجاج کیا۔

"اب بھی میرے پیشے کے لوگ کوئی اہم کہانی منظر عام پر لاسکتے ہیں۔" گوسٹ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

ایک ہفتے بعد ایک اور لاش پائی گئی۔ اس لاش کا گلا بھی بری طرح کاٹ دیا گیا تھا اور اس منظر کی فلم بندی میں

بھی ٹریکر سب پر سبقت لے لیا گیا تھا چینل نے اسے اس فلم کی ایک سو ڈالر ادائیگی کی تھی۔

ٹائمز اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی پر سرخی ٹریکر کے لئے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لئے بہر حال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خبر اب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

جب تیسری لاش دریافت ہوئی تو ٹریکر نے ایک ہم پیشہ کیمرہ مین کو ساتھ ملایا۔ اس بار اگرچہ فلم زیادہ اہم نہیں تھی لیکن ایڈیٹر ڈیڑھ سو ڈالر دینے پر آمادہ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے چینل سودے بازی پر آمادہ ہیں۔

ٹریکر اب ایک اہم کیمرہ مین بن چکا تھا۔ اس نے مقابلے کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ اس پیشے کے ساتھ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھا اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ قتل کی اگلی واردات اس کے لئے جادوئی نمبر کی حامل ہوگی۔ ایک ایسا جادوئی عدد جو اس کے لئے خوش قسمتی کا مظہر ہوگا۔ ایک ایسی واردات جس کے ذریعے وہ بہت زیادہ کمائے گا۔ ممکن ہے اس واردات کی فلم کینڈی کی کہانی سے بھی سبقت لے جائے۔ اس نے یہ بات دل کی گہرائیوں سے محسوس کی تھی۔

خلاف توقع صورت حال بگڑ گئی۔ ٹی وی اسٹیشن نے پولیس سے ساز باز کرلی۔ ان کے درمیان ایک معاہدے نے جنم لیا۔ پولیس اس معاہدے کے مطابق براہ راست ٹی وی کے عملے کو ترجیح دے گی۔

”بہر حال......“ گوسٹ نے ٹریکر سے کہا۔

”دیوانے قاتل روزانہ ہی وارداتیں نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تم آزاد کیمرہ مین ہمیں لوگوں کے تاثرات فراہم نہیں کرسکتے۔ اس حادثے کے دوران بعد میں تماشائیوں کی آوازیں بھی فلم کے ساتھ موجود ہوں تو فلمی مناظر میں حقیقت کا عنصر بڑھ جاتا ہے مجھے افسوس ہے ٹریکر کہ تم نے سودے بازی کا جو بازار گرم کر رکھا تھا وہ اب ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔“

”تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔“

ٹریکر نے دل میں سوچا اور پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر ایڈیٹر کر گھورنے لگا۔ اس بات سے بھی اسے ذہنی سکون حاصل نہ ہوسکا۔ وہ پچپن برس کا ایک پیشہ ور رپورٹر تھا اس عمر میں عموماً دوسرے لوگ ریٹائر ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں جبکہ وہ ایک دیوانے قاتل اور اس کے شکار کا متلاشی رہتا تھا۔

”مجھے مددگار رپورٹر بنانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ ٹریکر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

”تم جانتے ہو کہ کبھی نہ کبھی تمہارا عملہ بھی ناکام ہوسکتا ہے۔“

کشادہ آنکھوں سے ایڈیٹر نے اسے گھورا۔

”تم......؟ نہیں ٹریکر...... اگر میرا ایک عملہ ناکام رہتا ہے تو میرے پاس ان کی مدد کے لئے دوسرے آدمیوں کی کمی نہیں ہے اور پھر تم یونین کے ساتھ وابستہ بھی نہیں ہو۔“

جب وہ نیوز روم سے باہر نکلا تو اس کا دماغ غصے سے کھول رہا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹی وی کے عملے کو ہر حال میں نیچا دکھائے گا۔

وہ تھکا تھکا سا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری سلوٹیں تھیں۔ اور وہ غور کر رہا تھا کہ رات شروع ہونے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے۔ کئی بیزار کن گھنٹے گزارنے کے بعد کہیں کام کا وقت شروع ہوگا۔ ایسے میں گھر جانے سے کیا فائدہ؟ صورت حال اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ پیشہ ور رپورٹروں کا کام تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ ٹریکر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ریزہ ریزہ ہوگئی ہو۔

”میں بھی ان شرابیوں کی طرح آوارہ گرد ہوگیا ہوں۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”بہر حال اب مجھے کسی نئے انداز سے کام شروع کرنا پڑے گا۔“ اس نے شہر کی طرف اپنی گاڑی پوری رفتار سے اڑانی شروع کردی۔

اگلے روز صبح چار بج کر تیس منٹ پر اس نے گوسٹ کے گھر فون کیا۔

”تمہیں میرے گھر کا نمبر کہاں سے ملا ہے؟“ ایڈیٹر غرایا۔

"اس بات کو چھوڑو۔" ٹریکر نے کہا۔

"میں ایک فیصلہ چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت۔"

"کیا کوئی نئی واردات ہوگئی ہے؟"

"تم ایک دوہرے قتل کی فلم کا کیا معاوضہ دو گے۔ دو مقتول جن کے گلے کٹے ہوئے ہیں؟"

"تم جانتے ہو کہ میرا عملہ کام کر رہا ہے۔"

"دوہرا قتل اور قاتل سے مخصوص انٹرویو؟"

"ہیں...... کیا کہا انٹرویو۔ کیا تمہیں یقین ہے؟"

"میں دو ہزار معاوضہ چاہتا ہوں۔" ٹریکر نے کہا۔

"کینیڈی کی فلم کا دوگنا معاوضہ......"

گوسٹ کی طرف سے جواباً ایک غراہٹ سنائی دی۔ "میں اتنا بڑا فیصلہ ذاتی طور پر نہیں کر سکتا۔" گوسٹ نے کہا۔

"مجھے انتظامیہ سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔"

"میں صرف پانچ منٹ انتظار کر سکتا ہوں۔"

"تمہارا نمبر کیا ہے؟"

ٹریکر نے فون کا نمبر دیکھا اور گوسٹ کو بتا دیا۔

ٹھیک چار منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور گوسٹ کی آواز سنائی دی۔

"ایک ہزار بہت بڑی قیمت ہے ہم اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔"

"میں اس سے زیادہ کما سکتا ہوں۔"

ان کے درمیان سودے بازی شروع ہوگئی۔ بالآخر ایڈیٹر نے کہا۔

"بارہ سو سے زیادہ نہیں۔ یہ انتہائی معاوضہ ہے۔"

ٹریکٹر مسکرایا۔ "بارہ سو کا معاوضہ اسے وقت کا سب سے مہنگا رپورٹر بنا دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹی وی نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم ادا نہیں کی۔" اس نے گوسٹ کو ایڈریس دیا اور کہا۔

"تمہارا عملہ وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟"

"پندرہ منٹ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔" ٹریکٹر نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا، وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا تاکہ کار کی روشنی میں وقت دیکھ سکے۔ اس دوران وہ سگریٹ کے گہرے کش لگا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔

نیند کی کمی کے باعث اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے سستی سی شراب بھی پی رکھی تھی جس کے اثرات اس کی کھوپڑی میں طوفان اٹھا رہے تھے۔

اس نے گاڑی کا دروازہ مقفل کیا اور ففتھ اسٹریٹ برج کی طرف لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔

دونوں آوارہ گرد شرابی اس جگہ موجود تھے جہاں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے۔

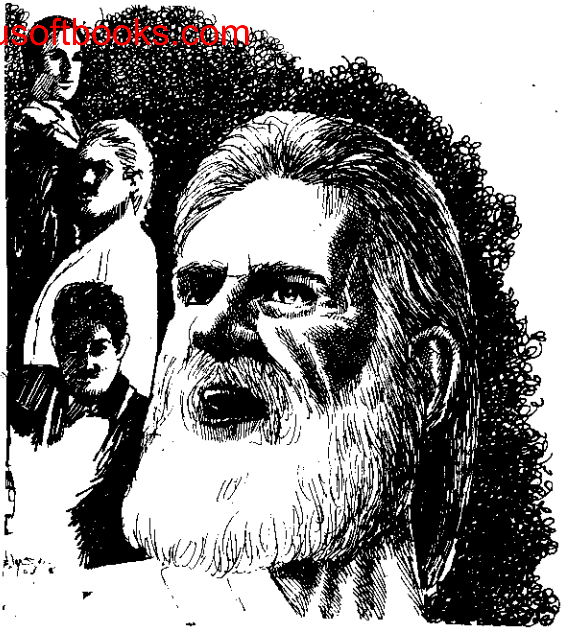
ٹریکر کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور ان دونوں پر کیمرہ فوکس کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔"

وہ زیرلب بڑبڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے پر شہرت کی روشنی صاف محسوس کی۔ اس نے آنکھوں سے پسینہ صاف کیا تاکہ وہ کیمرہ ٹھیک سے سیٹ کر سکے۔ اسی لمحے ٹریکر نے محسوس کیا کہ چینل کی تین نیوز ویگن آ رہی ہیں۔

اب اس کے پاس قطعاً وقت نہیں تھا۔ اس کا قہقہہ پل کے نیچے محدود جگہ میں گونج اٹھا۔ پولیس کو اصل قاتل کا سراغ لگاتے لگاتے ایک عرصہ گزر جائے گا وہ تمام چالبازیوں سے آگاہ تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟

چند لمحے وہ کھڑا موزوں ترین زاویے کا انتخاب کرتا رہا پھر اس نے جیب سے ایک تیز دھار ریزر نکالا۔ وہ آگے بڑھا دونوں آوارہ گرد بے ہوشی کی وجہ سے مداخلت کے قابل نہیں تھے۔ اس کے سامنے چند ہی لمحوں کے بعد دو لاشیں تھیں جن کے گلے کٹے ہوئے تھے اور وہ فلم بندی میں مصروف تھا۔



آخری وقت

مہر پرویز احمد دولو۔میاں چنوں

رات کے اندھیرے میں نشہ آور اشیا کھلا کر خاتون کو مدھوش کیا گیا اور پھر اس کے بعد خاتون کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اندھیرے کا ہر سوراج تھا کہ اچانک ظلم کی دیوار گرگئی اس کے بعد......

اچھائی بھلائی اور نیکی کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی ...... حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

جن پہاڑوں کے درمیان وادی میں انہوں نے جنم لیا تھا وہ ان کی سوچ و فکر سے بھی بلند تھے۔ پورے علاقے کے لوگ دین کا علم حاصل کر کے دینی اور دنیاوی آسائشات کو حاصل کرتے تھے۔ شعور کی حدود میں قدم رکھتے ہی ان کو گاؤں سے دور حصول علم کے لئے مدرسے میں داخل کروا دیا گیا۔

ابرار شاہ شروع سے ہی محنتی تھا جبکہ باقر شاہ کو پابندی کے شکنجے میں کسا گیا تو وہ بہت کسمسایا لیکن مقدر میں لکھی پابندیاں ختم نہ ہو سکیں۔

دونوں بھائیوں کے لئے دیگر رشتے داروں کی طرح دینی تعلیم لازمی قرار دی گئی، اس کے صدقے ان پر روزی کے دروازے ہوتے تھے، پورا گاؤں عالموں اور حافظ قرآن پر مشتمل تھا۔

یہاں کے پڑھے لکھے نوجوان ملک کے طول و

عرض میں دینی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں پر بھی بزرگوں کی پیروی لازمی قرار دی گئی۔

ابرار شاہ نے محنت اور ایمانداری سے تعلیم حاصل کی اور دور کے ایک گاؤں میں جا بسا، جہاں امامت کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ بھی شروع کردی۔ باقر شاہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکا، لیکن اسے بھی ایک گاؤں میں امامت مل گئی۔

انسان اور خاص کر مسلمان بڑے ہی سہل پسند، جلد باز اور بغیر محنت کے منزل کے حصول کے خواہاں ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق سب سے زیادہ موبائل فون پاکستان اور بھارت میں استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ یورپی ممالک میں اس کا استعمال بہت کم ہے۔ وہ اس لئے کہ قائداعظم محمد علی جناح کے جس فرمان پر ہم پاکستانیوں نے عمل کرنا تھا کہ ”کام، کام اور کام اس فرمان پر انگریز کاربند ہیں۔“ فضول سرگرمیوں کے بجائے وہ کام، کام اور کام کرتے ہیں۔

یہ ان کا احسان ہے کہ آئے روز کی ایجادات سے مہینوں کا کام گھنٹوں میں دنوں کا سفر گھنٹوں میں ہو رہا ہے۔

کپڑے سینے والی سوئی سے لے کر جہاز تک ایجاد ہوچکے ہیں۔ لیکن افسوس ہمارے سربراہ بڑے فخر سے بیانات دیتے ہیں کہ ہم تیسری دنیا کے ممالک میں شامل ہیں۔ پاکستانی قوم کام کرنا توہین اور جبری مشقت سمجھتی ہے۔

شہروں سے لے کر ٹاؤن، بستی، گاؤں، ڈیرے، محلے، قصبے تک فارغ لوگوں کی فوج ظفر موج نظر آتی ہے۔

چوک، بازار اور ویگنوں، رکشوں کے اسٹاپوں پر چائے کے ہوٹلوں، پلیسرڈ کے پھٹوں پر نوجوانوں کا جم غفیر نظر آتا ہے۔

فیکٹری، کارخانوں اور سرکاری وغیر سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے حیلوں بہانوں، قلم چھوڑ تحریکوں اور ہڑتالوں کے اسباب تلاش کرکے فارغ رہنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

ہماری خواہشات غریب کی دکھ بھری زندگی کی طوالت کی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔

خوشحال زندگی کے حصول کے لئے کام کرنا سخت معیوب سمجھتے ہیں۔ چور دروازے سے ترقی کے زینے طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں بے شک محنت زیادہ کرنی پڑے، پیسے کا بے دریغ استعمال کرنا پڑے۔ اس کی پرواہ نہیں۔

☆......☆......☆

باقر شاہ نماز سے فارغ ہوکر مسجد سے باہر نکلے تو معصوم بچہ تھامے ایک خاتون سامنے آگئی۔

”حضرت صاحب! بچہ بہت روتا ہے، دودھ نہیں پیتا، اسے دم کردیں۔“

حضرت صاحب نے دم کیا جبکہ دیگر نمازیوں نے پھونکیں ماریں۔

اگلے دن جب حضرت صاحب نماز سے فارغ ہو کر نکلے تو کل والی عورت مٹھائی کا ڈبہ لئے سامنے آگئی۔

”بابا جی! آپ کے دم سے میرے بچے کو آرام آگیا ہے۔ میں اپنی خوشی سے یہ مٹھائی کا ڈبہ لائی ہوں، ڈبے کے ساتھ سو کا نوٹ بھی تھمادیا۔

جبکہ اس کے ساتھ آئی عورت بچے کو دم کروانے کے لئے بابا جی کے سامنے لائی۔ دم کرنے سے وہ بچہ بھی ٹھیک ہوگیا اور ایک بار پھر مٹھائی کا ڈبہ اور سو کا نوٹ مل گیا۔

حضرت صاحب مسجد سے متصل گھر پہنچے تو چار، پانچ عورتیں وہاں موجود تھیں، جو مختلف امراض میں مبتلا ہو کر دم کروانے کے لئے آئی تھیں۔

حضرت صاحب پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارنے لگے، جبکہ خواتین پچاس، سو کے نوٹوں کی صورت میں ہدیہ پیش کرنے لگیں۔

بابا جی کے دم سے خواتین کو آرام آنے لگا، بچے خوشی سے قلقاریاں بھرنے لگے۔ اور بدلے میں نذرانے کی مد میں نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔

آئے روز کی مجبور خواتین اور بچوں کے رش نے بابا جی کو باقاعدہ تعویذ گنڈے پر مجبور کردیا۔

ایک کمرے کو حجرے کا درجہ دے کر اسے باقاعدہ آنے والے حاضرین کے لئے مختص کر دیا۔

ہر آنے والے دن تعویذ گنڈے سے شفا یابی کا فیض پانے والی خواتین میں اضافہ ہونے لگا۔

نذرانہ مانگنے کے بجائے گھی کا خالی کنستر لے کر اسے چندہ بکس کا نام دیا اور حجرے کے درمیان رکھ دیا۔

ہر آنے والی خاتون اپنی حیثیت کے مطابق تعویذ اور دم درود کروانے کے بعد حسب حیثیت کام کی نوعیت کے حساب سے نذرانہ ڈبے میں ڈالتی، بابا جی نے خاص مرید اور مریدنیاں بھی بنالیں جو آنے والے زائرین کو جلد کام اور تعویذ سے جلد اچھا اور زیادہ نتیجہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ نذرانہ دینے پر قائل کرتیں۔ جتنا زیادہ نذرانہ کام جلد ہونے کے اتنے زیادہ چانس کے دعوے کئے جاتے۔

رات کو جب چندہ بکس کھول کر نذرانہ شمار کیا جاتا، تو لمبی چوڑی رقم برآمد ہوتی۔

عوام کو مزید قائل اور آگاہ کرنے کے لئے بابا جی نے بہت بڑا پینا فلیکس لکھوا کر دروازے کے ساتھ دیوار پر چسپاں کر دیا۔

"من چاہی مراد گھنٹوں میں پوری، بے اولاد حضرات بچوں کی قلقاریوں سے محظوظ ہوں، محبوب قدموں میں، دنوں میں لکھ پتی بنیں، پرائز بانڈ پر پہلا انعام پائیں۔"

جھوٹ سچ کا لمبا چوڑا مضمون لکھ دیا جو پڑھنے والے کو مبہوت کرتا، خواتین پہلے ہی مرعوب تھیں۔ اب من چلے بھی مرضی کے نذرانے کے عوض لوگوں کی بہو، بیٹیوں کے سودے کرنے لگے۔

چاہت کے پھول چننے کے خواہش مند در پر حاضری دے کر تسکین کے غوطے کھانے لگے۔ بابا جی سے دولت کی دیوی سنبھالنی مشکل ہو گئی۔

شہر سے پلاٹ لیا، گاؤں سے رقبہ خریدا، دھوم دھڑلے سے شادی کی، کاروبار خوب چل نکلا۔

بات تعویذوں سے پیری مریدی تک جا پہنچی، پیرو کاروں کا جم غفیر صبح شام در پر حاضری دینے لگا۔

وقت کی دوڑ دھوپ میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ بن گئے۔

بڑا بیٹا نوجوانی کی عمر کو پہنچا تو اسے بھی اپنے نقش قدم پر چلانے کے لئے ساتھ بیٹھا کر آئے خواتین و حضرات کو بیوقوف بنانے کے گر سکھانے لگا، ساتھ ہی امام مسجد کے فرائض بھی سرانجام دینے لگا جبکہ چھوٹا بیٹا اسکول سے پڑھ کر کالج میں جا پہنچا۔

باقر شاہ اور بیٹوں کی شہرت نے دور دور تک لوگوں کو گرویدہ بنالیا۔ ابرار شاہ بھی بھائی اور بھتیجوں کے کرتوت سے آگاہ تھا۔ وہ اکثر اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا، لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرتا مگر اب وہ لوگ اس میدان میں بہت آگے نکل چکے تھے۔

وہ خود اکثر لوگوں کو ہدایت و رہنمائی سے بداعمال سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتا۔

باقر شاہ دولت کی گاڑی پر زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی بیوی چند دن بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔

بیوی کے فوت ہوتے ہی اس کی امامت پر پابندی لگا دی گئی، بڑا بیٹا باقاعدہ امام بن گیا، جبکہ باقر شاہ اب گھر تک محدود ہو گیا، صرف تعویذوں کی کمائی سے گزارہ چلانے لگا۔

گاؤں والے لکھ سادہ سہی، لیکن انہوں نے ایک عقل مندی کا فیصلہ کیا کہ باقر شاہ کے تعویذوں اور امامت پر پابندی لگا دی۔

"باقر شاہ اگر تم کو امامت کرنی ہے اور تعویذوں کا دھندا کرنا ہے تو شادی کرو، ورنہ ایک رنڈوے کے پاس ہم اپنی خواتین نہیں بھیجیں گے۔"

بابا جی نے کاروبار بچانے کے لئے اور دولت کی بہتی ندی کے سامنے باندھا گیا، بند گرانے کے لئے ایک خاص مریدنی سے شادی رچا کر ایک طرف تو مریدنی کی پرانی خواہش پوری کر دی اور دوسری طرف گاؤں والوں کی

بولتی بند کردی۔

شادی کرنے کی دیر تھی کہ مریدوں اور سائلین نے بارش کے اولوں کی طرح برسنا شروع کردیا۔

☆......☆......☆

ابرار شاہ ایک انتہا نیک، پارسا اور مبلغ فطرت انسان تھا۔

خدا ترس، معصوم، مجبور لوگوں کا ہمدرد، غمگسار، دکھ درد کے صحرا میں ابر رحمت کی طرح برسنے لگا۔

جس مسجد میں امام تھا، مسجد کی آمدنی بڑھانے، اسے وسیع کرنے، حفظ و ناظرہ پڑھنے والے بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ساتھ ہی ایک مارکیٹ بنادی۔ دکانیں کرائے پر اٹھادیں، جن کے کرائے سے مسجد کے اخراجات پورے ہونے لگے۔ اس مارکیٹ میں نہ تو کسی نائی کو شیو کرنے کے لئے دکان دی گئی اور نہ ہی کسی ویڈیو، سی ڈی کا کاروبار، گیت، نغمے، ڈرامے، فلمیں اور مجرا وغیرہ کی ریکارڈنگ کرنے والے کو دکان کرائے پر دی گئی۔

ابرار شاہ کا بیٹا بھی باپ کی طرح صوم وصلوٰۃ کا پابند، انتہائی نیک اور پارسا تھا۔ ابرار شاہ اکثر ملک کے طول و عرض تبلیغ کے سلسلے میں سفر کرتا۔

رشد و ہدایت سے لوگوں کی بھلائی کا فریضہ سر انجام دیتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کرکے لوگوں کو نیکی طرف مائل کرتا جبکہ گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتا۔

مقامی شرپسند، چور، اچکے، بگڑے نوجوان، نشئی اور اوباش نوجوان ابرار شاہ سے نفرت کرتے۔ جب وہ تبلیغ کے سلسلے میں دورے پر چلے جاتے تو یہ لوگ سکھ کا سانس لیتے۔

اب کی بار جب شاہ جی تبلیغ پر جانے لگے تو مسجد کی مارکیٹ کے دکاندار بھی تیار ہوگئے۔ ان کے روانہ ہوتے ہی مارکیٹ کی دکانوں کو تالے لگ گئے۔

یہ اطلاع جب اوباش نوجوانوں کو ملی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھے، نشے کے لئے روپوں کی آمد کا سلسلہ چلنے کا امکان پیدا ہوگیا۔

پروگرام کے مطابق چند نوجوانوں نے آدھی رات کے وقت مارکیٹ کا رخ کیا۔

تالا توڑنے کے اوزار، ہتھوڑے، سریے وغیرہ سنبھالے جب قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر دکان کے سامنے ایک سفید لباس اور پگڑی باندھے بزرگ کھڑا ہے، جس کے ہاتھ میں بڑی لمبی لاٹھی ہے۔ وہ ذکر اللہ کرنے کے ساتھ پہرہ دے رہا ہے۔

ان لوگوں نے کافی دیر ان کے جانے کا انتظار کیا، مگر بے سود۔

صبح جب مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی تو یہ لوگ ناکام گھروں کو لوٹے۔

اس ناکامی کے بعد ایک بزرگ کی بھینس تھی جس کو چارہ اس کی بیوی ڈالتی تھی جبکہ وہ شاہ جی کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔

ان نوجوانوں نے وہ بھینس رات کو چوری سے کھولی، ڈالے میں ڈال کر دور ایک ساتھی کے گھر چھوڑ آئے۔ اس دوست نے بھینس بیچنے کی بہت کوشش کی لیکن جرائم پیشہ لوگ تھے اس لئے کوئی بھی بیوپاری خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔

"چلہ" چالیس دن پورے ہونے میں دو دن باقی تھے کہ ایک بیوپاری بھینس خریدنے آیا۔ بھینس کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"یہ تو فلاں بزرگ کی بھینس ہے جو ابرار شاہ کے ساتھ تبلیغ پر گیا ہوا ہے۔" اتنا سننا تھا کہ وہ شخص سخت پریشان ہوگیا۔

بیوپاری کے روانہ ہوتے ہی بھینس لانے والوں سے رابطہ کیا، وہ لوگ آکے بھینس کو واپس گاؤں لاکر متعلقہ بزرگ کے دروازے پر چھوڑ کر رفوچکر ہوگئے۔

صبح جب وہ بزرگ گھر پہنچے تو بھینس کو دروازے پر کھڑے پایا۔

☆......☆......☆

باقر شاہ کی بیوی جب باقاعدہ زوجیت میں آئی تو اس کے تیور بدل گئے۔ پہلے تو وہ ہاتھ پاؤں چومتے نہ تھکتی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھی۔ پاؤس کی دھول کو بھی روپوں کے عوض بیچتی، اور شان بیان کرتے ہوئے زمین آسمان کے قلابے ملا دیتی۔

گھر کی مالکہ بنتے ہی باقر شاہ کا چہرہ اور کردار مکروہ نظر آنے لگا۔ گھر پر حق جتانے لگی۔ نذرانے کا ڈبہ سرِشام ہی تھامتی اور اپنے کمرے میں روپوں کو گڈیوں میں باندھتی۔ جبکہ باقر شاہ کو روپوں کا نشہ ہوگیا تھا۔ جب تک رات کو نوٹوں کی گڈیاں نہ دیکھتا اسے نیند نہ آتی۔

شام کو نذرانے کا ڈبہ اٹھانے پر میاں بیوی میں جھگڑا شروع ہوا۔ جو دونوں کو الگ الگ حرص کے زندان میں قید کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

میاں بیوی کو ایک دوسرے سے سخت نفرت ہوگئی۔

الگ الگ کمروں میں سوتے اور ساری رات ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے منصوبے بناتے۔

باقر شاہ کے چھوٹے بیٹے نے کالج پہنچتے ہی پر پرزے نکالنے شروع کردیئے۔

روپے پیسے کی ریل پیل نے اسے بگاڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پہلے تو سگریٹ پینے کا عادی بنا۔ پھر چرس بھر کر پینا شروع کردیا اور آخرکار وہ ہیروئن پینے لگا۔

کافی عرصہ تو خرید کر دوستوں کو بھی پلاتا اور خود بھی پیتا۔

کھاتا پیتا نوجوان دیکھتے ہوئے سپلائر اسے بھی ہیروئن بیچنے پر آمادہ کرنے لگا۔ چھوٹے شاہ جی نے اب کالج میں باقاعدہ ہیروئن بیچنی شروع کردی۔

بیٹی میٹرک میں تھی کہ ایک ساتھی سے عشق کا پیچا لڑا بیٹھی اور ایک دن اسکول گئی اور وہیں سے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی اور پھر واپس گھر نہ آئی۔

کالج میں ہیروئن کے چرچے ہونے لگے، کئی بار کے انتباہ کے بعد آخرکار چھوٹے شاہ جی کو ہیروئن سمیت گرفتار کرلیا گیا، دو کلو ہیروئن برآمد ہوئی۔ دفعہ 9-C کے تحت ایف آئی آر کاٹی گئی۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے گئے کئی سفارشیں آزمائی گئیں مگر پولیس ٹس سے مس نہ ہوئی۔

☆......☆......☆

میاں بیوی کے تعلقات خراب سے خراب ہوتے گئے۔

آخر تنگ آ کر باقر شاہ نے بڑے بیٹے سے مشورہ کرکے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ "بیٹا! تمہارا چھوٹا بھائی جیل میں بند ہے، بہن منہ کالا کرکے چلی گئی، میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ اگر مرگیا تو زرعی رقبہ، شہر کا پلاٹ اور دیگر جائیداد کا بٹوارہ ہوگا۔ تمہاری سوتیلی ماں کو بھی حصہ ملے گا۔

حالانکہ وہ ایک فاحشہ بیوہ خاتون تھی، لوگوں سے اس کے معاشقے چلتے تھے، چالاک عورت تھی مجھے پھانسنے میں کامیاب ہوگئی۔ اور آخرکار گھر کی مالکہ بن بیٹھی۔

میں نہیں چاہتا ہماری خون پسینے کی کمائی اس بدکردار عورت کو ملے، جس کے ساتھ میرا سوائے بیوی کے کوئی خونی رشتہ نہیں۔

حریص باپ کے حریص بیٹے کو بات سمجھ آ گئی۔

ایک دن رات کو نشہ آور اشیا کھلا کر اس خاتون کو مدہوش کیا گیا اور پھر اس دوران اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہمسائے والے اکثر جھگڑے کے دوران ثالث کا کردار ادا کرتے تھے قتل کی خبر لمحوں میں پھیل گئی۔

ہمسایوں کی گواہی پر باقر شاہ اور بیٹے کو اقدام قتل میں گرفتار کرلیا گیا۔ مرحوم کے گھر والوں نے کیس کی پیروی کی، باقر شاہ کو عمر قید اور بیٹے کو سزائے موت سنائی گئی۔

جس دن قاتل بیٹے کو سزائے موت ہوئی، اس کے ایک ہفتے بعد منشیات فروش بیٹے کو سزائے موت دی گئی۔

جیل میں بیٹوں کی سزائے موت کی اطلاع ملی تو دل کا دورہ پڑنے پر باقر شاہ بھی زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔

☆......☆......☆

ابرار شاہ ولی اللہ تھے، ان کے زیر تربیت نوجوان، جج اور گورنر کے عہدے تک پہنچے، جب آخری وقت قریب آیا تو بیٹے کو بلایا۔

"میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میری موت کے بعد بارش ہوگی، بارش میں میرا جنازہ اٹھانا، اسی گاؤں کے قبرستان میں دفن کرنا، کچی اینٹوں کی قبر بنانا، کوئی کتبہ، نشانی نہ رکھنا، تمام گاؤں کے لوگوں کو میرے حق میں دعا کے لئے کہنا۔ میرے بعد گاؤں کا پیر بننے کے بجائے ان کا خادم اور دین کا ادنیٰ خدمت گار بن کر لوگوں کی خدمت کرنا، رزق کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرنا، تعویذ گنڈے کو روزی کا ذریعہ نہ بنانا۔"

بابا جی جب نصیحت کا قرض اتار چکے تو صاف آسمان سے ٹک ٹک بوندا باندی ہونے لگی۔

بارش سے بچنے کے لئے جب بیٹا باپ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ رم جھم کے دوران غسل اور جنازہ کروایا گیا۔

دفن کے وقت بوندا باندی خراج عقیدت پیش کرنے لگی۔

جب لوگوں نے ثواب کی غرض سے قبر پر مٹی ڈالنی شروع کی تو ماحول یوں ہوگیا جیسے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو کی بارش ہورہی ہو۔

پورا قبرستان خوشبو سے مہک اٹھا۔

جن لوگوں نے مٹی ڈالی ان کے ہاتھ یوں معطر ہوگئے جیسے گلاب کے عرق سے دھوئے ہوں۔ قبر پر موجود ہر شخص خوشبو کے سحر میں مدہوش ہوگیا، وہ لوگ معطر فضاؤں کے باسی لگنے لگے۔ دفن سے فارغ ہوتے ہی بوندا باندی تھم گئی، سورج چاند کی طرح دھیمی روشنی سے منور ہونے لگا۔ لوگ بابا جی کی وفات سے غمگین اور قبر کے استقبال پر خوش تھے۔

آج وہ گاؤں مثالی ہے، وہاں کے پڑھے لکھے نوجوان، جج اور گورنر کے عہدے تک پہنچے ہوئے ہیں۔ خوب صورت، خوشحال گاؤں کے ہر گھر میں درجہ چہارم سے لے کر سیکریٹری تک کے عہدے آفیسر پائے جاتے ہیں۔ بابا جی کے نسل کے لوگ آج بھی دین کی شمع جلا کر اندھیری راہوں کو روشن کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔



شیطانی روح

فلک زاہد۔لاہور

خونی عفریت نے اچانک نوجوان پر حملہ آور ہو کر نوجوان کو بے بس کرکے اس کے نرخرے کو بھنبھوڑ ڈالا اور بہتا ہوا خون بڑی رغبت سے پینے لگا اور پھر......

حقیقت سے چشم پوشی کرنے والا......نہ گھر کا رہتا ہے......نہ گھاٹ کا سبق آموز کہانی

مارج میری بیوی کا نام تھا جس سے میں شدید محبت کرتا تھا۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے جب میں کچھ ضروری اشیا کی خریداری کے لئے قریبی بازار تک گیا تھا مگر میرے واپس آنے تک میری کل کائنات اجڑ چکی تھی۔ میری پیاری بیوی، میری محبت، مارج سیڑھیوں سے پھسل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے اس دنیا میں تن تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ سیڑھیوں سے پھسلنے کے باعث اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی اسے اسپتال لے جانے کی بھی نوبت نہ آسکی تھی۔

میں گھنٹوں اس کا سر اپنی گود میں رکھے دھواں دھار روتا رہا تھا۔ ہم دونوں کی شادی محبت کی تھی، ہماری شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ مجھے یوں چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی تھی۔ یہ سانحہ

میرے لئے کسی موت کے پروانے سے کم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میرا اس دنیا میں تھا ہی کون۔ وہ بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ جن لوگوں کو مارج کی موت کی اطلاع ملی وہ تعزیت کے لئے آنے لگے۔ مارج کی تدفین میرے جاننے والوں نے ہی کی ورنہ میں اس حالت میں کہاں تھا۔ میرے تو دل ودماغ نے دور دور تک اب بھی اس کی موت کو قبول کر لینے پر آمادہ نہیں تھے۔

بار بار اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا اور میں پاگلوں کی طرح اسے ''مارج مارج'' کہہ کر پکارنے لگتا۔ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔

جس قدر مارج کو میں چاہتا تھا اسی قدر وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔ ہماری محبت مثالی تھی کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے تھے لہٰذا اس کے یوں اچانک چلے جانے سے میرے دل ودماغ کو شدید دھچکا لگا تھا۔ میرا خود پر کوئی اختیار نہ رہا تھا۔ میں دن بدن جنونی اور ذہنی مریض ہوتا جارہا تھا۔

مارج کو جب میری نظروں کے سامنے قبر میں اتارا جارہا تھا تو میں اس کے جسد خاکی سے لپٹ کر چیخنے چلانے لگا تھا۔ بڑی مشکلوں سے مجھے میرے دوستوں نے سنبھالا اور مارج کی آخری رسومات بھی ادا کردی گئیں۔ کافی دن گھر پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا جو سب ہی میری دلجوئی کرنے کو آتے رہتے مگر پھر آہستہ آہستہ سب ہی اپنی اپنی مصروفیات میں مصروف ہوگئے۔ اور میں اس بڑے سے گھر میں جسے میں نے اور مارج نے اپنی محبت سے تعمیر کیا تھا بالکل اکیلا رہ گیا اب یہاں صرف میں اور میری تنہائی تھی بے شک میری نگاہوں کے سامنے مارج کو قبر کے اندر اتارا گیا تھا اور میں ہر روز باقاعدگی سے اس کی قبر پر تازہ پھول چڑھا کر آتا تھا۔ اس کے باوجود میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ مارج مجھے اتنی جلدی اکیلا کیسے چھوڑ کے جاسکتی ہے۔ ایک ہی تو خواب تھا میرا کہ میری مارج میرے پاس ہو اور ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں مگر افسوس ایسا نہ ہوسکا تھا۔

مارج کے سوا میں کسی اور عورت کا خیال اپنے دل میں لا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت تھی جسے میں نے دل وجان سے چاہا تھا اور اب بھی اسے ہی چاہتا تھا۔ لہٰذا مارج کو دوبارہ حاصل کرنے کا جنون مجھ پر دن بدن سوار ہونے لگا۔ اب میں ہر پل ہر لمحہ بس یہی سوچتا رہتا تھا کہ میں کس طرح اپنی مارج کو دوبارہ حاصل کرسکتا ہوں۔

چنانچہ مارج کی محبت میں اندھا ہو کر میں کسی طرح ''بلیک میجک'' کرنے والوں کے پاس جا پہنچا۔ کس طرح میں نے ان کے بتائے گئے طریقوں پر عمل کیا جو کہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں جانے کے بجائے صرف مطلب کی بات کروں گا۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ پورے چاند کی رات جس دن میں نے اپنے ہاتھوں سے مارج کی قبر کھود کر اس کے تابوت کا ڈھکنا کھولا تھا۔ یہ سب میں نے نہایت احتیاط اور راز داری سے کیا تھا۔ چاند کی دھیمی روشنی میں جب میں نے اس کے چہرے پر سے کپڑا اٹھایا تو چند ساعتوں کے لئے اس کی زندگی سے عاری چہرے کو دیکھتا ہی رہ گیا وہ گویا بہت گہری اور پرسکون نیند سو رہی تھی اس کے چہرے سے بلا کا اطمینان جھلک رہا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر اس پر بے حد پیار آیا اور میں اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کر گھر چلا آیا۔

یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

کاش...... کاش، مجھ سے وہ غلطی نہ سرزد ہوئی ہوتی...... مجھے جو کچھ جیسے بھی کرنے کو کہا گیا تھا میں نے ان کے مطابق عمل کیا اور ٹھیک چند لمحوں بعد میری مارج نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا مارے خوشی کے میں کسی چھوٹے بچے کی طرح زور زور سے تالیاں بجانے لگا جیسے مجھے میرا کھویا ہوا کھلونا مل گیا ہو۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر مارج کو گلے سے لگالیا۔ مارج کا جسم نہایت سرد اور سخت تھا۔

اس کے جسم میں پہلی جیسی وہ حرارت اور زندگی مجھے محسوس نہ ہوئی جو میں پہلے کبھی کیا کرتا تھا۔

مارج کی کالی آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ بڑی ہوگئی تھیں جن میں اس کی سفیدی معدوم ہوکر رہ گئی تھی۔ مگر مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری زندگی میری محبت مجھے واپس مل گئی تھی۔ جس کے لئے میں نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی اور پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا، تو اور مجھے کیا چاہئے تھا۔

میں مارج کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگا اور اسے دنیا والوں کی نظروں سے بچا کر رکھتا۔ آفس کے اوقات پر اور جب بھی مجھے کسی کام سے کسی دوست کے پاس یا پھر سامان کی خریداری کے لئے بازار تک جانا ہوتا تو مارج کو گھر کے اندر لاک کر جاتا اسی خطرے کے پیش نظر میری عدم موجودگی میں مارج کہیں باہر نہ چلی جائے یا پھر کوئی پڑوسی گھر کھلا دیکھ کر بے دھڑک اندر نہ چلا آئے۔ میں ویسے بھی بلا وجہ اسے اکیلا چھوڑنے سے پرہیز ہی کرتا اور اپنا سارا وقت اس کے ہمراہ گزارتا۔

مارج پہلے بے حد محبت کرنے والی نرم دل لڑکی تھی جو ہر وقت ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی رہتی تھی مگر اب والی مارج کے زرد چہرے پر مسکراہٹ کبھی نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی ویرانی، سختی اور بے رحمی چھائی رہتی تھی۔ میں ہمہ وقت اسے خوش کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا مگر وہ خوش ہوکر نہ دیتی۔

ایک روز اچانک مارج نے مجھ سے عجیب فرمائش کرکے مجھے سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا کردیا۔ میں کافی دیر اس کے احساسات سے عاری چہرے کو ویران ویران نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ جہاں پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر زیر لب مسکراہٹ دیکھی تھی۔

اس نے مجھ سے انسانی گوشت کھانے کی فرمائش کی تھی ساتھ میں انسانی خون سے پیاس بجھانے کی۔

یہ سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ کیونکہ وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے انتہائی غور سے دیکھ رہی تھی۔ گویا مجھ سے میری محبت کا ثبوت مانگ رہی ہو۔ نجانے کس طرح میں نے مارج کو خوش کرنے کے لیے حامی بھرلی اور وہ خوشی سے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگانے لگی۔ میں اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ ایک عرصے بعد میں نے اسے اس قدر ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ میرے لئے یہ سب بہت عجیب وغریب تھا۔ یہ سب تو مجھ سے عاملوں نے بھی نہ کروایا تھا جو میں اب کرنے جارہا تھا، نجانے کس طاقت کے زیر اثر آکر میں ہاں کہنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ شاید یہ میری مارج سے شدید محبت ہی تھی جس میں اس کے لئے ہر وہ کچھ کرنے کو تیار رہتا تھا جو اس کے حسین لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے۔

میں نے مارج سے ایسی فرمائش کرنے کی وجہ بھی نہ پوچھی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ایک طویل نیند سے جاگنے کے بعد شاید یہ سب اس کی ضرورت تھی۔

میں مارج کو ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ جب سے وہ مجھے دوبارہ ملی تھی وہ خوش نہیں تھی، چپ چپ سی رہتی تھی اور اسے خوش کرنے کے لئے ہی میں نے جبراً دل پر پتھر رکھ کر اس کام کی حامی بھرلی تھی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا مگر پھر بھی مارج کے لئے میں نے یہ سب کرنے کی ٹھانی اور ایک روز اپنے ایک دوست کو بہانے سے گھر پر رات کے کھانے پر مدعو کرلیا۔ وہ خوشی خوشی میرے ساتھ ہولیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مارج کے بعد میں کتنا اکیلا ہوگیا ہوں۔ تنہائی مجھے کاٹتی ہے۔

لہٰذا مجھے کسی ساتھی کی ضرورت ہے اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنی محبت واپس حاصل کرلی ہے اور آج وہ اسی کی خوراک بننے میرے گھر مدعو ہے۔

میں مارج کی محبت میں اتنا خود غرض ہوجاؤں گا مجھے نہیں پتہ تھا۔ کھانے کے دوران وہ مجھ سے دوستانہ انداز میں ہنسی مذاق کی گپ شپ کرتا رہا اور میں بظاہر اس میں اس کا بھرپور ساتھ بھی دیتا رہا۔ مگر اندر ہی اندر کوئی نادیدہ طاقت بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی "میں جو کرنے جارہا ہوں وہ صحیح نہیں ہے غلط ہے انسانیت کا قتل ہے۔"

یہ تمام آوازیں اس وقت دب کے رہ جاتیں

جب کمرے کے اندر کھڑی مارج کی طرف دیکھتا جو دروازے کی آڑ سے مجھے رحم طلب نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ گویا یہ خوراک اس کے لئے ایسے ہی ضروری تھی جیسے زندہ انسان کے لئے سانس۔ اسے اپنی جانب یوں گھورتا پا کر میرے ضمیر اور میری دوستی پر مارج کی محبت پر غالب آجاتی، آخر کو میں نے اسے بڑی مشکلوں سے دوبارہ حاصل کیا تھا کیا میں اس کے لئے یہ سب بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر نہیں کرسکتا تھا تو میری محبت پر لعنت تھی۔

لہٰذا اگر یہی میری محبت کا امتحان تھا تو مجھے اس امتحان پر پورا اترنا تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک نئے عزم ایک نئے حوصلے کو محسوس کیا اور اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

مارج بے چینی سے کمرے کے اندر ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی جس بات کا مجھے اندازہ وقفے وقفے سے ابھرنے والی آوازوں سے ہورہا تھا۔ جب وہ اپنا ہاتھ بے صبری سے دروازے پر مارتی تھی گویا اپنی بے بسی کا مظاہرہ کررہی تھی کیونکہ میں نے اسے بہت زور دے کر اپنے دوست کے سامنے نہ آنے سے منع کرر کھا تھا اور اب ایک طویل انتظار اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا وہ میرے اشارے کی منتظر تھی۔ میرے دوست نے ابھرنے والی ان آوازوں پر زیادہ غور نہ کیا کیونکہ میں نے اسے سمجھا رکھا تھا کہ گھر پرانا ہے۔ لہٰذا کوئی چوہا بھی گزرے تو لکڑیوں کے چرچرانے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ میرا بے حد پرانا دوست تھا۔ میری بات پر یقین نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پھر اس کے ذہن کے کسی کونے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں اس کے اور میرے علاوہ بھی کوئی تیسرا تھا اور وہ کوئی اور نہیں مارج تھی۔

کھانے کے بعد میں نے دوست کے سامنے دو پیگ رکھے جنہیں وہ غٹا غٹ حلق سے اتارنے لگا۔ گلاس خالی ہونے کے بعد میں نے اسے دو پیگ مزید پلائے جس کی بدولت وہ جلد ہی نشے میں دھت ہوگیا اور اول فول بکنے لگا۔ میں نے پیگ کا ایک گلاس بھی نہیں پیا تھا۔ لہٰذا مجھے نشہ نہیں تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد میرا دوست نشے میں ڈوبا زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ اور میں نے آگے بڑھ کر مارج کو کمرے سے باہر آنے کی اجازت دے دی جو نجانے کب سے اس گھڑی کا انتظار کررہی تھی۔ میرے اجازت دینے پر اس کے چہرے پر خوشی کی طویل مسکراہٹ رقص کرگئی جس نے میرے جسم وجاں میں نئی زندگی دوڑا دی، اس مسکراہٹ کے لئے ہی تو میں نے یہ سب کیا تھا اور اسی مسکراہٹ کے لئے میں ایسی ہی کئی زندگیوں کی قربانی دے سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے مارج کو اپنا کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی وہ کمرے سے باہر آگئی اور میں ایک طرف کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ مارج نے اپنا منہ اس کے نرخرے سے لگایا اور پھر لبالب اس کا خون چوسنے لگی۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت مارج مجھے مارج نہیں کوئی اور ہی شیطان نما بدروح لگ رہی تھی۔ جو بڑے مزے سے اپنے گرد ونواح سے بے نیاز ایک انسان کا خون پینے میں مشغول تھی۔

میرا دوست نیند میں ہی نجانے کب زندگی کی بازی ہار گیا اور مارج اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگی۔ اپنے پیارے دوست کو میں نے اپنی محبت پر قربان کردیا تھا، نہیں معلوم تھا کہ میں مارج کو خوش دیکھ کر خوش تھا یا نہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر سوار ہو چکی تھی۔ میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ آنکھیں مارج پر جمی تھیں جو میرے دوست کا گوشت کسی جنگلی جانور کی طرح بھنبھوڑ کر چبا رہی تھی۔ مجھ سے مزید اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھا نہ گیا اور وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں چلا آیا، نجانے کتنی دیر میں بستر پر چت لیٹا رہا، ذہن مختلف سوچوں کی زد میں تھا۔

نجانے مارج کو کیا ہوگیا تھا یہ وہ مارج بالکل نہیں تھی جسے میں کبھی جانتا تھا یا پھر یہ میری مارج تھی ہی نہیں۔

میں اکثر مارج کو اس کا ماضی یاد کرواتا رہتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کیا کرتے تھے ایک دوسرے کے ساتھ کتنے خوش تھے تم میرے لئے

مزے مزے کے کھانے بنایا کرتی تھی۔

مگر پھر اچانک سفاک موت تمہیں مجھ سے چھین کر لے گئی اور اب میں نے تمہیں واپس حاصل کیا ہے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا ہے۔ میری ان سب باتوں پر مارج مجھے چپ چاپ سپاٹ چہرے کے ساتھ خالی خالی نگاہوں سے گھورتی رہتی۔ گویا اسے اپنے ماضی کی کوئی بات یاد نہ ہو۔

طرح طرح کے خیالات دل و دماغ میں سر اٹھا رہے تھے۔ دل محبت کے ہاتھوں مجبور تھا اور میرے اس قدم کو صحیح کہہ رہا تھا۔ جبکہ اس کے برعکس دماغ مجھے بار بار غلط کہہ رہا تھا۔ دل و دماغ میں جنگ کی سی کیفیت رونما تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ مارج کے جسم کے اندر مارج کی ہی روح تھی یا پھر کوئی اور شیطانی روح حلول کر گئی تھی۔

مارج کی سرد مہری اور اب یہ شیطانی عمل۔

یہ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے مارج کے اس رویے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ واپس جاگنے کے بعد ایسی کوئی چیز طلب کرے گی۔ انہوں نے میری خواہش کے مطابق مجھے میری مارج واپس لوٹا دی تھی۔ گویا ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب اس سے آگے میں جانوں یا پھر میرا رب جانے۔ نجانے کتنی دیر میں شش و پنج کی سی کیفیت میں رہا۔ ہوش تب آیا جب مارج کو کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے پایا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں میرے لئے والہانہ محبت غالباً وہ میرے اس عمل پر مجھ سے خوش ہو گئی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ڈھالے ہو گئے اور کچھ دیر قبل والی عجیب سی کیفیت گویا ختم ہو گئی۔ غالباً دل ایک بار پھر دماغ پر سبقت لے گیا تھا۔ اس کی اس خوشی کی ہی خاطر تو میں نے یہ سب کیا تھا اور اب اس کے چہرے سے وہ خوشی اور پیار جھلک رہا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی مجھے خواہش تھی، جس کا میں منتظر تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور مارج میرے قریب چلی آئی۔ وہ میرے سینے سے آ لگی تھی۔ ایک عرصے بعد میں نے مارج کو خود میں محسوس کیا تھا۔ جس کی مجھے بے انتہا خوشی تھی اس کی نرم گرم سانسیں مجھے خود میں اترتی محسوس ہوئیں۔ وہ رات میرے لئے کسی خوب صورت خواب جیسی گزری۔ میں گویا ساری رات ہواؤں میں اڑتا رہا تھا۔ میں کہاں ہوں کہاں نہیں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

کچھ دن تک تو مارج میرے ساتھ بہت اچھی رہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا مجھے میری پرانی مارج واپس مل گئی ہو۔ وہ مجھ سے اسی طرح محبت کرنے لگی تھی جیسے پہلے بھی کیا کرتی تھی۔ پہلے ہر روز آفس سے آکر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کر کے خود بھی کھاتا تھا اور اسے بھی کھلاتا تھا مگر اب تو وہ خود میرے لئے ناشتہ اور رات کا کھانا اپنے ہاتھوں سے بنانے لگی تھی۔ میرے کپڑے دھو کر انہیں پریس کرتی میرا ہر کام وقت پر کرتی غرض یہ کہ میرا اور میری ضرورتوں کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگی۔ مارج میں یہ تبدیلی میرے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھی۔ ایک انسان کی جان قربان کر کے مجھے میری مارج واپس مل گئی تھی۔ تو بھلا اس میں کیا غلط تھا؟ اب میں اپنی اس حرکت پر ذرہ بھر کو بھی نادم نہیں تھا' الٹا میرے دل کو سکون اور اطمینان نصیب ہو گیا تھا ساتھ میں اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ میری مارج ہی ہے نہ کوئی شیطانی بدروح اس دن خود بخود میں اپنی مارج کے بارے میں نجانے کیا کچھ سوچتا رہا تھا۔ جس پر میں خود سے شرمندہ تھا۔

یقیناً موت کے بعد جاگنے پر وہ خود کو ماحول سے ہم آہنگ نہیں کر پا رہی تھی اور اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایڈجسٹ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میری یہ خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔

مارج کی یہ کیفیت صرف عارضی تھی کچھ دنوں بعد اسے پھر سے انسانی گوشت اور خون کی پیاس لگی تو اس نے مجھ سے اس کی ایک بار پھر فرمائش کر ڈالی کہ میں اس کے لئے آج رات ایک اور شکار لے کر آؤں، میں یہ سن

کرسنائے میں آ گیا، میں تو سمجھا تھا کہ وہ دوبارہ مجھ سے ایسا کچھ نہیں مانگے گی مگر وہ تو جیسے میری خدمتیں کر کے بدلے میں مجھ سے ان کا صلہ مانگ رہی تھی۔

مرتا کیا نہ کرتا دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اب دوبارہ کھونے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ اب جب وہ مجھے پہلے کی طرح واپس مل ہی گئی تھی مجھ سے بے تحاشہ محبت کرنے لگی تھی میرا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی تو کیا میں اس کے لئے ایک اور انسانی جان کی قربانی نہیں دے سکتا۔

لہٰذا اس دفعہ میں نے راہ چلتے کسی مجبور اور غریب شخص کو اپنا شکار بنانے کا فیصلہ کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ایک اور دوست کو نشانہ بنا کر اپنے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کروں پہلے ہی اس دوست کی گمشدگی پر اس کے گھر والے پریشان تھے اور پولیس کی مدد سے اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اس سلسلے میں مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی مگر کوئی بات نہ بن سکی تھی وہ تو اچھا تھا کہ اسے کسی نے میرے ساتھ میرے گھر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا نہ ہی وہ گھر بتا کر آیا تھا کہ وہ میری طرف جا رہا ہے۔

یہ تمام باتیں میرے حق میں بہتر تھیں اور مجھے ایک طرح سے اس طرف سے کوئی فکر بھی نہیں تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ مارج نے اس کی لاش کی ایک بوٹی بھی نہیں چھوڑی تھی تو وہ تا قیامت بھی اس کی تلاش میں لگے رہیں تو اسے ڈھونڈ نہیں پائیں گے نہ ہی کوئی مجھ پر ہلکا سا بھی شک کر سکتا تھا اس کی موت کا ثبوت اس کی لاش کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔

چنانچہ اس رات جب میں کسی شکار کو پھانسنے کے لئے گھر سے نکلا تو اسے میری خوش قسمتی کہیں یا اس کی بد قسمتی مجھے جلد ہی گلی کی ایک نکڑ پر ایک نوجوان لڑکا مل گیا جو پاس پڑے ہوئے کوڑے دان سے اپنے لئے غالباً کچھ کھانے کے لئے تلاش کر رہا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ بے چارہ کوئی بے بس و لاچار غریب اور بھوکا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا حالات کا مارا چہرہ اور گندے میلے کچیلے کپڑے اس کی زندگی کے تمام پردے فاش کر رہے تھے۔ وہ غربت کی جیتی جاگتی مکمل تصویر تھا۔

میں اس کے پاس چلا گیا اور اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے بھوکے ہو؟“ اس نے حیرت سے گردن گھما کر میری جانب دیکھا۔ یقیناً مجھ سے پہلے اس قدر میٹھے لہجے میں شاید ہی کسی نے اس سے بات کی ہوگی۔

اس نے حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے جلدی سے ہاں میں سر ہلا کر کہا۔ ”دو دن سے۔“

”آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کھانے کے لئے کچھ دیتا ہوں۔“

میں نے اس سے کہا اور آگے ہی آگے چلنے لگا۔ میرا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ وہ مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ یقیناً وہ اس وقت شدید بھوکا تھا۔ میں دو تین بار رک کر اسے پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتا تھا کہ وہ میرے پیچھے آ بھی رہا ہے یا نہیں مگر ہر بار اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر میں واپس آگے کی جانب چلنے لگتا۔ بالآخر میں اسے لئے اپنے گھر چلا آیا۔ جہاں مارج ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے ڈائننگ ٹیبل پر بٹھایا اور خود کچن میں آ کر اس کے لئے کھانا گرم کرنے لگا۔ جس میں، میں نے بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی، اور پھر وہ کھانا اٹھا کر اس کے پاس چلا آیا۔

جیسے ہی میں نے اس کے آگے کھانا رکھا وہ کسی وحشی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا اور کسی بھوکے شیر کی طرح چپڑ چپڑ کھانے لگا، اسے اس طرح سے کھاتے دیکھ کر میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے دروازے کے پیچھے کھڑی مارج کی جانب دیکھا تو وہ بھی میری جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی اسے اپنی طرف یوں مسکراتا دیکھ کر میری مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور دل میں ایک اطمینان سا دوڑ گیا کہ میری مارج مجھ سے خوش ہے۔ ویسے بھی یہ گلی گلی سونے والا مجبور انسان غالباً اپنی زندگی سے تنگ ہوگا۔ لہٰذا اسے زندگی سے محروم کر کے میں ایک طرح سے مارج پر تو کوئی احسان نہیں کروں گا ہاں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

البتہ اس پر ضرور کروں گا۔

وہ بڑی رغبت سے کھانا کھانے میں مشغول تھا۔

جب وہ کھانا کھا کر فارغ ہوگیا تو میں نے اسے چائے پلانے کا کہہ کر روک لیا اسے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ تو میری اس عنایت پر بے حد مشکور تھا۔ یقیناً مجھ سے پہلے یہ سب کسی نے نہ کیا ہوگا۔ اس کے لئے میں خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلا آیا اور انہیں دھونے لگا تاکہ اتنی دیر جو بے ہوشی کی دوا میں نے کھانے میں ملائی تھی وہ اس پر اثر کرجائے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب میں واپس آیا تو وہ بڑے آرام سے کرسی پر ایک طرف گردن ڈھلکائے سو رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ دوا کا اثر تھا یا پھر نرم گرم کرسی کا جو اسے پہلی مرتبہ میسر آئی تھی جبھی اسے جلد نیند نے آلیا تھا۔ اسے آرام سے سوتا دیکھ کر میں نے مارج کو کمرے سے باہر آنے کے لئے کہا اور وہ اجازت ملتے ہی خوشی سے جھومنے لگی۔ اس نے آگے بڑھ کر میری پیشانی چوم لی اور مسکراتی ہوئی اپنے شکار کی جانب بڑھ گئی۔

آگے کا منظر دیکھنا میرے لئے کال تھا للہٰذا میں نے مارج کو اس کا کام کرنے دیا اور خود اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آج میرے دل میں پہلے دن کی طرح نہ کوئی ملال تھا نہ ہی ذہن میں کوئی الٹی سیدھی سوچ۔ اس وقت میں صرف اپنی مارج کو دیکھ کر خوش تھا کیونکہ وہ خوش تھی۔

نجانے کتنی دیر مارج کو اپنا کام کرنے میں لگی، میں نہیں جانتا مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اپنا کام مکمل کرکے وہ سیدھا میرے پاس میرے بیڈروم میں آئی تھی۔ اس وقت میں آنکھیں موندے بیڈ پر دراز آرام فرما رہا تھا۔ مجھے اس کی آمد کی اطلاع اس کے نرم و نازک ہاتھوں نے دی تھی۔ جنہیں وہ میرے سینے پر پھیر کر گویا مجھے شاباشی دے رہی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ دنیا جہاں کا پیار اپنی آنکھوں میں سمائے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر مارج کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کے بعد وقت کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں رہا۔

القرآن

اور اے ایمان دارو! تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاسکو۔ (النور 31)

بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ (البقرہ:222)

اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو قبول کرتا ہے۔ (المائدہ)

وہ جو بدکاریوں سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (المومنون:5)

البتہ میں اپنی نشانیوں سے زمین پر ناحق تکبر کرنے والوں کو پھیر دوں گا (الاعراف:126)

اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے پختہ عہد کی بدولت ثابت قدم رکھتا ہے (ابراہیم:27)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک پر موت وارد ہوتو کہتا ہے، اے میرے رب مجھے واپس لوٹا تاکہ میں نیک عمل کروں جہاں سے ادھورا چھوڑ آیا ہوں۔ (المومن:100,99)

(حافظ سبحان احمد۔ کراچی)

کافی دن آرام و سکون سے گزر گئے کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ مارج نے بھی دوبارہ مجھ سے ایسی ویسی کوئی فرمائش نہیں کی جس وجہ سے میں خوش اور مطمئن زندگی کے دن اس کے ہمراہ گزارتا رہا اور وہ اپنی تمام تر محبت مجھ پر نچھاور کرتی تھی اور میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ جسے اس کی بیوی دوبارہ مل گئی تھی اور اب وہ اسے بالکل اسی طرح سے چاہنے لگی تھی۔ جیسے مرنے سے پہلے چاہا کرتی تھی۔

مجھے تو اب ذرا بھر بھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا جیسے میں نے اسے دوبارہ موت کے منہ سے نکال کر

زندہ کیا ہے بلکہ اب بھی احساس رہتا تھا گویا وہ مجھ سے کبھی بچھڑی ہی نہیں تھی۔ ان سب کے باوجود میں نے کبھی کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اب کس قدر خوش رہتا ہوں۔

دنیا کے سامنے میں وہی بدقسمت شوہر تھا جس کی بیوی بھری جوانی میں اس سے بچھڑ گئی تھی اور مجھ سا دیوانہ شوہر آج بھی اس کی یاد میں گھل رہا ہے۔ حقیقت میرے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی کہ میں اپنی مارج کو واپس حاصل کرچکا تھا اور اب میری زندگی میں کوئی خواہش باقی نہیں رہی تھی۔ بچوں کی خواہش بھی نہیں۔

مارج مل گئی تھی اس سے بڑھ کر اب کوئی اور خواہش معنی نہیں رکھتی تھی۔

بہرحال یونہی ایک ماہ مزید گزر گیا اور اب میں آہستہ آہستہ مارج کی بدلتی کیفیت میں کچھ تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کچھ چڑچڑی سی ہوگئی تھی۔ بات بات پر مجھ سے الجھنے لگتی تھی اور کہتی تھی کہ ”مجھے اس کا خیال نہیں ہے۔“ اس کے ایسا کہنے پر میں سوچوں کی گرفت میں جکڑا جاتا تھا۔ ”احساس نہیں ہے مجھے؟“ یہ الفاظ مجھے سوچوں کے بھنور میں پھنسا دیتے۔ ہر طرح سے تو میں مارج کا خیال رکھتا تھا۔

چھٹی کے دن اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتا تھا سارا کام خود کرتا حتیٰ کہ کھانا بھی اسے اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلاتا پر یہ کہ ہر طرح سے اس کے آرام و سکون کا خیال رکھتا جہاں تک مجھ سے ہوسکتا تھا اس کے لئے وہ سب کرنے کی کوشش کرتا کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دیتا جو مانگتی تھی اس کے قدموں میں لاکر رکھ دیتا تھا۔ میرے دل پر تو روز اول سے اس کا راج تھا تو پھر ان سب کے باوجود وہ مجھ سے ایسا کیوں کہتی تھی۔؟؟؟

باوجود پوچھنے کے نہ بتاتی کہ میں کس طرح سے اس کا خیال نہیں رکھتا وہ بس اتنا کہہ کر خاموش ہوتی کہ ”جب تمہیں خود سے کوئی احساس نہیں ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اور یہ الفاظ مجھے سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرادیتے۔ یہ ضرور تھا کہ میں نے اسے گھر میں قید کر کے رکھ دیا تھا، باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل منقطع ہوچکا تھا اور ایسا کرنا میری مجبوری تھی اسے دنیا والوں کی نظروں کے سامنے لاکر ہم دونوں کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کرنا چاہتا تھا۔ جو مانگتی تھی خود جاکر بازار سے لادیتا تھا۔

یوں ایک عرصہ بیت گیا تھا اسے باہر کی دنیا دیکھے ہوئے لیکن اگر اس وجہ سے اس کا موڈ خراب رہتا تھا تو وہ مجھ سے اس بارے میں بات کرسکتی تھی لیکن اس نے تو ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ وجہ ہرگز نہیں تھی وہ گھر میں میرے ساتھ خوش اور مطمئن تھی تو پھر کیا وجہ تھی؟؟؟

بالآخر ایک دن حسب معمول وہ مجھ سے بنا کسی وجہ کے جھگڑنے لگی اور یوں اصل بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے کافی دیر سے تم سے خود انسانی گوشت اور خون کی فرمائش نہیں کی تو تم نے بھی اس کا احساس نہیں کیا۔ اپنی بھوک تو مٹا لیتے ہو تم میری بھوک کا کیا ہے۔“

مارج کے منہ سے نکلے ان الفاظ نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے حیرانی سے اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔ ”مارج مجھے تو لگا تھا کہ تم سدھر گئی ہو اب۔ اس لئے تمہیں ان سب کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنے دن سے تم مجھ سے اس وجہ سے ناراض ہو۔ صاف صاف کہہ دیتی بھلا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”تمہیں خود احساس ہونا چاہئے اس بات کا۔ جب میں ہر طرح سے تمہارا خیال کرتی ہوں تو تمہیں بھی میرا خیال میرا احساس کرنا چاہئے۔“ مارج نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”مارج جو کبھی مجھ سے اونچے لہجے میں بات نہ کرتی تھی۔ آج اس کا لہجہ مجھے انگشت بدنداں کررہا تھا۔

”میں بھی تو تمہارا ہر طرح سے خیال کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں میری جان بس اب میں اس بات کا ثبوت دینے کے لئے تمہاری روز روز کی فضول فرمائشیں نہیں پوری کرسکتا۔ تم انسان ہو جانور نہیں اس لئے انسانوں کی طرح رہنا سیکھو آدم خور مت بنو۔“ میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

نے درشتی سے کہا تو مارج نے شدید غصے میں آ کر شیلف پر پڑے شیشے کے گلاس زور سے زمین پر ٹرے سمیت پھینک ڈالے جو زمین پر گرتے ہی چکنا چور ہو گئے۔

مارج کی اس حرکت پر مجھے اتنا شدید غصہ آیا کہ میں نے زور سے اس کے گال پر تھپڑ جڑ دیا اور وہ لڑکھڑا کر شیلف پر جھک گئی۔ اپنے اس شدید غصے پر میں خود بھی حیران رہ گیا۔ میں نے اس سے پہلے اس پر ہاتھ اٹھانا تو درکنار اس سے اونچے لہجے میں بات تک نہ کی تھی مگر آج اس نے بدتمیزی کی حد کر دی تھی۔ لہٰذا میں خود کو روک نہ سکا۔

مارج حیرت سے اپنے گال پر ہاتھ رکھے مجھے یوں دیکھنے لگی گویا اسے مرنے سے پہلے کی تمام باتیں یاد ہوں کہ میں نے کبھی اس پر غصہ نہیں کیا تھا۔ میں اسے حیران چھوڑ کر کچن سے باہر نکل آیا اور گھر کو تالا لگا کر نزدیکی پارک میں جا بیٹھا۔ دماغ سنسنا رہا تھا اور بدن میں لرزش طاری تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے مارج کو زندہ کر کے کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔ جانے والے چلے جاتے ہیں ان کا دوبارہ اس زندہ لوگوں کی دنیا میں کوئی کام نہیں رہتا۔

مارج کو خوش رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا ہر دو دن بعد ایک انسانی جان کی بھینٹ جو کہ اب میرے بس میں نہ رہا تھا اسے میری محبت میری وفا کچھ نظر نہیں آتی تھی اگر اسے مجھ میں کچھ دکھائی دیتا تھا تو وہ صرف ایک شکاری تھا جو اسے ہر دو دن بعد شکار لا کر دے سکتا تھا۔

میں کافی دیر خالی بنچ پر بیٹھا ہر نکتے پر غور کرتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اب میں کسی طور بھی اس کی یہ فرمائش پوری نہیں کروں گا۔ چاہے وہ کیسی ہی ضد کیوں نہ کرے اب میں مزید اس کی خوشی کے لئے کوئی انسانی جان ضائع نہیں کروں گا اس بار میرا ضمیر میری محبت سے جیت گیا تھا۔

شام ڈھلے میں گھر واپس آیا تو مارج دوڑ کر آ کر میرے سینے سے آ لگی اور مجھ سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگنے لگی۔ میں نے اس کی نادانی سمجھ کر اسے معاف کر دیا۔ یوں کچھ دن مزید سکون سے گزر گئے۔

تاہم چند دنوں بعد میں پھر محسوس کرنے لگا تھا کہ مارج کی طبیعت بگڑنے لگی تھی اس کی طبیعت میں عجیب سا اضطراب اور بے چینی اُمڈ آئی تھی۔ جو اس کی حرکات و سکنات سے واضح ہوتی تھی گو کہ اس نے مجھ سے دوبارہ انسانی گوشت اور خون کی فرمائش نہیں کی تھی مگر میں اس کی دلی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس کے منہ کو انسانی گوشت اور خون لگ چکا تھا۔ جس کے بغیر رہنا اب اس کے لئے مشکل تھا۔ لہٰذا ان سب کی ایک بار پھر شدید طلب محسوس ہونے لگی تھی۔ کیونکہ بڑی دیر گزر گئی تھی اسے یہ چیزیں میسر نہیں آئی تھیں۔ میں نے اس کی بدلتی کیفیت کو بہ خوبی نوٹ کیا تھا مگر اس سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ میں خود سے عہد کر چکا تھا کہ اب جو مرضی ہو جائے میں یہ گناہ کسی قیمت پر نہیں کروں گا۔

اور پھر میری زندگی میں وہ رات بھی آئی جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا اور جسے یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس روز کھانا کھانے کے بعد میں ٹی وی کے آگے بیٹھا کوئی ہارر مووی دیکھ رہا تھا، مارج بھی میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی کہ یکبارگی فلم کے اندر آدم خوروں کو سفاکی سے انسانی گوشت کھاتے ہوئے دکھایا جانے لگا۔ جنہیں دیکھ کر مارج کی حالت بگڑنے لگی اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور میرے پاس سے اٹھ کر سامنے کسی اور صوفے پر جا بیٹھی۔ میں اس کی حالت سے واقف ہوتے ہوئے بھی انجان بنا رہا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کی حالت پر ترس آئے اور میں ایک بار پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤں۔

مارج کی حالت اعتدال پر لانے کے لئے میں نے ٹی وی پر چلتی فلم بدل دی اور خبروں کے چینل کو بدلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مارج کی حالت بہتر ہو گئی تھی مگر اس کی آنکھوں کی سفیدی غائب ہو گئی تھی۔ صرف کالی کالی آنکھیں باقی رہ گئی تھیں۔ مجھے اس کی نظروں کی

تپش اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تو میں نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا اور یہ دیکھ کر ساکت رہ گیا کہ مارج مجھے ہی یک ٹک گھور رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

میں نے اس سے کوئی بات کرنے کے بجائے اپنا چہرہ واپس ٹی وی کی طرف پھیر لیا۔ مگر میں مسلسل اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا، میں نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا تو اس بار میرے دیکھنے پر وہ مسکرا دی اور میں نے دو نوکیلے دانت واضح اس کے ہونٹوں سے باہر دیکھے اور مجھے سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چیختی ہوئی مجھ پر کسی درندے کی طرح جھپٹی۔

یہ حملہ میرے لئے غیر متوقع تھا لہٰذا میں خود کو سنبھال نہ سکا اور مارج نے اپنے نوکیلے دانت میرے دائیں بازو پر گاڑ دیئے۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یوں لگا گویا گرم گرم سیسہ میرے اندر اتر گیا ہو۔ بہ مشکل ضبط کر کے میں نے خود کو مارج کی گرفت سے چھڑایا اور اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔

عورت ذات تھی میرے بھرپور دھکا دینے سے پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگی اور زمین پر گر گئی۔ میرے بازو سے گرم گرم خون بہہ کر نیچے فرش پر گر رہا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ میرے بازو کا گوشت مارج کے منہ میں نہ آسکا تھا اس سے پہلے ہی میں خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے زخم پر دوسرا ہاتھ رکھ کر اسے دبا دیا تاکہ خون بہنا بند ہو سکے۔

شدید درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔ اتنے دنوں سے مارج کو کوئی شکار نہ ملا تھا، اپنی بھوک مٹانے کے لئے وہ مجھ پر پل پڑی تھی۔ لیکن میں ایسا ہرگز ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ میں مارج کی خوراک بالکل نہیں بن سکتا تھا۔ شاید میری محبت مارج کے لئے ابھی اس قدر بھی نہیں تھی کہ میں خود ہی اس کا نوالہ بننا پسند کرتا۔

یوں بھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ میری مارج ہرگز نہیں تھی جسم مارج کا تھا مگر اس کے اندر موجود روح کوئی شیطان نما بدروح تھی۔ میری مارج میرے لئے اپنی جان دے سکتی تھی مگر اپنی خوشی کے لئے میری جان ہرگز نہیں لے سکتی تھی۔ لہٰذا یہ جو کوئی بھی تھی مارج بالکل نہیں تھی۔

مارج غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی دیوار کے ساتھ زور سے لگنے کے باعث وہ مزید خونخوار ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ بھی بے حد بھیانک ہو گیا تھا اور میں کہوں گا وہ میری مارج کا چہرہ بالکل نہیں تھا۔ وہ کسی شیطان کا چہرہ تھا۔ جسے دیکھ کر میں خود پسینہ پسینہ ہو گیا۔ بڑے بڑے دانت ہونٹوں سے باہر تھے۔ جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ کالی سیاہ آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں اور چہرے پر جابجا زخموں کے نشان تھا۔ وہ کسی طور بھی مارج کا چہرہ بالکل نہیں تھا ہرگز نہیں تھا۔

آج صحیح معنوں میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں نے محبت میں اندھا ہو کر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ مارج مجھ پر ایک بار پھر حملہ آور ہوتی میں نے کمرے سے باہر کی جانب دوڑ لگا دی اور فوراً سے پیشتر باہر کے کمرے کو بند کر دیا۔

مارج پاگلوں کی طرح دروازے پر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی غراہٹیں کسی درندے سے مشابہہ تھیں۔

میرا دل بری طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور پسینہ کسی پانی کی طرح پورے بدن پر بہہ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دروازہ توڑ کر مجھے کچا چبا جائے۔ میں چند لمحے ہراساں نگاہوں سے دروازے کو گھورتا رہا۔ جس پر مارج وحشیانہ انداز میں تابڑ توڑ حملے کرنے میں مصروف تھی۔ میرے جسم پر کپکپی طاری تھی، میں اسے کمرے میں بند چھوڑ کر اپنے زخم پر مرہم لگانے لگا۔ یہ سب کچھ میرے لئے نہایت خوفناک اور دل دہلا دینے والا تھا۔ اگر میں پھرتی نہ دکھاتا تو آج مارج کا نوالہ بن چکا ہوتا۔

شدت غم سے میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اپنی مارج کو اس حال میں لانے والا میں خود تھا۔

کاش! میں نے محبت میں اندھا ہو کر یہ سب نہ

کیا ہوتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا دل میں درد کا شدید غبار اٹھا جو آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہنے لگا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

مارج کی چیخیں مسلسل جاری و ساری تھیں۔ وہ برابر دروازہ توڑ دینے کی کوششوں میں تھی۔ میرا گھر رہائشی علاقے سے ذرا فاصلے پر تھا۔ لہٰذا مجھے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ کوئی پڑوسی شور سن کر یہاں چلا آئے گا۔

ساری رات میرا دل مارج کی حالت پر روتا کڑھتا رہا۔ صبح کی سفیدی سے پہلے پہلے مارج کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ نجانے وہ اندر سو رہی تھی یا کیا کر رہی تھی میں نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی میں خود میں اتنی ہمت جمع کر پا رہا تھا کہ اندر جا کر دیکھ سکوں کہ اب وہ کس حال میں ہے۔ میرے زخم سے درد ابھی تک نہیں گیا تھا اور پھر جو کچھ مجھ پر گزری تھی اسے سوچ سوچ کر ساری رات کا جاگا ہوا، میں باہر صوفے پر ہی سو گیا۔ نجانے کب تک سوتا رہا۔

آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ مجھے اتنی دیر سو جانے پر خود پر حیرت ہوئی۔ شاید یہ سب میرے زخم کی وجہ سے تھا جبھی مجھ پر غنودگی چھائی رہی تھی۔ میں چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا اور کان لگا کر دوسری طرف سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اندر گہری خاموشی طاری تھی۔ شاید مارج دوبارہ نہیں چیخی تھی ورنہ میری آنکھ کا کھلنا یقینی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مارج کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہی تھا اور اب اسے ٹھیک کرنا بھی میری ہی ذمہ داری تھی۔ میں نے بہ مشکل تمام خود میں تمام ہمت و حوصلے کو یکجا کیا اور واپس اس کمرے کی طرف آیا جس کے اندر مارج بند تھی۔ آخر کو وہ میری پیاسی بیوی تھی خواہ اس کے اندر کچھ بھی ہو جسم تو اس کا تھا نہ۔ اور اس کے اس جسم کو میں اس اذیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ بدروح مارج کے جسم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابض آ جاتی اور خود باہر جا کر لوگوں کا شکار کرنے لگتی اس سے پہلے پہلے مجھے اپنی مارج کے جسم کو اس سے آزاد کروانا تھا اور یہ کام مجھے کسی پادری کے بنا ہی سرانجام دینا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے بآہستگی اندر کی جانب دروازہ کھول دیا۔

لیکن یہ کیا، پورا کمرہ خالی پڑا تھا، مارج اندر کہیں نہیں تھی، میں نے باہر ہی کھڑے ہو کر کمرے کے چاروں طرف کونوں میں نگاہیں دوڑائیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور نارمل تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے پڑی تھی۔ پھر مارج کہاں چلی گئی؟ کمرے میں دوسرا کوئی اور دروازہ بھی نہیں تھا جس سے اندر باہر آیا جا سکتا۔ ایک ہی دروازہ تھا جس کے آگے میں ایستادہ تھا۔

میں نے جونہی کمرے کے اندر کا جائزہ لینے کی غرض سے قدم رکھا یکلخت مارج نے مجھ پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور اپنے نوکیلے دانت ایک بار پھر میرے اسی زخم میں پیوست کر دیے۔ اس اچانک افتاد پر میں بوکھلا گیا اور درد کی اذیت سے میری چیخیں نکل گئیں۔ وہ دروازے کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھی اس کی اس ہوشیاری پر میں انگشت بدنداں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو مارج کے نوکیلے دانتوں سے آزاد کروایا اور اسے زور سے پیچھے کی جانب دھکا دیا، وہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ میرے زخموں سے ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا اور درد تھا کہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

مارج کی وحشت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ گزشتہ رات کی ہی طرح گوشت کی بھوکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بدروح اس کے جسم پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔

مارج نے اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ کرنا چاہا اس بار میں ہر حملے کے لئے بالکل تیار تھا میں نے اپنا فولادی مکا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا جسے وہ سہہ نہ سکی اور چیختی ہوئی صوفے سے پیچھے جا گری۔ اگرچہ مارج کے جسم کو چوٹ دیتے ہوئے میرے اپنے دل کو چوٹ لگ رہی تھی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں مجبور تھا اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے نقصان پہنچانے

سے گریز نہ کرتی۔ میں نے مارج کے گرے ہونے کا فائدہ اٹھایا اور بھاگتا ہوا کچن میں آیا۔

میں نے تیزی سے شیلف سے تیز دھار گوشت کاٹنے والا چھرا اٹھایا اور دل میں بچے کچھے تمام جذبات کو روند ڈالا۔ یہ میری مارج کا جسم ضرور تھا مگر یہ مارج نہیں تھی اور پھر اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

مجھے ہر حال میں مارج کے اندر موجود بدروح کو واپس اسی جگہ پہنچانا تھا جہاں سے وہ آئی تھی میں واپس اس کمرے میں آیا تو مارج اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آناً فاناً اس کے گلے پر تیز دھار چھرا پھیر دیا۔ مارج کی آنکھیں مزید باہر کو ابل آئیں اور حلق سے عجیب و غریب غراہٹیں نکلنے لگیں۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ مگر میں نے بہ مشکل خود کو کسی طرح سنبھالے رکھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ایک بار پھر چھرا مارج کے پیٹ میں گھونپ دیا، وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگی اس کی آنکھوں میں میرے لئے بے پناہ نفرت تھی۔ میں بھی سپاٹ چہرے سے اسے دیکھتا رہا۔

چند لمحوں بعد وہ ایک دم ساکت ہوگئی۔ اس کے جسم میں اب کوئی جان باقی نہ رہی تھی، میں کافی دیر تک اس کے چہرے کو گھورتا رہا اس کے چہرے پر زندگی کی رونق تو پہلے بھی نہ رہی تھی اب بس وہ ہلنے جلنے سے ہمیشہ کے لئے معذور ہوگئی تھی۔

وہ ایک بار پھر موت کی آغوش میں جا سوئی تھی۔

میں نے الماری میں سے صلیب نکال کر اس کے گلے میں ڈال دی تو رفتہ رفتہ اس کے چہرے کے خدوخال بدلنے لگے۔ کچھ ہی پل میں میرے سامنے میری وہی معصوم مارج تھی جسے دیکھ کر میں جیتا تھا۔ چند لمحے پہلے جو چہرے پر خوفناکی تھی وہ اب نہ رہی تھی۔

مارج کا خوبصورت چہرہ دیکھ کر میں ایک بار جذباتی ہوگیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھے نجانے کب تک دھواں دھار روتا رہا۔ یہ سچ تھا کہ اگر مارج کا روپ نہ بدلتا تو شاید میرے لئے یہ سب کرنا ناممکن ہوجاتا۔

روتے روتے کب رات اتر آئی پتہ ہی نہ چلا۔

میں نے بمشکل اپنے دل کو سنبھالا اور آنسو پونچھتا ہوا آخری تیاریاں مکمل کیں اور جس خاموشی سے میں نے مارج کو قبر سے نکالا تھا۔ ٹھیک اسی خاموشی سے میں نے مارج کو اپنے ہاتھوں سے اسی قبر میں اتار دیا۔

میرا ضبط ایک بار پھر جواب دے گیا اور میں وہیں بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ میں مارج کے اس انجام پر اور اپنی نادانی پر پشیمان تھا۔

کاش! میں وقت سے پہلے سنبھل جاتا اور اس حقیقت کو قبول کرلیتا کہ مارج اب نہیں رہی تو آج اس کا یہ حال نہ ہوتا جو ہوا۔ جو ہونا تھا ہوچکا اور اب پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

دنیا والوں کی نظر میں، میں ایک باوفا شوہر ہوں جو آج بھی اپنی بیوی سے دیوانوں کی طرح محبت کرتا ہے جو کہ گھنٹوں اس کی قبر پر بیٹھا رہتا ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ میں کس اذیت سے دوچار ہوا ہوں اور ان سب میں کسی کا کوئی قصور نہیں، جو تھا میرے اپنے دل کا کیا دھرا تھا، میں نے ہی محبت میں اندھا ہوکر ''بلیک میجک'' کرنے والے گندے لوگوں کا اعتبار کیا جس پر میں اپنی ساری زندگی بھی رونے بیٹھ جاؤں تو کم ہے۔

میری یارج میری اپنی غلطی کی وجہ سے دو دفعہ مجھ سے بچھڑی تھی کہ دل سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ شاید پہلے میں سنبھل جاتا مگر اب تو جینا محال لگنے لگا تھا، دل پر منوں بوجھ پڑ گیا تھا۔ جن ہاتھوں سے میں نے اسے زندہ کیا تھا، انہی ہاتھوں سے میں نے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا، تاہم ان سب کی وجہ سے میں نے اب ایک حقیقت کو قبول کرلیا تھا کہ مارج اسی دن مرچکی تھی جس دن وہ پہلی مرتبہ قبر میں اتاری گئی تھی۔ اور اب مجھے اسی حقیقت کے سہارے اور اس کے ساتھ گزاری ہوئی یادوں کے سہارے اپنی باقی کی زندگی گزارنی تھی۔



قاتل

احسان الحق

جب کسی وفادار عورت کے جذبات سے کھیل کر اسے کچل دیا جائے تو جیتے جی مرجاتی ہے مخلص عورت اور پھر معاشرے میں ناقابل فراموش کہانیاں جنم لیتی ہیں کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

ایک روح کی دیدہ دلیری کے اس نے اپنا انتقام لے کر چھوڑا......ایک حقیقی کہانی

صبح ہوئی!۔۔۔نئے دِن کا سورج چمکا۔ سورج کی پہلی کرنوں نے اُس کے چہرے کا احاطہ کیا تو اُسے ایک جھنجلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایک طویل سانس لیتے ہوئے اُس نے انگڑائی لی اور نیم وا آنکھوں سے اِرد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے یکدم اپنے ہاتھ کو ڈبل بیڈ کے بائیں جانب پھیرا۔ انداز ایسا تھا جیسے کسی کو ٹٹولا جارہا ہو۔ پھر جیسے اُسے ایک دھچکہ سا لگا!

"مارتھا!؟!" اُس کے منہ سے ہلکے سے نکلا۔ "مارتھا؟" اُس نے دوبارہ سے زیرلب یہ نام پکارا۔ پھر اپنا سر جھٹکا۔ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اُس نے پھر سے خودکلامی کی۔ "سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ کرسی جس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔" اُس نے بستر کے سائیڈ پر رکھی کرسی کی جانب دیکھتے ہوئے زیرلب کہا۔ کرسی اپنی صحیح سالم حالت میں تھی۔ کرسی کو مسلسل گھورتے ہوئے اُس

نے پھر سے خودکلامی کی۔ ”آہ۔۔۔ستیاناس ہو۔۔۔یہ سب ایک خواب تھا۔ ایک ڈراؤنا خواب۔“

”ضروری نہیں کہ سب کچھ خواب ہی ہو، ڈارلنگ!“ ایک نسوانی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ یہ مارتھا کی آواز تھی۔ آنجہانی مارتھا! ایک ہفتہ قبل قتل کی جانے والی مارتھا۔

مارتھا کی آواز گویا اُس کے وجود پر بھاری پڑ رہی تھی۔ ایک ظالم نے اُس حسینہ کو مار ڈالا تھا۔ مارتھا جو ایک حسن کا شاہکار عورت تھی۔ آخر کمی کیا تھی اُس میں۔ ہنستی، نکھرتی، بھرپور نسوانی جسم کی مالک، کھلتی ہوئی مسکراہٹ چہرے پر ہر دم سجائے، مارتھا! کہ جس کی ہر ہر ادا پر صنف کرخت مر مٹے، قابل قبول تو تھی وہ!۔۔۔ لیکن افسوس کہ اُس کا قصور بتائے بغیر اُس کی ہنستی کھیلتی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ عدالتیں بھی کسی کو یونہی سزائے موت نہیں سنایا کرتیں تو مارتھا کو تو۔۔۔ سچ ہی تھا! وہ مر چکی تھی۔ ابدی نیند کے ساگر میں کہیں گم کر دی گئی تھی۔

”ڈارلنگ اُٹھو بھی اب صبح ہو چکی ہے، یہ لو میں بیڈ ٹی بھی لے آئی ہوں!۔۔۔ جلدی سے اُٹھ جاؤ اب۔۔۔“ مارتھا کے الفاظ ایک بار پھر سے اُس کے کانوں میں گونجے تو ایک انجانے خوف کے احساس کے ساتھ اُس نے اردگرد دیکھا۔ کمرا خالی تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں وحشت بھرے آنسو تھے۔ یقیناً متواتر رونے سے اُس کی آنکھیں سوجن کا شکار تھیں۔ کمرے میں اُس کے سوا کوئی نہ تھا تو پھر یہ مارتھا کی آواز کہاں سے آ رہی تھی؟

”اُٹھو، فریش ہو جاؤ! نہیں تو دفتر سے پھر دیری ہو جائے گی اور تمہارے باس کو تم سے شکایت بھی!“ دوبارہ سے مارتھا کی آواز سن کر اُس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا لیکن کمرا خالی تھا۔

”نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ قطعی نہیں ہو سکتا۔ مارتھا مر چکی ہے۔۔۔ہاں!۔۔۔مارتھا مر چکی ہے۔“ اُس نے اپنے آپ میں خوف و ڈر کے ملے جلے احساسات کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے عجب سی خود کلامی کی تھی۔

”بھلا ایک وجود، جسے موت لے جا چکی ہو، جس وجود کی روح ٹکڑوں میں بکھیر گئی ہو گی، اِک بھرپور زندگی کے آثار ختم، ایک ایسا وجود جو ایک پتھر نما کیفیت میں مبتلا کر دیا گیا، تو اُس کی روح کیسے واپس آ سکتی ہے۔ لے جانے والا روح لے گیا، تمام تر جذبات و احساسات تو لے گیا، وہ!۔۔۔ نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ مارتھا مر چکی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے جیسے تیسے بستر سے اُٹھتے ہوئے نہایت عجلت میں کپڑے تبدیل کئے اور اس خوفناک آسیب زدہ کمرے سے ہی نہیں بلکہ اپنے گھر سے بھی باہر کی جانب بھاگنے کی، کی۔ باہر آتے ہوئے اُس نے گھر کا مرکزی دروازہ مقفل کرنے کی بھی زحمت نہ کی۔ اُس کی منزل پیٹر جوہن کا اپارٹمنٹ تھا لیکن اُسے پیٹر کے اپارٹمنٹ میں پیٹر سے ملاقات نہیں کرنا تھی۔

نزدیکی ٹیلی فون بوتھ سے کال ملا کر اُس نے کسی طرح پیٹر کو قائل کر لیا کہ وہ چاہے چند منٹوں کے لئے سہی لیکن اُس سے ملاقات ضرور کرے۔ پیٹر نے حامی بھر لی تھی لیکن پیٹر نے آخری جملہ کہتے ہوئے نہایت بے قدری سے فون بند کیا تھا۔

”ٹھیک ہے، مَیں آ رہا ہوں، اسٹریٹ پارک کے بنچ پر میرا انتظار کرو لیکن دس منٹ سے زیادہ ملاقات کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ only ten minutes اوکے!“ پیٹر نے کہا اور اُس نے فوری رابطہ منقطع کر دیا۔ ریسیور میں سے ”ٹھک۔۔۔ٹو وو۔ٹو وو ٹو وو۔۔۔“ کی آواز کو سن کر اُس نے جھنجھلا کر ریسیور کی جانب دیکھا اور زور سے اُسے بوتھ کے کریڈل پر واپس رکھتے ہوئے ایک بھرپور گالی پیٹر کی نذر کی۔ ”سالے! فون مَیں نے کیا ہے اور بند تُو خود کر رہا ہے۔ آداب بھول گیا ہے۔۔۔“

تھوڑی دیر میں پیٹر نے اپنا وعدہ وفا کر دیا تھا۔ وہ آ گیا تھا۔

”بولو کیا بات ہے؟“ پیٹر نے روکھائی سے پوچھا۔

”یہاں بتانا مشکل ہے!“ اُس نے مختصراً کہا۔

''تو پھر؟''

''کل میرے گھر آجانا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ۔۔۔''

''مارتھا مری نہیں، بلکہ زندہ ہے!'' اُس نے پیٹر کی بات کاٹتے ہوئے اپنے مدعا کی بات کی تو پیٹر نے عجیب ٹیڑھا سا منہ بنا کر اُس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''وہاٹ!''

''ہاں یہ سچ ہے، وہ مری نہیں ہے! وہ زندہ ہے۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' پیٹر ہسٹریائی کیفیت میں غرایا۔

''ہاں مَیں ٹھیک ہوں، دماغ تمہارا ٹھکانے پر نہیں ہے، نہ کبھی تھا!''

''اوکے۔۔۔ میں سمجھ گیا! تمہیں ایک اچھے نفسیات دان کی ضرورت ہے، اور کچھ نہیں!۔'' پیٹر یہ کہتے ہوئے بنچ سے اُٹھ گیا۔

''کل رات نو بجے! ضرور آجانا، میں اپنی بات پر اب بھی قائم ہوں، مارتھا مری نہیں بلکہ اب بھی زندہ ہے!'' پیٹر اُس کی ایک نہ سنتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

☆......☆......☆

بارہ ضرب بارہ کے ایک کمرے میں دو آدمی آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ پہلا دوسرے کو بتا رہا تھا کہ۔۔۔

''رات نو بج کر دس منٹ پر نائن وَن وَن پر کال وصول ہوئی تھی کہ اُس نے پیٹر کو جان سے مار دیا ہے۔ پولیس، فورینزک اور میڈیکل اسٹاف جب عمارت پر پہنچے تو قاتل نے خودسوزی کرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی قتل کر ڈالا تھا لیکن جو کچھ وہاں ہوا تھا، اُسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔''

''ایسا بھی کیا ہوا تھا، وہاں؟'' جونیئر آفیسر مارکس نے سوال کیا تو ڈی ٹیکٹیو پال نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مزید بتانا شروع کیا۔

''کمرے میں داخل ہوتے ہی خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ہر شے جیسے سرخ رنگت میں نہلا دی گئی ہو۔ قاتل نے اپنی شہ رگ خود ہی کاٹ ڈالی تھی۔ پولیس والوں نے وہاں اُس کے کمرے میں ایک کرسی پائی جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ غالباً دھینگا مشتی میں ایسا ہوا ہوگا اور بالآخر قاتل پیٹر کے پیٹ، گردے، سینہ، دل اور ماتھا چیرنے میں کامیاب رہا۔ پیٹر پر خنجر کے پے در پے وار کئے گئے تھے۔ بے چارے کا قیمہ کردیا گیا تھا۔''

''یہ سب کچھ کرنے کی اُسے کیا ضرورت پیش آئی تھی؟'' ٹھینگنے سے قد کے جونیئر آفیسر مارکس نے سوال کیا۔''بلاوجہ تو کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا!''

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مارکس!'' ڈی ٹیکٹیو پال اینڈرسن نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔''تفتیشی ٹیم سے معلوم ہوا ہے کہ پیٹر نے تقریباً ایک ہفتہ قبل مارتھا کو طلاق دے دی تھی۔ اور طلاق کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ مارتھا ایک سوشل اور خوبصورت عورت تھی لیکن اِس اچانک حادثے نے اُس کی بسی بسائی دُنیا اُجاڑ دی تھی۔ پیٹر اُس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ وہ اُس کے ساتھ مخلص تھی۔ اِس واقعہ نے مارتھا کو جیتے جی مار ڈالا تھا۔ وہ پراگندگی ذہنیت کی وجہ سے مالیخولیا، اسکیزوفرینیا اور ہسٹیریا جیسے بے قابو نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوگئی تھی۔ نشہ آور ادویات نے اور بھی کباڑا نکال دیا۔

مارتھا کو پیٹر کے ساتھ بیتائے لمحوں میں اپنی ہی کہی باتیں سنائی دیتی تھیں، لیکن اپنے تئیں وہ خیال کر چکی تھی کہ اُس کی موت واقع ہوچکی ہے، یہ نیوروسز کی خوفناک قسم ہے۔ اِن امراض کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مارتھا نے اپنے بے وفا شوہر پیٹر کے ساتھ کیا۔ جب کسی وفادار عورت کے جذبات سے کھیل کر اُسے کچل دیا جائے تو جیتے جی مر جاتی ہے مخلص عورت! اور پھر معاشرے میں ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے جونیئر آفیسر کی جانب افسوس سے دیکھا۔'' ہاں مارکس! ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں!!! جیسی مارتھا اور پیٹر کی یہ خونی کہانی!''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

اندھیرے سے اجالا

ملک فہیم ارشاد-ڈجکوٹ فیصل آباد

پانچویں قسط

خوف کی وادی میں اٹکھیلیاں کرتی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی، جسم و جاں کے رونگٹے کھڑے کرتی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش پل پل لمحہ لمحہ اچنبھے میں ڈالتی خیر و شر کی کہانی

حقیقت سے روشناس کراتی اپنی نوعیت کی عجیب وغریب دماغ سے محو نہ ہونے والی روداد

"تم نے صاف اور کھرا راستہ چنا ہے اب اوپر والا تمہارا ساتھ دے گا کیونکہ جب انسان اوپر والے کا راستہ چن لیتا ہے تو پھر ہر منزل آسان ہوجاتی ہے راہوں میں بچھے سارے کانٹے صاف ہوجاتے ہیں۔" سنتوش نے ساکھشی کو سمجھاتے ہوئے کہا اور پھر واقعی ہمت مرداں مدد خدا والی بات ہوئی کچھ دنوں بعد ساکھشی کی ماں کی اچانک بہت زیادہ طبیعت خراب ہوگئی انہیں اسپتال لے جایا گیا ڈاکٹروں کے علاج کے بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی لیکن جب ان کی ٹیسٹ کی رپورٹیں آئیں تو ایک حیران کن خبر سامنے آئی ساکھشی کی ماں کو کینسر تھا۔

یہ رپورٹیں دیکھ کر سب پریشان ہوگئے۔ "یہ کیا ہوگیا سنتوش۔" ساکھشی روتے ہوئے بولی اس نے چوری چھپے اسلام قبول کرلیا تھا۔

"حوصلہ رکھو ساکھشی۔ اوپر والا اچھا کرے گا۔" سنتوش نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"مم...... مم...... میری ماں......" ساکھشی نے روتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کچھ نہیں ہوگا تمہاری مما کو۔" سنتوش نے یقین سے لاکٹ کی زنجیر میں انگلی گھمائی۔

"پر کینسر کا تو کوئی علاج نہیں۔" ساکھشی نے روتے ہوئے بولی۔

"دیکھو ساکھشی تم ہی مجھے بتارہی تھی کہ مایوسی گناہ ہے جب سب دروازے بند نظر آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی دروازہ ضرور کھلا ہوتا ہے صرف اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے تم نے تو پھر اوپر والے کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلیا ہے اب اسے ڈھیلی نہ چھوڑو بلکہ مضبوطی سے پکڑو وہ ضرور بہتر کرے گا" سنتوش نے ساکھشی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا ویسے بھی ساکھشی نے چوری چھپے نماز پڑھنا شروع کردی تھی۔

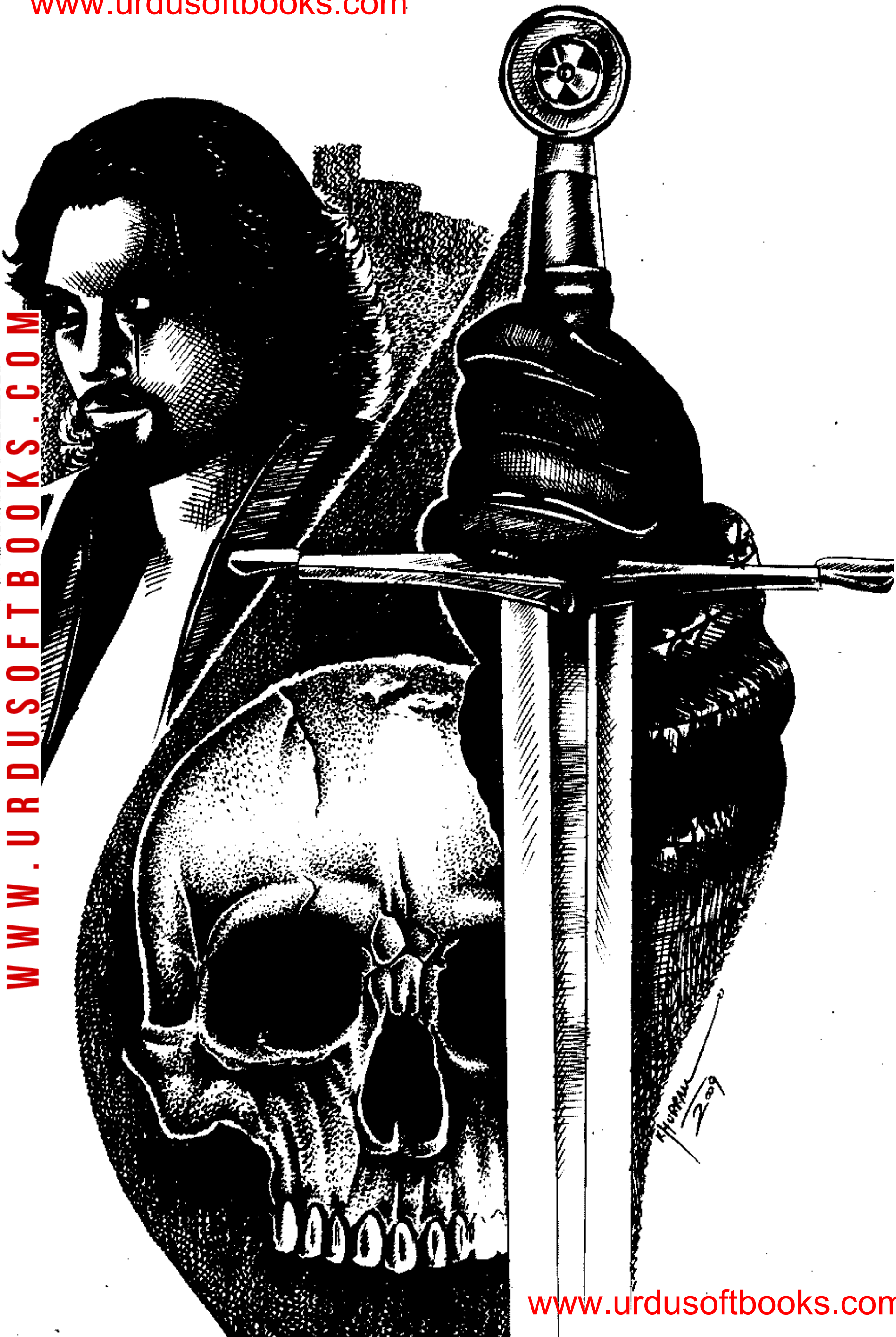
اور پھر ایسا ہوا کہ ساکھشی کی ماں کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوگئی ایک دن عبداللہ بھی ساکھشی کی ماں کی خبر لینے آیا۔

"آنٹی جی کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔" عبداللہ نے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہوں مرنے کے لئے دن گن رہی ہوں۔" ساکھشی کی ماں خشک لہجے میں بولی۔ شاید اسے عبداللہ کا یہاں آنا پسند نہیں آیا تھا۔

"اللہ پر بھروسہ رکھئے آنٹی وہ آپ کو ضرور ٹھیک کردے گا۔" عبداللہ نے ساکھشی کی ماں کا خشک رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ میری مرتو طے ہے



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

"ساکھشی کی ماں کا لہجہ بدستور خشک تھا۔

"زندگی اور موت آنٹی جی اللہ کے ہاتھ میں ہے آپ اللہ پر بھروسہ رکھئے وہ آپ پر اپنی خاص رحمت کرے گا میں آپ کے لئے دم کیا ہوا پانی لے کر آیا ہوں بسم اللہ شریف میں بڑی طاقت ہے، آپ اسے باقاعدگی سے پیتی رہیے گا انشاء اللہ ہر بیماری آپ کے جسم سے نکل جائے گی۔" عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو سرکھشنا نے کوئی جواب نہ دیا عبداللہ نے پانی کی بوتل سرکھشنا کے بیڈ کے ساتھ اٹیچ ٹیبل پر رکھ دی عبداللہ سرکھشنا کے کمرے سے باہر نکل آیا ساکھشی نے اسے آواز دی...... "کچھ کھا تو لو۔"

"نہیں بس شکریہ میں آنٹی کی تیمارداری کے لئے آیا تھا اب میں چلتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔

"میری ماں کی باتوں کا برا نہ ماننا۔" ساکھشی شرمندہ لہجے میں بولی۔

"نہیں نہیں طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

"اس پانی کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔" ساکھشی کمرے میں داخل ہوئی تو سرکھشنا نفرت سے بولی۔

"ممی جی ایسا نہیں کرتے گھر آئے مہمان سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔" سنتوش نے سرکھشنا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"سنتوش بیٹا ایسے لوگوں سے دوستی نہیں رکھنی چاہئے یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔" سرکھشنا نے الٹا اسے سمجھانا شروع کردیا۔

"ٹھیک ہے میں نہیں ملتا اس سے آپ یہ پانی ادھر ہی رہنے دیجئے کچھ نہیں کہتا یہ آپ کو۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ رات کا وقت ہوگا جب اچانک سرکھشنا کے سر میں درد شروع ہوگیا اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا درد اتنا شدید تھا کہ سرکھشنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا اس نے دیکھا واش روم کا دروازہ بند تھا یعنی ساکھشی واش روم میں تھی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ساکھشی سرکھشنا کے ساتھ ہی سوتی تھی اس نے ساکھشی کو آواز دینے کے لئے منہ سے آواز نکالنی چاہئے مگر اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی سرکھشنا کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے اس نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں تو پاس ہی ٹیبل پر عبداللہ کی دی ہوئی پانی کی بوتل نظر آئی اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ بوتل اٹھالی اور ڈھکنا کھول کر بوتل منہ سے لگالی۔

اس پانی کا حلق سے نیچے اترنا تھا کہ درد فوری طور پر غائب ہوگیا۔ سرکھشنا نے بوتل ہونٹوں سے ہٹائی اب سر میں بالکل بھی درد نہیں تھا۔

"نہیں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے......" سرکھشنا نے حیرانگی سے بوتل کو گھورتے ہوئے کہا۔

اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا پھر اس نے بوتل کا ڈھکنا لگا کر بوتل سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

اسی وقت ساکھشی بھی واش روم سے باہر نکل آئی۔

"ارے...... آپ اب تک جاگ رہی ہیں۔" ساکھشی نے حیرانگی سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی میرے سر میں اچانک شدید درد شروع ہوگیا تھا پر تو......" سرکھشنا سانس لینے کے لئے رکی۔

"اوہ...... تو...... تو آپ مجھے بلالیتیں اور یہ بوتل میں پانی کیوں کم ہے۔" ساکھشی ماں کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"بیٹی منہ سے کچھ بولا ہی نہیں جارہا تھا پھر میں نے عبداللہ کی دی ہوئی بوتل اٹھائی اور ڈھکنا کھول کر منہ سے لگالی، پانی کا حلق سے اترنا تھا کہ میرا درد فوری طور پر غائب ہوگیا۔" سرکھشنا حیرانگی سے بولی۔

"سچ......" ساکھشی دبی دبی خوشی سے بولی۔

"ہاں بیٹی یہ پانی تو واقعی بہت شکتی شالی ہے۔" سرکھشنا کے لہجے میں حیرانگی شامل تھی۔

"طاقت کیوں نہ ہو ماں آخر اس پر بسم اللہ پڑھ کر پھونکا گیا تھا۔" ساکھشی دل ہی دل میں خوش ہوئی۔

پھر آہستہ آہستہ سرکھشنا کی طبیعت سنبھلنے لگی کینسر کا

سننے کے بعد سرکھشنا بیڈ سے جاگی تھی۔ بسم اللہ کا پانی مسلسل پینے کے بعد اس کی طبیعت اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ صحت بھی اچھی ہوگئی تھی اور چلنے پھرنے بھی لگی تھی ادھر سریش بھی عبداللہ کے اخلاق اور دینی باتوں کا دیوانہ ہو رہا تھا اور پھر جب ساکھشی کی ماں کی دوبارہ رپورٹیں آئیں تو ایک حیران کن خبر سامنے آئی سرکھشنا کے جسم میں کینسر بالکل بھی موجود نہیں تھا ڈاکٹر حیران رہ گیا اس نے دوبارہ رپورٹیں کرائیں تو پھر وہی نتیجہ نکلا یہ خبر سن کر سنتوش نے اپنے لاکٹ کو چوما اور ساکھشی سجدے میں جا گری اور پھر وہ حسین لمحہ بھی آگیا جب سریش سرکھشنا کے پاس پہنچا۔

”ماں اور بابوجی میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔“ سریش نے سرکھشنا اور اپنے باپ سے بے دھڑک کہہ دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم تمہاری عقل تو ٹھکانے پر ہے۔“ سرکھشنا اور اس کے شوہر غصے سے بولے۔

”میں پورے ہوش وحواس میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔“ سریش نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔ سماج کیا کہے گا۔“ سریش کا باپ غصے سے بولا۔

”پتاجی سماج کا تو کام یہی ہے کل ہم جب مرنے کے بعد اوپر والے کی عدالت میں کھڑے ہوں گے تو وہاں سماج کام نہیں آئے گا بلکہ اسلام کے راستے پر چلنا ہی کام آئے گا۔“ سریش نے کہا۔

”دھرم سے پھرنے سے ہم نرک (جہنم) میں جائیں گے۔“ ساکھشی کی ماں نے بظاہر سنتوش کو آگاہ کیا۔

”پرنتو بیٹا ذات برادری ہمارا جینا دوبھر کردے گی۔“ سرکھشنا نے کہا۔

”تو کیا ہوا ہمیں اوپر والا بچائے گا پتاجی اور ماتاجی میری بات غور سے سنیئے اگر پوری دنیا آپ کو ذلیل وخوار کرنا چاہتی ہو اور صرف اوپر والا آپ کو عزت دینا چاہتا ہو تو آپ کو عزت ملے گی اور سماج ذلیل وخوار ہوگا۔“ سریش نے الٹا ماں باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پرنتو بیٹا...... سریش کے باپ نے کچھ کہنا چاہا مگر سریش نے انہیں ٹوک دیا۔

”پرنتو کچھ نہیں پتاجی اس حقیقت سے تو آپ بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ موت تو ہر حال میں طے ہے اور دنیا کی ہر دھرم کی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اوپر والا ایک ہے اور اوپر والے نے تو ہمیں اصل راستہ یعنی اپنا راستہ دیکھا بھی دیا ہے، جس کی جیتی جاگتی مثال ماتاجی ہیں کینسر جیسا مرض لاعلاج جو کہ اس پانی کے کارن کینسر شریر سے مکمل طور پر ختم ہوگیا ہے، پتاجی انسان سماج کے لئے نہیں بلکہ اوپر والے کے لئے جیتا ہے یہ جیون تو دو چار دن کا مہمان ہے اصل جیون تو مرتیو کے بعد شروع ہوگا اور وہ بھی تب ممکن ہے اگر ہم اس جیون میں کامیاب ہوئے تو۔“

آخرکار سریش اور ساکھشی کے ماں باپ کے دل میں حق بات بیٹھ گئی اور ماں باپ بیٹے نے ساکھشی کی طرح اسلام قبول کرلیا اور جب یہ بات گاؤں پہنچی تو دیانند کا فون آگیا کہ سنتوش فوراً گھر پہنچو، سنتوش اپنے سب دوستوں سے ملنے کے بعد اپنے گاؤں کی طرف نکل آیا۔

ادھر انسپکٹر دیال نے رنبیر اور کاوری کی شادی بڑے دھوم سے کی تھی۔

☆......☆......☆

”بھائی صاحب ٹکٹ دیکھایئے......“ اچانک ٹکٹ چیکر نے سنتوش کو ماضی کی یادوں سے کھینچا تو سنتوش نے پہلے ٹکٹ چیکر کی طرف دیکھا اور پھر ٹکٹ نکال کر دکھا دیا سنتوش اب انجلی کے بارے میں سوچنے لگا انجلی تو اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہو ہی جاتی اگر وہ لاکٹ وقت پر اسے انفارم نہ کرتا تو وہ حیران تھا کہ صرف پیسوں کی وجہ سے انجلی نے موت کا اتنا خوف ناک کھیل کھیلا وہ انجلی کے گھر کے ایڈریس پر گیا تھا مگر وہاں سے پتہ چلا کہ وہاں انجلی نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی تھی یعنی وہ ایڈریس بھی فرضی تھا اس نے انجلی کے متعلق کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔

”ارے کیا ہوا بھئی......؟“ اچانک بس کو بریک لگی تو سب مسافروں نے چلانا شروع کردیا۔

”دیکھیئے شانتی رکھیئے آگے پولیس کی جیپ ہے وہ بس چیک کرے گی کیونکہ اس روڈ پر آئے دن کوئی نہ کوئی بس لوٹ لی جاتی ہے۔“ کنڈیکٹر کے سمجھانے پر سب

مسافر خاموش ہو گئے۔ بس میں تین کانسٹیبل داخل ہوئے جن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں وہ سب کی تلاشی لینے لگے سنتوش نے گردن پچھلی طرف گھمائی پہلی سیٹ پر ایک درمیانی عمر کا آدمی پریشانی کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا اس کی گود میں کالے رنگ کا ایک بریف کیس تھا جسے اس نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

سنتوش نے گردن سیدھی کی تو اس نے دیکھا ان کانسٹیبلوں میں سے ایک نے سونے کی خوبصورت گھڑی پہنی ہوئی تھی وہی کانسٹیبل اب سنتوش کے قریب آ گیا تھا۔

"اس بیگ میں کیا ہے......؟" کانسٹیبل نے کے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں میرے کپڑے اور گھر والوں کے لئے کچھ چیزیں ہیں۔" سنتوش نے بتایا۔

"کھولو اسے۔" کانسٹیبل نے سخت لہجے میں کہا تو سنتوش نے بیگ کھول کر کانسٹیبل کے سامنے کر دیا بیگ دیکھنے کے بعد کانسٹیبل نے سنتوش کی تلاشی لی اور اس کا پرس کھول کر دیکھنے لگا۔

"سر اتنی سخت چیکنگ۔" سنتوش نے سوالیہ نگاہوں سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے۔" کانسٹیبل نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔

"پرنتو مجھے تو کوئی بھلائی نظر نہیں آ رہی ہے۔" سنتوش بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے۔" کانسٹیبل نے شاید سنا نہیں تھا یا جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں......" سنتوش جواباً مسکرایا تو کانسٹیبل اسے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"کیا نام ہے آپ کا......" کانسٹیبل نے کالے رنگ کے بریف کیس والے آدمی سے پوچھا۔

"ج......جی......م......مم......موہن داس۔" وہ آدمی جس کا نام موہن داس تھا ہکلایا۔

"اپنا ID کارڈ دکھائیے۔" کانسٹیبل نے موہن داس کے کالے بیگ پر نظریں دوڑائیں تو موہن داس نے اپنا ID کارڈ دکھایا، کارڈ دیکھنے کے بعد کانسٹیبل مڑا اور پھر یکدم مڑکا اور گھوما باقی دونوں کانسٹیبل بھی وہاں آ چکے تھے۔

"اس بیگ میں کیا ہے......؟" گھڑی والے کانسٹیبل نے پوچھا۔

"ج......جی......م......میرے ضروری کاغذات ہیں۔" موہن داس یکدم گھبرا گیا۔

"کھولئے اسے۔" گھڑی والے کانسٹیبل نے کہا۔

"دس......سر اس میں صرف میرے ضروری کاغذ ہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" موہن داس پریشان لہجے میں ہکلاتے ہوئے بولا۔

"جو بھی ہے کھولئے تو سہی ہو سکتا ہے اس میں بم ہو۔" دوسرے کانسٹیبل نے گھوم کر بظاہر باقی مسافروں کی رائے چاہی۔

"ہاں ہاں انسپکٹر صاحب ضرور دیکھئے......" کئی مسافر چلائے سنتوش نے اپنے لاکٹ کو مٹھی میں تھام لیا تھا۔

"چلئے کھولئے اس کو ہمیں سختی پر مجبور نہ کرو۔" گھڑی والا کانسٹیبل سخت لہجے میں بولا اس نے موہن داس کے ہاتھوں سے بریف کیس چھین کر کھولا تو تینوں کانسٹیبلو اور بس میں موجود سب ہی مسافر سکتے میں آ گئے وہ بریف کیس نوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔

"اتنے سارے نوٹ......تقریباً سب ہی مسافر جیسے چلائے۔"

"وہ دراصل میں نے کچھ مال خریدا تھا جس کی پیمنٹ آج کرنی تھی اسی کارن اس پارٹی کو رقم دینے کے لئے جا رہا ہوں۔" موہن داس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"آپ تو بڑے بے وقوف انسان ہیں اتنے سارے نوٹ لے کر عام بس میں چل پڑے۔ آپ آن لائن بھی تو کرا سکتے تھے۔" گھڑی والے کانسٹیبل نے بظاہر رائے دیتے ہوئے کہا۔

"میرے گاؤں میں بینک نہیں ہے اور نہ ہی اردگرد کے گاؤں میں۔" موہن داس نے بتایا۔

"آئندہ احتیاط کیجئے گا۔" دوسرے کانسٹیبل نے

موہن داس کو سمجھاتے ہوئے کہا اور وہ تینوں کانسٹیبلو بس سے اتر گئے ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔

تقریباً سب ہی مسافر بار بار پیچھے مڑ کر موہن داس کی طرف دیکھ رہے تھے اور بے چارے موہن داس کے پسینے چھوٹ رہے تھے جبکہ سنتوش آنکھیں بند کیے لاکٹ کی زنجیر میں اپنی انگلی گھمار ہا تھا اچانک اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بب......بس روکو...... جلدی سے۔" سنتوش چلایا۔

"ارے کیا ہوا بھئی۔" کنڈیکٹر نے حیرانگی سے کہا۔

"جلدی بس روک دو۔" سنتوش نے کنڈیکٹر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"تمرے بھئی اگر اس ویرانے میں بس روکی تو یہ موہن داس کے کارن پوری بس کے مسافر سنکٹ میں پڑ سکتے ہیں۔" ایک مسافر نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر غصے سے کہا۔

"اگر تم سب لوگ چاہتے ہو کہ موہن داس جی اور آپ لوگ سنکٹ میں نہ پڑو تو بس کو فوری طور پر روک دو۔" سنتوش نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو مجبوراً ڈرائیور نے بس روک دی۔

"اٹھیئے موہن داس جی......" سنتوش نے موہن داس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"کک......کہاں لے کر جارہے ہو مجھے......؟" موہن داس نے بریف کیس کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ صحیح سلامت اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو میرے ساتھ آیئے۔" سنتوش کے لفظوں میں نجانے کیا بات تھی کہ موہن داس بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اٹھ کر کھڑا ہو گیا دونوں بس سے اتر کر گھوم کر بس کی دوسری آگئے دور سڑک پر دو روشنیاں نظر آئیں تھیں سنتوش نے لاکٹ کو ہاتھ میں تھاما اور حسرت بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا ان دونوں روشنیوں کے پیچھے ہیوی لوڈ ٹرک تھا جس میں ڈرائیور سکھ تھا۔

"جی بادشاہو...... خیر تو ہے۔" سکھ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"سردار جی آپ کہاں تک جارہے ہیں۔" سنتوش نے پوچھا۔

"بادشاہو آپ نے کہاں تک جانا ہے۔" الٹا سردار نے پوچھا۔

"ان صاحب کو چندن پور پہنچانا ہے۔" سنتوش نے موہن داس کی طرف اشارہ کیا۔

"سمجھو آپ کا بندہ پہنچ گیا...... آؤ جی چڑھ جاؤ ٹرک پر۔" سکھ نے پہلے سنتوش اور پھر موہن داس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ موہن داس ٹرک پر چڑھ گیا موہن داس نے سنتوش کا ہاتھ تھاما اور پیار سے بولا۔

"میں نے اس کانسٹیبل (گھڑی والا) کی آنکھوں میں لالچ صاف محسوس کی تھی تمہاری آنکھوں میں مجھے سچائی نظر آئی اسی کارن تمہارے کہنے پر بغیر کسی ڈر کے میں بس سے نیچے اتر آیا۔"

سنتوش مسکرایا اور ٹرک کے جانے کے بعد دوبارہ بس میں آکر بیٹھ گیا اب سب مسافر سوالیہ نگاہوں سے سنتوش کا چہرہ تک رہے تھے مگر سنتوش نے خاموشی کے ساتھ آنکھیں بند کرکے گردن سیٹ سے لگادی ڈرائیور نے بھی بس چلادی تھی تھوڑی دیر بعد بس اچانک ایک جھٹکے سے رکی اور تقریباً سبھی مسافر اگلی سیٹوں سے ٹکرائے اور عورتیں تو چیخ پڑیں۔

"ارے بھئی کیا ہوا...... جو بس اس طرح روک دی۔" کئی مسافروں نے پوچھا۔

"وہ......وہ بس کے سامنے اچانک ایک گاڑی آکر کھڑی ہوگئی ہے۔" ڈرائیور نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ کوئی مزید سوال کرتا چار نقاب پوش ہاتھوں میں بندوق لئے بس میں داخل ہوئے سارے مسافروں کے رنگ فق ہوگئے عورتوں نے مجبوراً پھر چیخنا شروع کردیا۔

"خاموش ہوجاؤ ورنہ سب کو بھون ڈالوں گا۔"

ایک نقاب پوش نے بندوق کا رخ مسافروں کی طرف کیا

اور بس میں یک دم خاموشی چھا گئی اب چاروں نقاب پوشوں نے موہن داس کی سیٹ کی طرف دیکھا ان میں سے ایک موہن داس کی سیٹ کے قریب آیا۔

"اس سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا وہ کہاں گیا......؟" نقاب پوش نے سنتوش سے پوچھا۔

"وہ موہن داس جی۔" سنتوش نے جان بوجھ کر تصدیق چاہی۔

"ہاں......" نقاب پوش ہکلایا اور پھر سنبھل کر بولا۔

"جو کوئی بھی تھا وہ کہاں ہے۔"

"وہ تو بس سے نیچے اتر کر اپنے گاؤں کی طرف چلے گئے تھے۔" سنتوش نے جھوٹ موٹ کی کہانی سنائی۔

"یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" نقاب پوش پریشانی سے بڑبڑایا۔

"جی کچھ کہا آپ نے۔" سنتوش نے پوچھا۔

"ہوں......" نقاب پوش چونکا۔

"نہیں کچھ نہیں۔"

سنتوش نے اس نقاب پوش کی کلائی پر بندھی سونے کی گھڑی دیکھ لی تھی۔

"چلو چلتے ہیں۔" گھڑی والے نقاب پوش نے اپنے باقی ساتھیوں سے کہا۔ جو یقیناً تھوڑی دیر پہلے بس میں داخل ہونے والا کانسٹیبل تھا وہ چاروں نقاب پوش بس سے اتر گئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ان نقاب پوشوں نے بس کے کسی اور مسافر کو چھوا بھی نہیں اب بس کے سبھی مسافر داد بھری نظروں سے سنتوش کی طرف دیکھ رہے تھے اور سنتوش بے چارہ مسکرانے کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا۔

☆......☆......☆

"تمہیں اس کے گلے سے وہ لاکٹ اتروانا ہوگا......" کمرے میں موجود سایے کے منہ سے آواز خارج ہوئی۔

"م...... م...... میں یہ کام کیسے کرسکتا ہوں۔" کمرے میں موجود آدمی ہکلایا۔

"تمہیں یہ کام کرنا ہوگا ورنہ تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا۔"

اچانک۔ اس سایہ کے منہ سے غضب ناک آواز نکلی تو وہ آدمی بری طرح کانپنے لگا۔

"م...... م...... میں کوشش کروں گا۔" وہ آدمی بدستور ہکلاتے ہوئے بولا۔

"کوشش نہیں...... تمہیں یہ کام ہر حال میں کرنا ہوگا اس سے تمہیں بھی فائدہ ہوگا اور مجھے بھی۔" سایہ کے منہ سے آواز نکلی۔

"تم خود بھی تو وہ لاکٹ اتروا سکتے ہو حالانکہ تم شکتی شالی ہو۔" اس آدمی نے کہا۔

"نہیں وہ لاکٹ زیادہ شکتی شالی ہے...... اگر اس لاکٹ کی موجودگی میں، میں سنتوش کے سامنے آگیا تو میں جل کر بھسم ہوجاؤں گا۔" سایہ کے منہ سے آواز نکلی۔

"اس سے پہلے بھی میں نے رنگا اور انجلی کے ذریعے اس کے گلے سے لاکٹ اتروانا چاہا پرنتو اس نے ان دونوں کو نقلی لاکٹ دے دیا تھا۔"

"اگر تم سے یہ کام نہیں ہوسکا تو میں یہ کام کیسے کروں گا۔" اس آدمی نے پوائنٹ اٹھایا۔

"تمہارے لئے آسان ہے کیونکہ تم ایک انسان ہو اور میں......" سایہ نے حسرت زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ٹھیک ہے میں یہ کام کروں گا۔" آخر کار وہ آدمی رضامند ہوگیا۔

☆......☆......☆

سنتوش کے آنے سے دیانند اور رادھا بہت خوش نظر آرہے تھے انہوں نے خوشی سے سنتوش کا استقبال کیا۔

"بیٹا اب تم گاؤں میں موجود ہماری زمینوں کو سنبھال لو۔" دیانند نے کہا۔

"آپ بھی بڑے عجیب آدمی ہیں ابھی میرے سپتر کو سانس لینے دو آتے ہی کام کی باتیں شروع کردیں۔" سنتوش کی ماں نے منہ بناتے ہوئے کہا تو سنتوش اور دیانند بے اختیار مسکرا دیئے۔

"ارے بھئی میں تو سمجھا رہا تھا۔" دیانند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... بعد میں سمجھایئے گا۔" راگنی نے غصے سے کہا تو بے اختیار ایک مرتبہ پھر باپ بیٹا ہنس پڑے اور پھر کاسی رام مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا دونوں دوست مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

"آ گئی تجھے گاؤں کی یاد۔" رام مصنوعی غصے سے بولا۔

"مجھے نہیں بلکہ گاؤں کو میری یاد آئی تھی سو میں چلا آیا۔" سنتوش نے کہا تو رام ہنس پڑا رام نے دیانند اور راگنی کے پاؤں چھوئے دونوں نے اسے پیار دیا۔

"تمہاری ٹانگ کیسی ہے اب۔" سنتوش نے پوچھا۔

"تمہارا دیا ہوا زخم تھا بھئی...... تھوڑی بہت تو کسر رہنی تھی ناں۔" رام نے مسکراتے ہوئے کہا تو سنتوش بھی مسکرادیا۔

"ویسے سنتوش میری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر تمہیں اس دن ہوا کیا تھا۔" رام حیرانگی سے بولا۔

"چھوڑ پرانی باتوں کو یہ بتا کہ اب تو کیا کرتا ہے۔" سنتوش نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"میں پتاجی کے ساتھ ہوتا ہوں۔" رام نے بتایا۔

"بس تو پھر تمہارے پتاجی کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔" سنتوش نے کہا تو رام کے علاوہ دیانند اور راگنی دونوں ہنس پڑے۔

"جی نہیں...... جب سے پتاجی کے کام میں، میں نے ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے تو کام دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔" رام منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تیرا وہم ہوگا۔" سنتوش نے کہا۔

"وہم...... نہیں تو۔" رام اپنی ہی دھن میں کہہ گیا اور مجبوراً اسے پھر تینوں کے قہقہے سننے پڑے۔

"انکل آنٹی آپ بھی اس کا ساتھ دے رہے ہیں......" رام نے بچوں کی طرح منہ بناتے ہوئے کہا تو پھر قہقہوں کی برسات ہوئی۔

"چل اب باتیں چھوڑ اور کھانا کھاتے ہیں۔" سنتوش نے کہا تو رام نے اثبات میں سرہلادیا دونوں گھر سے باہر نکل آئے۔

"میرے گھر چل......" رام نے کہا تو سنتوش نے اثبات میں سرہلادیا۔

رام کے ماں باپ سے ملنے کے بعد دونوں کمرے میں آئے۔

"اور سناؤ شہر والوں کا کیا حال ہے۔" رام نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔" سنتوش نے سنجیدہ لہجے میں کہا......

"آخر تو وہاں گیا تھا کسی نہ کسی کو سنکٹ میں ڈالا ہوگا ناں......" رام نے کہا تو سنتوش بے اختیار مسکرادیا۔

"نہیں نہیں وہاں کچھ نہیں کیا میں نے۔" سنتوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ تو خیر ہو نہیں سکتا۔ بچپن میں یاد ہے جب تو مجھے قبرستان میں لے گیا تھا......" رام نے کہتے ہوئے سنتوش کو یاد دلایا۔

"ہاں، ہاں یاد ہے جب تو پیشاب کے کارن کسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے تجھے منع بھی کیا تھا پرنتو تو مانا ہی نہیں اور وہ دن بھی یاد ہوگا جب گاؤں میں دو اجنبی آدمی آئے تھے۔" رام نے سنتوش کو مزید یاد دلایا۔

بالکل یاد ہے ان اجنبیوں کا باس رنگا تھا جو حوالات سے پراسرار طور پر غائب ہوگیا تھا انسپکٹر دیال نے غصے کے کارن اس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا اس نے تو انسپکٹر دیال سے انتقام لینے کے لئے بہت گھناؤنا کھیل کھیلا تھا پرنتو اوپر والے نے خیر کی اور سمسیا حل ہوگئی۔" سنتوش نے کہا۔

"یار میں نے ایک اور عجیب بات سنی ہے۔" رام نے کہا تو سنتوش نے سوالیہ نگاہوں سے رام کی طرف دیکھا۔

"تیرے ماما اور ماسی نے اپنا دھرم کیوں بدل لیا وہ مسلمان ہوگئے ہیں۔"

"تو کیا ہوا...... انہیں سیدھی راہ نظر آئی تو انہوں

نے اختیار کرلی۔" سنتوش نے کندھے اچکائے۔
"تیرا دماغ ٹھیک ہے کہ اسے تو سیدھی راہ کہہ رہا ہے۔" رام کا لہجہ حیرانگی سے بھرپور تھا۔
"تو دھرم کے بارے میں کیا جانتا ہے۔" سنتوش نے پوچھا۔
"زیادہ کچھ نہیں۔" رام نے بتایا۔
"تو پھر چپ رہ کیونکہ تجھے تو اصل میں دھرم کے بارے میں جانکاری ہی نہیں ہے تو تجھے سمجھانے کا کیا فائدہ۔" سنتوش نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا پر تو یہ غلط ہے جو تم تک پہنچتا ہے۔" رام نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
"غلط صحیح کی پہچان پرکھنے سے ہوتی ہے انہوں نے پرکھا دیکھا اور سمجھا پھر انہوں نے اسلام قبول کرلیا میرے خیال سے تو ان کا فیصلہ بالکل صحیح ہے کیونکہ انسان کو پورا پورا حق ہے وہ اپنے دھرم کی جانچ کرے اسے سمجھے جو بات انہیں اچھی لگے وہ اپنائے۔" سنتوش نے صاف اور سیدھی بات کی۔
"تو پھر تو نے دھرم کیوں نہیں بدلا۔" رام نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"یہ تو اوپر والے کے فیصلے ہیں دیکھتے ہیں وہ ہم پر کب کرپا کرتا ہے۔" سنتوش نے اوپر کی جانب نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔
"کیسی عجیب اور بے تکی باتیں کر رہا ہے تو......"
رام کو غصہ آگیا۔
"بے تکی نہیں حقیقی باتیں کر رہا ہوں میں۔"
سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"چل چھوڑ ان باتوں کو۔ تجھے ایک نیو نیوز ملی۔"
رام نے سنتوش کی توجہ دوسرے موضوع کی طرف کھینچی۔
"کون سی نیوز۔" سنتوش چونکا۔
"تمہارے گھر وہ چوکیدار تھا ناں......" رام نے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں، ہاں...... عبداللہ انکل۔" سنتوش نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
"اس کا تو کئی سال پہلے دیہانت ہو گیا تھا۔" رام نے عجیب خبر سنائی۔
"اوہ......" دکھ کے باعث سنتوش کے منہ سے نکلا اور اس کی آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی۔
"اوئے...... تجھے کیا ہوا......؟" رام حیران ہوا۔
"یہ تو نہیں سمجھے گا۔" سنتوش لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔
"اس کی بیٹی ہے خدیجہ جو کہ بہت سندر ناری ہے...... میں نے پوری دھرتی پر اتنی سندر کنیا نہیں دیکھی اگر وہ میرے دھرم کی ہوتی ناں تو میں کب کا اسے اپنی پتنی بنا چکا ہوتا۔" رام نے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"شرم کر تو...... عورت چاہے کسی بھی دھرم کی ہو یا نہ ہو، اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔" سنتوش نے غصے سے کہا اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا اسے رام کی یہ بات اچھی نہ لگی تھی رام اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ مگر اس نے رام کی ایک نہ سنی۔

☆......☆......☆

سنتوش نے لکڑی کے اس ٹوٹے پھوٹے دروازے پر نگاہ ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔
"کون......؟" تھوڑی دیر بعد اندر سے پوچھا گیا وہ نسوانی آواز تھی جس نے سنتوش کے کانوں میں رس گھولا۔
"وہ...... وہ جی یہ عبداللہ انکل کا گھر ہے ناں......" سنتوش نے بظاہر تصدیق چاہی۔
"جی ہاں......" اندر سے پھر وہی خوب صورت آواز آئی۔
"میں دیانند کا بیٹا ہوں اور انکل عبداللہ کی پتنی سے ملنا چاہتا ہوں عبداللہ انکل ہمارے ہاں ہی کام کرتے تھے۔" سنتوش نے بتایا۔
"آپ سنتوش ہیں ناں۔" اندر سے تھوڑے وقفے کے بعد مسکراتی آواز سنتوش کے کانوں سے ٹکرائی۔
"ابو جی گھر میں زیادہ تر آپ کا ہی ذکر کرتے تھے آپ کی بہت سی باتوں کا ذکر وہ مجھ سے اور امی جان سے کیا

کرتے تھے زندگی کے آخری لمحوں میں انہیں آپ سے ملنے کی بے حد خواہش تھی لیکن......" اندر سے افسوس زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی گئی۔

"پرنتو انکل مجھے خبر تو کرتے......" سنتوش کا لہجہ بظاہر شکایتی تھا کیونکہ اسے بھی اس بات کا دکھ تھا کہ وہ عبداللہ سے مل نہ سکا۔

"......آپ کے والد صاحب کو خبر کی تو تھی مگر۔ پتہ نہیں انہوں نے آپ کو اطلاع کیوں نہیں کی۔" اندر سے حیرانی سے بھرپور آواز آئی۔

"اوہ...... پتاجی......" سنتوش نے گہری سانس کھینچی وہ سمجھ گیا تھا کہ دیانند نے اسے کیوں خبر نہیں کی کیونکہ وہ عبداللہ کے خلاف تھے۔

"خیر آپ مجھے اندر آنے کو نہیں کہیں گی کیا......؟"

"اوہ......معاف کیجیے گا میں بھی بڑی بے وقوف لڑکی ہوں۔ آپ اندر آیئے......" ساتھ ہی وہ لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ مزید کھل گیا اور سنتوش اندر داخل ہوا اندر مکان کی حالت کافی خستہ حال تھی سنتوش نے دیکھا دروازے کے پیچھے لمبے قد اور بھرے جسم کی لڑکی کھڑی تھی اس نے اپنے دوپٹے سے چہرے پر نقاب کیا ہوا تھا لیکن اس کی جھیل جیسی خوب صورت آنکھیں نقاب کی قید سے آزاد تھیں آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی کہ نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

"آنٹی کہاں ہیں......؟" سنتوش اس کی آنکھوں میں کھوتے ہوئے بولا۔

"دوسرے کمرے میں۔" خدیجہ نے اپنے خوب صورت ہاتھ سے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سنتوش دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

"گھر کا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔" سنتوش نے پوچھا۔

"گزارہ......وہی کرتا ہے جس نے رزق کا وعدہ کیا ہے محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں اس سے اچھی بھلی گزر بسر ہوتی ہے۔" خدیجہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"گھر کی حالت بھی کافی خراب ہے۔" سنتوش نے ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"گھر......رہنے کے لئے چھت موجود ہو اس سے بڑا اور کیا کرم ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا......ویسے نبی کریمؐ نے فرمایا۔ "دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے انسان سفر میں ہو اور کچھ دیر کے لئے قیام وطعام کرتا ہے قیام وطعام دنیا ہے اصل زندگی تو آخرت ہے اگر ہم اس زندگی میں آسائشیں ڈھونڈتے رہے تو دوسری اور اصل زندگی میں ہمارا کچھ حصہ نہیں ہوگا۔" خدیجہ نے کہا تو سنتوش نے اس کی بات سے اتفاق کیا وہ دونوں اب کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

کمرے میں ایک بوڑھی عورت چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی جو سنتوش کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم......" سنتوش نے عبداللہ چوکیدار کی بیوی زبیدہ کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام ......" زبیدہ نے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ سنتوش زبیدہ کی چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔

"اماں جی کیسی ہیں آپ۔" سنتوش نے پوچھا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے بیٹا۔" زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پہچانا مجھے آپ نے۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں......ویسے بھی اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں نظر ٹھیک طرح کام نہیں کرتی ہے۔" زبیدہ نے کہا۔

"میں سنتوش ہوں، دیانند کا بیٹا۔" سنتوش نے اپنا تعارف کرایا۔

"تو تو جوان ہو گیا ہے چھوٹا سا تھا جب یہاں آتا تھا اللہ بخشے خدیجہ کے ابو آخری لمحوں میں تجھے بڑا یاد کرتے تھے میں تمہارے گھر کئی مرتبہ گئی مگر تمہارے والد نے مجھے ہر مرتبہ جھڑک دیا۔" زبیدہ نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"میں پتاجی سے جا کر پوچھوں گا۔" سنتوش نے کہا اتنی دیر میں خدیجہ پانی کا گلاس لے آئی اس کے چہرے پر ابھی بھی نقاب تھا، سنتوش نے پانی پیا اور خالی

گلاس خدیجہ کو پکڑا دیا جسے لے کر وہ باہر نکل گئی تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جسے محلہ ماسی تاجو کے نام سے پکارتا تھا......

"ارے سنتوش آیا ہے۔" ماسی تاجو نے آگے بڑھ کر سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا سنتوش کو بزرگوں کی یہ عادت بہت پسند تھی۔

"بڑے عرصہ بعد آیا رے تو......" ماسی تاجو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ماسی...... پڑھائی مکمل کرنے کے بعد آیا ہوں۔" سنتوش نے جواب دیا۔

"تو پتر شہر میں ہی کوئی کام وام کر لینا تھا۔" ماسی تاجو نے بظاہر مشورہ دیا۔

"ماسی میرے لئے کام تو یہی بہت ہے اپنے پرکھوں کی زمین سنبھالوں گا اور ویسے بھی انسان کی اصل بھوک دو سمے کی روٹی ہے۔" سنتوش نے کہا۔

"ماشاء اللہ بڑی اچھی سوچ ہے بیٹا تمہارا۔ تو یہ ساتھ والی کرتارے کی بیوی ہے ناں پر تو مشکل وقت میں مجھ سے تین ہزار روپے ادھار لے گئی کہہ رہی تھی میرا اپنا بڑا بیمار ہے جلدی واپس کر دوں گی مجھے ترس آ گیا میں نے دے دیا چار پانچ مہینے ہو گئے ہیں اس بات کو لیکن ابھی تک واپس نہیں کئے ویسے بھی ان غیر مذہبوں پر بھلائی کرنی ہی نہیں چاہئے۔" ماسی تاجو غصے سے بولی۔

"کوئی احسان کا بدلہ دیتا ہے نہیں۔"

"ماسی انسان پر احسان کیوں کیا جاتا ہے۔" ایک طرف بیٹھی خدیجہ نے پوچھا۔

"اللہ کا حکم ہے خدیجہ پتر اور ویسے بھی اللہ احسان کی مدد انسان کے ذریعے ہی پوری کرتا ہے۔" ماسی تاجو نے پیار سے جواب دیا۔

"یعنی صرف اللہ کو خوش کرنے کے لئے......؟"

خدیجہ نے سوالیہ نگاہوں سے ماسی تاجو کی طرف دیکھا۔

"بالکل پتر......" ماسی تاجو نے جواب دیا۔

"تو پھر اس احسان کا بدلہ بھی اللہ سے ہی مانگنا چاہئے کیونکہ احسان کا بدلہ اللہ دیتا ہے اگر احسان کا بدلہ انسان ہی دے دے تو پھر اللہ کو کون یاد کرے گا اسی لئے ہم جب بھی کسی پر احسان کریں تو نیت یہ رکھنی چاہئے کہ اللہ اس کا اجر دے گا اور آخرت میں بھی ہمیں اس کا اجر دے گا جو ہماری اصل زندگی ہے یہ زندگی تو ماسی ہماری نجانے کب ختم ہو جاتی ہے اس لئے اس زندگی کو چھوڑ کر ہمیں اصل زندگی کی بھاگ دوڑ میں لگنا چاہئے اور احسان صرف اپنے لوگوں (مذہب والے) پر ہی نہیں بلکہ غیر مذہبوا پر بھی کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو یہ دیکھ کر رزق نہیں دیتا کہ وہ اللہ کا نام لیتا ہے کہ نہیں وہ صرف رزق دیتا ہے اسی لئے دنیا کا ہر انسان چاہے وہ مسلمان ہو چاہئے ہندو، سکھ ہو یا کوئی اور سب ہی جانتے ہیں کہ اللہ ایک ہے لیکن محض اپنی انا کی خاطر اپنے بزرگوں کی خاطر بتوں اور انسانوں کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں آپ نے کرتارے کی بیوی کو پیسے دیئے ہیں ناں کل وہ اپنے مذہب کی کئی عورتوں سے اس بات کا تذکرہ کرے گی کہ ماسی تاجو نے غیر دھرم کی ہونے کے باوجود میری مدد کی شاید آپ کے اس احسان کی وجہ سے کوئی غیر مذہب والا شاید مذہب والا بن جائے ہمارے نبی بھی تو غیر مذہب والوں پر مہربان تھے اور ان کی عادات اور اخلاق کی وجہ سے لوگ روشنی میں داخل ہوئے ہمیں اسی لئے ہمارا طور طریقہ ہمارے نبی کریمؐ جیسا ہونا چاہئے میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اپنے پیسے بھول جایئے لیکن جب آپ کو ان پیسوں کی اشد اور صحیح ضرورت ہو گی تب آپ کو یہ پیسے لازماً مل جائیں گے اور وہ اللہ دے گا۔" خدیجہ نے انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔

"واہ......" بے اختیار سنتوش کے منہ سے نکلا۔

"آپ تو واقعی عبداللہ انکل کی بیٹی ہیں۔"

سنتوش نے خدیجہ کی آنکھوں سے اندازہ لگایا وہ مسکرا رہی تھی نقاب ابھی بھی اس کے چہرے پر موجود تھا اور سنتوش کو اس بات کی تمنا تھی کہ وہ خدیجہ کا چہرہ دیکھے مگر وہ یہ بات منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

سنتوش گھر پہنچا تو اس کے والد دیانند کہیں نکلنے کے لئے تیار تھے۔

"پتا جی آپ کہاں جا رہے ہیں۔" سنتوش نے

پوچھا۔

"اپنی زمینوں کی طرف جارہا ہوں۔" جواباً دیانند مسکرائے۔

"میں بھی چلوں۔" سنتوش نے بظاہر اجازت چاہی۔

"کیوں نہیں بیٹا...... آخر کل کو تم نے ہی تو سارا کچھ سنبھالنا ہے۔"

دیانند نے مسکراتے ہوئے کہا تو جواباً سنتوش بھی مسکرایا وہ اپنی زمینوں پر پہنچے تو تاحد نگاہ زمینوں کی ہریالی پھیلی ہوئی تھی سنتوش نے دیکھا ایک طرف ان کے کھیتوں میں احمد دین ہل چلارہا تھا دھوپ کی وجہ سے اس کا برا حال تھا وہ ایک ضعیف آدمی تھا اور پسینے کی وجہ سے اس کا برا حال تھا دھوپ کی تیز شعاعیں اس کے چہرے پر پڑرہی تھیں۔

راما نند بار بار اس پر چلا رہا تھا۔

"انکل جی انکل احمد دین کب سے ہل چلا رہے ہیں۔"

"سنتوش پتر صبح کالاگے ہے۔" رامو نے احترام سے جواب دیا۔

"اور انہیں آرام کرنے کا سے دیا کہ نہیں۔" سنتوش نے پوچھا۔

"آرام......" رامو حیران ہوا۔ "آرام کاہے کا سنتوش پتر۔"

"ہاں بیٹا...... آرام کس لئے ہم تو کام کے پیسے دیتے ہیں آرام کے نہیں۔ وہ اچھوت ہے۔" دیانند خشک لہجے میں بولا۔

"پتا جی یہ بات تو بالکل غلط ہے۔" سنتوش دکھی لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب......؟ تم مجھے غلط کہہ رہے ہو۔" دیانند ذرا سخت لہجے میں بولا۔

"میں آپ کو نہیں پتا جی آپ کے وچاروں کو غلط کہہ رہا ہوں اور افسوس رامو صاحب کے وچار بھی یہی ہیں۔" سنتوش افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

"وہ کیسے......؟" دیانند نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"اب آپ ہی دیکھئے احمد دین کی محنت سے جو فصل تیار ہوتی ہے وہ لاکھوں میں بکے گی۔ اور ساری جنتا اس فصل سے فائدہ حاصل کرے گی یعنی اس ایک مزدور کے کارن کتنے فائدے ہوں گے اور ہم اس کی صحت کا خیال نہیں رکھیں گے تو وہ بیمار پڑجائے گا اور ہمارے کام کا کتنا نقصان ہوگا......"

"جب وہ ہمارا اتنا خیال کرتا ہے تو ہمارا کرتیو بنتا ہے کہ اس کا خیال کریں اسے تھوڑا بہت آرام کرنے کا موقع دیں مشین بھی جب زیادہ چلتی ہے تو ہمیں اس کی بھی ٹیوننگ کروانا پڑتی ہے اگر ہم اس کی ٹیوننگ کرواتے رہیں گے تو وہ ٹھیک کام کرے گی ورنہ وہ بھی ایک دن خراب ہوجائے گی اسی طرح انسان بھی کام کے دوران اگر کچھ سمے کے لئے ریسٹ کرے اپنا پیٹ بھرے تو وہ باقی کام اچھے طریقے سے کرسکتا ہے اور ویسے بھی اگر ہم مزدور کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو وہ ہمارے پاس زیادہ سے کام کرے گا اور اگر ہمارا برتاؤ اچھا نہیں ہوگا تو ہم کبھی بھی اچھا مزدور نہیں رکھ سکیں گے آخرکار مزدور بھی تو ہماری طرح کا ایک انسان ہے اگر ہم ایک منٹ کے لئے اس وچار کو ذہن میں لائیں کہ اگر کوئی ہم میں سے احمد دین کی جگہ ہوتا تو احمد دین ہماری جگہ ہوتا اور وہ ہم سے ایسا برتاؤ کرتا جو ہم اس کے ساتھ کررہے ہیں تو ہمارے دل پر کیا گزرتی اس وچار کے کارن ہمیں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو احمد دین کا خیال رکھنا چاہئے۔" سنتوش نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"سنتوش بابو تم ان بکھیڑوں میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں ہر چیز کی سمجھ آجائے گی۔" رام دین نے بظاہر سنتوش کو سمجھایا۔

☆......☆......☆

وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں تین افراد بیٹھے تھے ایک ضعیف بوڑھا تھا جس کے لمبے لمبے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے نہایا نہ ہو اس کے جسم سے اتنی تیز اور گندی بدبو نکل رہی تھی کہ سامنے بیٹھی دونوں عورتوں کا برا حال تھا لیکن وہ دونوں اس ضعیف کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہوئی تھیں اور اس بوڑھے کی ہوس بھری نگاہیں ان عورتوں میں سے جوان عورت پر ٹکی ہوئی تھیں اور وہ عورت اس بات کو صاف محسوس کر رہی تھی اور کبھی کبھی اس بوڑھے کی طرف نظریں چرا کر دیکھ بھی لیا کرتی تھی۔

"ہاں بول بی بی...... کنیا کو کیا کشٹ ہے......" آخرکار اس بوڑھے نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"باباجی میری بہو کے ہاں اولاد نہیں ہے اگر آپ کی کرپا ہوجائے تو۔" ان دونوں عورتوں میں سے بوڑھی عورت گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

"کیا نام ہے اس کنیا کا......؟" بوڑھے نے اپنی خبیث نگاہیں اس نوجوان عورت پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"جی سندری......" بوڑھی عورت نے بتایا۔

"اپنے نام کی طرح سندر......" بوڑھا بڑبڑایا۔

"اولاد تو اسے مل جائے گی پرنتو تیری بہو کو روزانہ رات کے سمے یہاں آنا ہوگا۔" خبیث بوڑھے نے شیطانی نگاہوں سے سندری کے سراپا پر نظر ڈالی اور سندری اسے غصے سے گھورنے لگی لیکن بوڑھے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ طاری رہی۔

"پ...... پر رات کے سمے۔" پریشانی کے باعث سندری کی ساس کے منہ سے نکلا۔

"مورکھ عورت میں پندرہ رات تک اس پر منتر پڑھوں گا وہ بری آتمائیں جو اس کی اولاد میں رکاوٹ بن رہی ہیں میں انہیں اس سے دور بھگاؤں گا بہت کچھ کرنا پڑے گا مجھے، تب کہیں جاکر اس کے ہاں خوب صورت اولاد جنم لے گی۔" خبیث بوڑھا یکدم بھڑکتے ہوئے بولا اور سندری اور اس کی ساس یکدم سہم گئیں۔

"پرنتو اس کا پتی نہیں مانے گا۔" سندری کی ساس پریشان کن لہجے میں بولی۔

"پتی...... مورکھ بڑھیا اگر تیرے سپتر کے ہاں اولاد نہ ہوئی تو وہ سندری کی جگہ ایک اور پتنی لے آئے گا۔" بوڑھے نے کن انکھیوں سے سندری کی طرف دیکھا اور سندری کے چہرے پر یکدم پریشانی نے بسیرہ کرلیا۔

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا۔" سندری کی ساس کو شاید بوڑھے کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

"جب زمین بنجر ہوجائے اور کسان کی باربار کوششوں کے باوجود زمین پھل نہ دے تو کسان اس زمین کو بیچ کر نئی زمین خرید لیتا ہے۔" بوڑھے نے بدستور سندری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری بات تو شاید سمجھی نہیں جب سندری کے ہاں کوئی سنتان ہی نہیں ہوگی تو آخرکار وہ اسے چھوڑ دے گا، نادان مت بن اور سندری کو روزانہ میرے پاس بھیج پربھو کی کرپا رہی تو ایک دن ضرور سندری کی گود ہری ہوجائے گی۔"

"ٹھیک ہے باباجی میں آج سے ہی سندری کو آپ کے پاس بھیج دیا کروں گی۔" یعنی سندری کی ساس نے ہار مانتے ہوئے کہا تو خبیث بوڑھے کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ نے بسیرہ کرلیا تھوڑی دیر بعد دونوں ساس بہو اٹھیں اور بوڑھے کی جھونپڑی سے باہر نکل آئیں۔

سنتوش بھی اسی طرف آرہا تھا۔ "ارے سنتوش بیٹا تو......" سندری کی ساس پیار سے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"جی ماسی میں......" جواباً سنتوش مسکرایا۔

"کب آیا گاؤں میں۔" سندری کی ساس نے پوچھا۔

"وہ چار دن ہی ہوئے ہیں۔" جواباً سنتوش نے بتایا۔

"ماسی کدھر سے آرہی ہو۔"

"میں باباجی کے پاس گئی تھی۔" سندری کی ساس نے بتایا۔

"خیر تو ہے ماسی۔" سنتوش نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا...... یہ مہندر کی پتنی کو چار سال ہوگئے ہیں شادی کو پرنتو گود سونی ہے۔" باباجی سے یہی کہنے آئی تھی۔" سندری کی ساس نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

"تو باباجی لوگوں کو سنتان دیتے ہیں۔" سنتوش نے حیرانگی سے کہا۔

"ہاں بیٹا بڑی پہنچی ہوئی ہستی ہیں باباجی۔" سندری کی اس نے کہا۔

"پرنتو یہ اختیار تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے ماسی۔" سنتوش نے سندری کی ساس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ جو بھگوان کے پجاری زمین پر ہوتے ہیں ناں وہ بھی بھگوان کا روپ ہی ہوتے ہیں ان میں بھی بھگوان کی شکتیاں ہوتی ہیں وہ بھی ہر کام کر سکتے ہیں۔" سندری کی ساس نے کہا۔

"نہیں ماسی پہلی بات یہ کہ ہم سب میں غلط فہمیاں ہیں کہ انسان بھی اوپر والے جیسا کام کر سکتے ہیں یہ بات بالکل غلط ہے۔ ماسی اوپر والے کا تو انداز ہی نرالا ہے دینے کی شکتی لینے کی شکتی یہ اوپر والے کا اختیار ہے انسان جتنا مرضی پٹنے کا کام کرلے وہ کسی کو نہ ہی جان دے سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کی جان لے سکتا ہے۔ آنے والے کل کے بارے میں بھی سوائے اوپر والے کے کوئی نہیں جان سکتا، ہمارے ہر نفع نقصان کا مالک اوپر والا ہے ماسی نفع تو ہمیں وہ دیتا ہے پرنتو نقصان ہم اپنی غلطیوں سے اٹھاتے ہیں پرنتو اوپر والا ہم سے اتنا پریم کرتا ہے کہ وہ ہمیں نقصان میں بھی نفع دے دیتا ہے پھر بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ یہ فائدہ تو ہم نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے پرنتو یہ اوپر والے کی طرف سے ہی ہوتا ہے اسی طرح ماں کے پیٹ میں بھی وہی نئی جان پیدا کرتا ہے انسان سے نہیں بلکہ اگر آپ اوپر والے سے سچے دل سے مانگیں گے تو وہ آپ کو بہتر دے گا۔" سنتوش نے بتایا۔

"پرنتو بیٹا منیش کے تو کوئی سنتان نہ تھی وہ سنتان تو باباجی کے کارن ہوئی تھی۔" سندری کی ساس نے کہا۔

"یہ پردہ بھی میں جلد ہی گاؤں والوں کی آنکھوں سے ہٹاؤں گا۔" سنتوش نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"چنگا پتر میں چلتی ہوں گھر میں روٹی ہانڈی کا بھی کچھ کرنا ہے۔" سندری کی ساس نے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور سندری اور اس کی ساس اپنے گھر کی طرف بڑھ گئیں جبکہ سنتوش اس خبیث بوڑھے کی جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

گھر پہنچنے پر سندری نے اپنا چولہا سنبھال لیا چولہے پر ہانڈی رکھنے کے بعد وہ روٹیاں پکانے لگی۔

"سندری بھولے سے بات نہ کرنا آدھی رات کے سمے باباجی کے پاس چلی جانا۔" چارپائی پر بیٹھی اس کی ساس نے کہا۔

"اماں میرا من بہت گھبرا رہا ہے۔" سندری نے اپنے دل کی کیفیت بیان کی۔

"کیوں ری۔ تیرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔" سندری کی ساس سخت لہجے میں بولی۔

"اس بوڑھے کی آنکھوں میں مجھے ہوس نظر آرہی تھی اماں۔" سندری نے ڈرتے ڈرتے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"اری...... نادان کچھ تو بھگوان کا خوف کر باباجی کو برا کہہ رہی ہے وہ تجھے ایسی بات پر جلا کر بھسم کر دیں گے۔" سندری کی ساس یکدم بھڑک اٹھی۔

"نہیں اماں ہم لوگ ہی تو نہیں سمجھتے۔ سنتوش کا کہنا ٹھیک ہے سنتان کا مالک تو اوپر والا ہے۔" سندری دکھی لہجے میں بولی۔

"تو پھر تیری کوکھ کیوں خالی ہے ہر مندر میں جا کے ماتھا ٹیکتی ہے منتیں مانگتی ہے پھر بھی تو بانجھ ہے۔" سندری کی ساس اسے طعنہ دیتے ہوئے بولی۔

"اماں اس میں بھی کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی خدیجہ کہتی ہے اوپر والے کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے ہر چیز کا ایک سمے ہوتا ہے اوپر والے کے کام میں دیر ہے اندھیر نہیں وہ گہرے اندھیرے کے بعد ایک خوب صورت اجالا پیدا کرتا ہے۔" سندری نے کہا۔

یہ سن کر سندری کی ساس نے اپنا فیصلہ سنایا اور بے بس سندری خاموش ہو گئی۔

شام کو وہ خدیجہ سے ملنے گئی۔ "کیا بات ہے

سندری آج بڑی اداس نظر آ رہی ہو۔" خدیجہ نے سندری کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" سندری نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے میری سہیلی پریشان ہو اور مجھے پتہ ہی نہ چلے۔" خدیجہ نے سندری کے گالوں میں چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"بس خدیجہ کیا بتاؤں سنتان کی کلپنا مجھے اندر ہی اندر کھائے جارہی ہے۔" سندری نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"ارے تو اس میں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے اولاد تو تجھے تب ہی ملے گی ناں...... جب اس کا وقت ہوگا۔" خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ وقت کب آئے گا۔" سندری نے اکتائے ہوئے لہجے میں لفظ "کب" کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے اتنی جلدی کیوں ہے اولاد کی۔" خدیجہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مجھے چار سال ہوگئے ہیں میرا بیاہ ہوئے اور تو کہہ رہی ہے مجھے سنتان کی کیوں چنتا ہے...... میری ساس مجھے بانجھ پن کے طعنے دیتی رہتی ہے، پتی سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور تو کہہ رہی ہے مجھے اولاد کی کیا جلدی ہے۔" سندری نے غصے سے کہا۔

"ارے...... ارے...... تم تو ناراض ہوگئی...... میں تو تمہیں صرف خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ رہی تھی۔" خدیجہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تمہارے کہنے سے تو میں خوش ہوجاؤں گی پرنتو میری ساس اور میرا پتی تو تب خوش ہوں گے ناں جب میرے سنتان ہوگی۔" سندری دکھی دل سے بولی۔

"آج تو واقعی تیرے اندر سے لاوا پھٹ رہا ہے۔" خدیجہ نے کہا۔

"تنگ آگئی ہوں میں اپنی ساس اور پتی سے...... اگر سنتان میرے بس میں ہوتی تو......" سندری کہتے کہتے رو پڑی۔

"دیکھو سندری عورت ہو یا مرد، انسان ہو یا جانور...... آسرا صرف اللہ ہی کا ہوتا ہے اگر انسان اپنی سب امیدیں خواہشیں ہر چیز اللہ سے مانگے تو دنیا سے پریشانیاں بالکل ختم ہوجائیں کیونکہ وہ اللہ ہی ہے جو ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا ہے، یہ نظام اللہ کا ہے کہ وہ انسان کی ضرورت انسان کے ذریعے ہی پوری کرتا ہے۔" خدیجہ نے سندری کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"پرنتو میں تو مندروں، سادھوؤں کے پاس جاتی رہتی ہوں۔" سندری نے بتایا۔

"اللہ مندروں میں نہیں دل میں ہوتا ہے سندری۔" خدیجہ نے بتایا۔

"تو پھر تم لوگ مسجدوں میں کیوں جاتے ہو۔" سندری نے پوچھا۔

"تم نے بڑا اہم سوال پوچھا ہے سندری۔" یہ کہتے ہوئے خدیجہ مسکرائی۔

"تم لوگ...... مندروں میں کیوں جاتے ہو......؟"

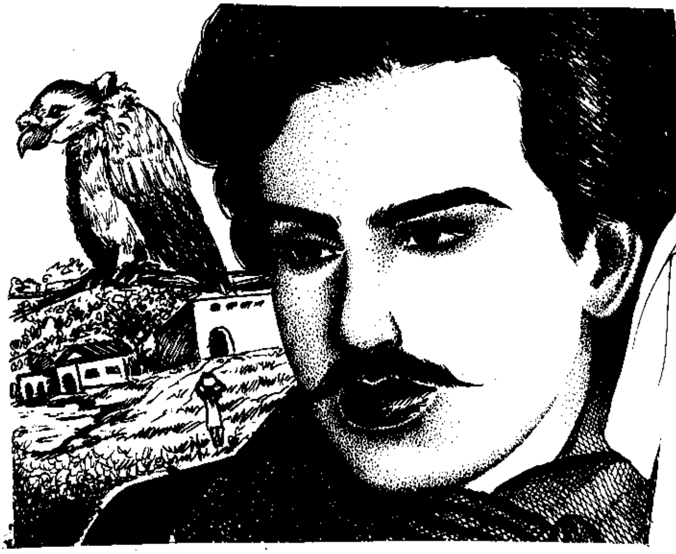
"ہمارا بھگوان ادھر ہے ہم ان سے اپنی منتیں، مرادیں مانگتے ہیں۔" سندری نے بتایا۔

"تم آسمانوں میں موجود اللہ کو مانتے ہو۔" خدیجہ نے دوسرا سوال کیا۔

"ہاں بالکل......" سندری نے تیزی سے جواباً دیا۔

"لیکن دنیا کے ہر دھرم ہر مذہب کی کتاب میں یہی لکھا ہے کہ اللہ ایک ہے...... اس کی ذات واحد ہے اس کا دوسرا کوئی شریک نہیں ہاں اکثر لوگ اپنے دھرم مذہب یا زبان میں اس کا نام الگ سے لیتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کی تعداد تین یا چار پانچ ہے، مختلف ناموں سے پکارنے سے اللہ کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا، تم لوگ، انسانوں کو، بتوں کو بھگوان مانتے ہو کیا یہ ٹھیک ہے۔"

(جاری ہے)



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بھلائی کا صلہ

گلاب خان سولنگی۔نوشہرو فیروز

پورے جسم پر لرزہ طاری تھا اور اندھیرے نے ہر سو اپنا راج قائم کر رکھا تھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ اپنے ارد گرد سے بے خبر بیٹھے تھے کہ اتنے میں......

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی عجیب و غریب تحیر انگیز اور حیرت انگیز کہانی

ہمارے گاؤں سے شہر 8 کلومیٹر دور تھا۔ اچھی صحت و ڈگری ہونے کے باوجود نوکری بھی ہم سے کوسوں دور تھی مجبوراً دوسرے گاؤں والوں کی طرح میں بھی شہر والی فیکٹری میں مزدوری کرتا تھا۔ لیکن ہماری شفٹ رات کو شروع ہوتی تھی اس لئے سر شام ہی میں گاؤں سے کوچ کر جاتا تھا۔ کبھی کبھار دیر بھی ہو جاتی تھی وجہ پبلک ٹرانسپورٹ کا نہ ہونا اور خطرناک جنگل۔ لیکن پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہم غریب مزدور کسی جنگلی جانور یا ڈاکوؤں کی پرواہ کئے بغیر بلا ناغہ فیکٹری میں حاضری دیتے تھے جس سے گھر کا چولہا جلتا تھا۔

فیملی کے افراد تعداد میں تو ماشاءاللہ کثرت میں تھے لیکن کمانے کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر تھی، بھائی بہنوں کی تو فوج تھی اوپر سے ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا بھی میں ہی تھا۔

گریجویشن کے بعد تعلیمی سلسلہ رک گیا اور مزدوری کا سلسلہ چل پڑا۔ نوکری کے پیچھے کافی وقت ضائع کیا۔ پتا نہیں سرکار اخباروں میں نوکری کے اشتہار کیوں شائع کرتی ہے؟

مجھے تو اخباری نوکری تلاش کرنے میں شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار تھک ہار کے شہر کی فیکٹری میں ڈیلی ویجز پر مزدوری مل گئی۔ اس طرح وقتی طور پر میری لائف سے بے روزگاری کا بھوت فی الحال ٹل گیا۔

آٹھ کلومیٹر کا طویل پرخطر سفر پیدل ہی کاٹنا پڑتا تھا ویسے تو جنگل میں بے ضرر قسم کے جنگلی جانور پھرتے رہتے تھے لیکن رات کے سناٹے میں بڑے سے بڑا پہلوان بھی یہاں سفر کرنے سے کتراتا تھا۔ ہماری شفٹ رات 8 سے صبح 8 بجے تک چلتی تھی، کبھی کبھار بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے آدھی رات کو ہی چھٹی مل جاتی تھی۔ میں کبھی شہر میں کسی دوست کے یہاں ٹھہرتا تھا اور کبھی کبھار گھر کی راہ لیتا تھا۔

میں بھی انسان ہوں ڈر تو لگتا تھا لیکن ہماری زندگی میں ڈر کر گھر میں بیٹھ جانا ناممکن تھا۔ میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے جنگل سے گزر جاتا تھا۔ جنگل سے ہر سو جنگلی بھیڑیوں اور دیگر خطرناک جانوروں کی آوازیں سن کر ایک عجیب سا خوف اور ڈر ہمیں آگھیرتا تھا۔ موٹر سائیکل یا سائیکل خریدنے کا بجٹ بھی ہم افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا خاموشی سے دیہاڑی لگا رہا تھا۔

آج تو سارے شہر میں لال جھنڈے نظر آرہے تھے، ارے ہاں آج تو ہمارا دن منایا جا رہا تھا جسے لوگ مزدور ڈے کہتے ہیں۔ یوم مزدور! ایک بہت بڑے جلسے میں درباری قسم کے مزدور ایک سیاست دان صاحب کو گھیرے میں لئے نعرہ بازی کر رہے تھے۔ اور وہ موصوف ڈائس پر بڑے جوش سے تقریر فرما رہے تھے۔

”میرے مزدور ساتھیو! میں آپ لوگوں کے لئے دودھ اوہ...... سوری پانی کی ندیاں بہادوں گا۔ اب ہر مزدور کا بچہ اسکول جائے گا۔ افسر شاہی ختم اور مزدور راج شروع ہوگا۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ بھی ختم اور مہنگائی تو ہماری حکومت نے ہی ختم کی ہے...... وغیرہ وغیرہ۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”واٹ اے جوک“ جسے سن کر پاس کھڑے ایک پولیس والے نے میرے قریب آکر کہا۔ ”جاؤ میاں اپنا کام کرو، تمہیں یہ مذاق لگ رہا ہے۔“

میں کندھے اچکاتے ہوئے فیکٹری کی طرف چل پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کے دن بھی ہم مزدوروں کو چھٹی نہیں ملتی تو پھر یہ دکھاوا کس لئے؟ صدیوں سے ہم مزدوروں کی حالت نہیں بدلی اور نہ ہی حالات، لگتا ہے ساری دنیا کے مزدور اپنی محرومیوں پر نہ جانے کب تک نوحہ خواں ہوتے رہیں گے؟ آخر حالات کب بہتر ہوں گے؟

ایک رات فیکٹری سے جلدی چھٹی ہوگئی۔ میں پیدل ہی پیدل گاؤں چلا آرہا تھا۔ رات مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، حسب معمول سڑک ویران تھی، چلتے چلتے میں ایک جگہ رک گیا۔ سڑک کی دائیں طرف والی جھاڑیاں ہل رہی تھیں جبکہ ہوا تو رکی ہوئی تھی تو پھر یہ سرسراہٹ کیسی تھی۔

پہلے تو میں ڈر گیا لیکن پھر سوچا کہ ہوسکتا ہے کوئی مصیبت میں ہو شاید میں اس کی مدد کرسکوں، ڈرتے ڈرتے میں نے جھاڑیوں کا رخ کیا، مجھے قریب پاکر جھاڑیوں میں چھپا ایک اژدھا اچانک میرے سامنے نمودار ہوگیا۔ اف خدایا اتنا بڑا اژدھا میں نے پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے شہر کے سینما گھر میں Anaconda سیریز کی ساری موویز دیکھی ہوئی تھی لیکن حقیقت میں اتنا بڑا اژدھا ہوسکتا ہے؟

میرا تو سر چکرا گیا، وہ غصے سے زبان نکال کر مجھے اپنا نوالہ بنانے کے لئے میری طرف تیزی سے لپکا، پھر تو میں بے لگام گھوڑے کی طرح وہاں سے بھاگ نکلا، کافی دیر تک وہ میرا تعاقب کرتا رہا، لیکن گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی وہ غائب ہوگیا، میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا، اب وہاں کوئی نہیں تھا تب میری سانسیں بحال ہوئیں۔ خوف کے مارے خاموشی سے آکر میں اپنے بستر پر گرا اور باقی رات اس اژدھے

کے بارے میں سوچتے ہوئی گزری۔

میرا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا تھا، گاؤں کے حکیم صاحب نے مجھے دوائی دی اور آرام کرنے کو کہا لیکن ہماری قسمت میں آرام کہاں تھا؟ میں نے رات والی بات سب سے چھپائی مبادا کوئی میرا مذاق نہ اڑائے، پیش امام صاحب سے ڈر کا تعویذ بھی لیا، پورا دن آرام کیا اور شام کو پھر کام پر چل نکلا۔

پہلے تو اتنا ڈر نہیں لگتا تھا لیکن رات اپنی آنکھوں سے اس بلا کو دیکھا تھا اس لئے پہلے سے محتاط ہوگیا تھا۔ ہتھیار تو نہیں تھا البتہ ایک عدد مضبوط ڈنڈا ضرور اٹھایا تھا۔ آج جنگل کافی پرسکون تھا میں خاموشی سے وہاں سے گزر گیا۔

رمضان کی آمد آمد تھی، سب لوگ اس بابرکت مہینے کی تیاریوں میں مصروف تھے، آج ہماری فیکٹری کی مالکن دفتر آئی تھی، میں نے اس سے ملنے کی عرضی پیش کی ہوئی تھی۔

وہ اے سی کمرے میں مختصر لباس میں ملبوس کرسی پر براجمان تھی، اس کے آزو باز و شاید اس کے فرینڈز انگریزی لباس پہنے پینے پلانے میں مصروف تھے، مجھے دیکھ کر سب نے اپنی سرگرمیاں ترک کردیں اور سب مجھے سر سے پاؤں تک تکنے لگے۔ شاید مجھے کوئی اور مخلوق سمجھ رہے تھے۔ یا میری غربت پر تجربے کی تیاری کررہے تھے۔

فیکٹری کی مالکن نے پہلے تو میری جوتیوں پر نظر ڈالی اور اس کی مغرورانہ نظر میرے کپڑوں سے ہوتی ہوئی اس کے سامنے پڑے بڑے سے ٹچ موبائل پر پڑی شاید کوئی کال آرہی تھی۔ اس نے گھنٹہ بھر وہ کال اٹینڈ کی وہ سامنے والے سے زیادہ تر انگریزی میں بات کررہی تھی۔ شاید مجھے ان پڑھ سمجھ رہی تھی۔ لیکن میں تو گریجویٹ تھا، وہ کسی امیر زادے سے ڈنر کے بارے میں بات کررہی تھی اور مینو فکس نہیں ہورہا تھا۔ میں تو گھنٹہ بھر کھڑے کھڑے پک گیا، کیسے بدتہذیب لوگ تھے، خیر آخر میں اس نے کال کاٹ دی۔

"محترم XYZ آپ ہم سے کیوں ملنا چاہ رہے ہیں؟"

"سوری میم! میرا نام عزیز خان ہے اور......" اس نے میری بات کو درمیان میں ہی کاٹ دیا اور اکڑ کر بولی۔

"سنو مسٹر! میرے پاس ٹائم نہیں ہے، کام کی بات کرو۔"

"وہی تو کررہا تھا لیکن شاید وہ مجھے مزدور ہونے کا احساس دلا رہی تھی اور خود کو مالکن۔"

"میم کل سے رمضان شروع ہو رہا ہے اور یہ مہینہ بڑا بابرکت ہے۔ میں دن میں روزے اور رات کو عبادت کرتا ہوں، میں چاہتا ہوں میری شفٹ کی ٹائمنگ میں کچھ نرمی کردی جائے تاکہ میری عبادت میں خلل نہ پڑے تو میں آپ کا مشکور رہوں گا۔"

"اور کام میں خلل پڑے تو پڑے؟ دیکھو مسٹر خان! یہ ایک نجی فیکٹری ہے، یہاں کام کرو یا عبادت، چوائس از یورس؟"

یہ سن کر میرا دماغ گھوم گیا، یہ کیسی تہذیب پروان چڑھ رہی تھی، دین دنیا سے عاری یہ سرمایہ دار ایک اسلامی ملک کے شہری ہیں اور مجھ سے یہ سلوک ایک سوالیہ نشان تھا؟

ویسے ہمارے گاؤں اور فیکٹری کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا اور میرے ذہن میں رہتا تھا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

بل

ایک مریض نے اپنے معالج سے کہا: "ڈاکٹر صاحب میں ان دنوں کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس کررہا ہوں جس سے میری سستی دور ہوجائے۔ میں چاق و چوبند نظر آؤں اور میرا سرد ہوتا ہوا خون کھولنے لگے۔ کیا کوئی ایسی چیز آپ میرے نسخے میں شامل کرسکتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے سر اٹھائے بغیر نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

"وہ چیز میں نسخے میں نہیں بل میں شامل کروں گا۔"

(ہما نصیر۔کراچی)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں بلا ڈر و خوف روزانہ فیکٹری سے کام نمٹانے کے بعد گھر آجایا کرتا تھا۔

وہ دوسری یا تیسری رات تھی، میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آرہا تھا کہ میری نظر راستے سے ہٹ کر پڑی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ ہیں جو کہ بیٹھے ہیں اور ویسے ہی میں روزانہ رات میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ ایک مخصوص جگہ پر کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ خیر میں مخصوص جگہ پر پہنچا تو آواز سنائی دی۔

''عزیز بیٹا ذرا ادھر آنا ایک صاحب کی مدد کرنی ہے۔'' اپنا نام سن کر میں چونک پڑا کہ اس اندھیری اور ملی جلی چاندنی رات...... کیا کوئی میرا جاننے والا ہے جو کہ میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔

اور میں جلدی جلدی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا تو دیکھا کہ ایک کار کھڑی ہے اور اس کے قریب ایک امیر کبیر شخص اور پاس ہی ایک بزرگ کھڑے ہیں، بزرگ کی نظر جب مجھ پر پڑی تو بزرگ گویا ہوئے۔ ''عزیز بیٹا...... سیٹھ صاحب کی گاڑی رک گئی ہے اور تمہاری مدد کی ضرورت ہے...... آؤ ذرا دھکا لگا کر دیکھتے ہیں کہ شاید یہ اسٹارٹ ہوجائے۔''

اور پھر ہم تینوں نے مل کر جب گاڑی کو دھکا لگایا تو فوراً گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ تو گاڑی والے صاحب بزرگ سے بولے۔ ''محترم بزرگ آپ کا بہت بہت شکریہ میری مدد کرنے کا۔''

یہ سن کر بزرگ بولے۔ ''سیٹھ صاحب کر بھلا تو ہو بھلا...... کرو مہربانی تم اہل زمین پر اور خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر، آپ جائیں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھا کریں۔''

اس کے بعد کار والے صاحب نے بزرگ اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

اس کے بعد بزرگ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''عزیز بیٹا...... بڑے لوگ اکثر اپنی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہیں...... لیکن یہ صاحب ایسے نہیں لگتے...... ان کے دل میں غریبوں کے لئے نرم گوشہ ہے...... خیر اب تم بھی جاؤ...... اللہ بھلا کرے گا۔''

اور میں نے بزرگ سے مصافحہ کیا اور واپسی کے لئے قدم اٹھانے لگا کہ پھر اچانک میرے دل میں آیا کہ میں بزرگ سے معلوم تو کروں کہ کیا انہوں نے بھی کہیں جانا ہے تو میں انہیں ان کی جگہ تک چھوڑ آؤں۔

اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو بزرگ اپنی جگہ سے غائب تھے۔ اور پھر میں تو اچنبھے میں پڑ گیا کہ پلک جھپکتے ہی بزرگ گئے تو گئے کہاں۔

اور پھر جب دوسرے روز میں نے معلومات کی تو پتہ چلا کہ اس جگہ ایک بزرگ کی قبر ہے...... اس کے سوا کچھ اور نہیں...... اور لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ قبر جن صاحب کی ہے وہ اپنے وقت کے بہت پہنچے ہوئے تھے اور اب اندھیری رات میں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

☆......☆......☆

خیر کسی ورکر نے میری بات فیکٹری کے مالک جو اس لڑکی کا باپ تھا اس تک پہنچا دی اس بھلے انسان نے دوسرے دن مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔

''عزیز سارے مزدور میرے دوست ہیں، مجھے پتا چلا کہ رات میں میری بیٹی نے آپ سے بدتمیزی کی ہے، جس کی میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں، اصل میں ہماری نئی نسل کو اپنے بزرگوں کی روایات برقرار رکھنے میں کافی وقت لگے گا۔ آپ دن میں روزے رکھیں اور رات کو عبادت، میں نے ایک مہینے کے لئے آپ کی چھٹی کردی ہے۔ اب آپ عید کے بعد تشریف لائیے گا اور اپنا حساب کتاب کرنا۔''

میں چونک کر بولا۔ ''لیکن کیوں سر جی!''

میں سمجھا شاید عید کے بعد وہ مجھے فیکٹری سے نکال دیں گے۔ لیکن وہ ہنس کر بولے۔ ''ارے میاں! مجھے پتا ہے آپ گریجویٹ ہیں اس لئے عید کے بعد آپ لیبر نہیں بلکہ فیکٹری کے منیجر کے طور پر کام کریں گے، اب تو خوش ہیں ناں۔'' اور پھر میں صاحب کا شکریہ ادا کر کے گھر آ گیا۔



آسیبی پارلر

رشک نور۔فیصل آباد

یہ حقیقت اور زدعام ہے کہ ہر جاندار ہی نہیں بلکہ نادیدہ مخلوق بھی اپنے مسکن کی حفاظت کے لئے اپنی جان لڑادیتی ہے اور یہ کہاں تک حقیقت ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں……

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے اندھیرے میں جنم لینے والی ڈراؤنی خوفناک کہانی

"**بہترین** اور تجربےکار ہیئر ڈریسر کی ضرورت ہے مناسب تنخواہ دی جائے گی۔"

سوزی کی باچھیں اشتہار پڑھ کر خوشی سے کھل گئیں سوزی پچھلے چھ ماہ سے نوکری کی تلاش میں تھی سوائے یہ اشتہار پڑھ کر ایک امید کی کرن نظر آئی…… اگلے دن سوزی صبح سویرے جلدی اٹھی ناشتہ کیا اماں کو بائے بائے بولتی ہوئی گھر سے نکلی۔ کیونکہ اسے پارلر کی مالک سے ملنا تھا وہ آدھے گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد اشتہار میں دیئے گئے پتہ پر پہنچ گئی۔

"جگہ تو یہی لگ رہی ہے۔" سوزی اخبار کھولتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔

"ہیلو میڈم۔" واچ مین اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے بولا پارلر بہت خوب صورت تھا اور سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

"WhoAreYou" سوزی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک خوب صورت لڑکی اس سے مخاطب تھی۔

"ہیلو......" اس کو بغور دیکھتے ہوئے پیار سے بولی۔

"آپ نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ ایک ہیئر ڈریسر کی ضرورت ہے۔" سوزی نے اخبار آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اچھا تو آج ہیئر ڈریسر ہیں؟" وہ چلتے ہوئے بولی تو سوزی بھی اس کے پیچھے ہولی۔

آگے جا کر لڑکی ایک کرسی پر براجمان ہوگئی اور سوزی کو بھی ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔

"میرا نام ڈاکٹر خانی ہے اور میں اس پارلر کی مالک ہوں، آپ حیران کیوں ہوگئیں۔" سوزی کے چہرے کو تکتی ہوئی خانی بولی۔

"نہیں میں سوچ رہی ہوں کہ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو بیوٹیشن کے شعبے میں؟" سوزی اپنی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

خانی مسکرا کر بولی۔ "ڈاکٹر بنانا مجھے میرے ابو کی خواہش تھی اور میری پسند بیوٹیشن بننا تھا سو ابو کے لئے ڈاکٹر بن گئی اور بیوٹیشن اپنے لئے۔"

"سوزی Listen ٹوئی میں تمھیں ایک بات کلیئر کردینا چاہتی ہوں یہاں تم سے پہلے بھی بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں لوگ کہتے ہیں کہ میں نے ایک پراسرار جگہ پر پارلر بنایا ہے یہاں پر روحوں آتماؤں کے سائے ہیں یہ تم سے پہلے جو لڑکیاں یہاں کام کرتی تھیں یہ باتیں سن کر ایک دو دن میں نوکری چھوڑ کر چلی گئیں اگر تم کو ان باتوں سے کوئی مسئلہ ہے تو تم مجھے بتاسکتی ہو۔"

اپنی بیمار ماں کی دوا، گھر کا خرچ یہ سب سوچتے ہوئے سوزی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"مجھے کوئی پرابلم نہیں۔"

"گڈ تو تم کل سے جوائن کرسکتی ہو۔" خانی سوزی: کی طرف خانی فائل بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اوکے میم تو کل ملاقات ہوگی۔" سوزی گھر کے لئے واپس مڑتے ہوئے بولی۔

"ماشاءاللہ۔" خانی اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

اگلے روز سوزی جلدی اٹھی ناشتہ کیا اور پارلر کے لئے نکل پڑی۔

چوکیدار سوزی کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "میڈم آپ اتنی جلدی آگئیں......؟"

سوزی مسکراتے ہوئے بولی۔ "آج جاب کا پہلا دن ہے اور میں غلط امپریشن نہیں ڈالنا چاہتی تھی سو اس لئے جلدی آگئی۔" سوزی آگے بڑھتے ہوئے اپنا بیگ کاؤنٹر پر رکھا اور سامنے لگے بڑے سے شیشے میں خود کو دیکھنے لگی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سنہری بالوں والی لڑکی اندر آتی ہوئی دکھائی دی لڑکی نے آ کر اپنا بیگ کاؤنٹر پر رکھا اور سوزی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"میرا نام عریشہ ہے، میڈم خانی نے مجھے کل تمہارے بارے میں بتایا تھا وہ آج نہیں آرہیں اس لئے آج سارا کام ہم دونوں کو ہی کرنا ہے، کچھ دیر میں کلائنٹ آنے والے ہیں تم جا کر تیاری کرو۔" اور خود کرسی پر براجمان ہوگئی۔

سوزی میک اپ کو ترتیب دے رہی تھی کہ اچانک اسے سردی محسوس ہونے لگی۔

"اتنی گرمی میں مجھے سردی کیوں لگ رہی ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

اچانک پارلر کی لائٹس بجھ گئی تو سوزی گھبراتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دوڑی لیکن کاؤنٹر پر عریشہ نہ تھی سوزی گھبرائی ہوئی آواز میں "عریشہ عریشہ" پکارنے لگی۔

اور پھر چوکیدار سوزی کی آواز سن کر اندر آیا وہ سوزی کو بوکھلائی ہوئی حالت میں دیکھ کر بولا۔

"کیا ہوا میم آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں۔"

"عریشہ کہاں ہے......؟" سوزی چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کون عریشہ؟" واچ مین نے حیرانی سے پوچھا۔

سوزی گھبراتے ہوئے۔ "وہ جو یہاں کاؤنٹر پر تھی۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"یہاں پر تو آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ جو کاؤنٹر پر لڑکی ہوتی ہے وہ تو دو ماہ پہلے ہی جاب چھوڑ چکی ہے۔" واچ مین نے کہا۔

"جو ابھی ابھی یہاں پر آئی تھی وہ کون تھی؟" سوزی واچ مین کے چہرے کی طرف دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"یہاں پر تو آپ کے سوا کوئی نہیں آیا یہ آپ کا وہم ہوگا۔" واچ مین سوزی کو دلاسہ دیتے ہوئے باہر چلا گیا۔

"یہ میرا وہم کیسے ہوسکتا ہے۔" سوزی خود سے ہم کلام ہوتے ہوئے بولی۔

"وہ لڑکی اس کے سنہری بال یہ سب یہ میرا وہم کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

کہ اچانک کاؤنٹر کی کرسی ہلنے لگی تو سوزی مزید خوف زدہ ہوگئی پھر ایک دم سارے پارلر میں خاموشی چھاگئی۔ سوزی نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے ہر چیز تاریکی میں ڈوبی نظر آئی اس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا تو چھ بج رہے تھے۔

"شام کے چھ بج گئے ہیں یا یہ گھڑی خراب ہے۔"

وہ جلدی سے دوڑتی ہوئی باہر گیٹ کی طرف آئی تو باہر کا اندھیرا اس بات کا ثبوت تھا کہ شام ڈھل چکی ہے۔

"کیا شام کے چھ بج چکے ہیں۔؟" سوزی گیٹ پر کھڑے واچ مین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"جی میم۔" واچ مین ایک نظر اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"شام کے چھ بج چکے ہیں اور میں تھوڑی دیر پہلے تو آئی ہوں۔ پارلر میں کوئی کلائنٹ بھی نہیں آیا۔" سوزی پریشانی سے اپنے ماتھے پر ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

واچ مین سوزی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میم سب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آسیبی پارلر ہے اس لئے یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں۔" تو سوزی ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے بولی۔

"خانی میڈم نے تو کہا تھا کہ انہیں ڈیوٹی پر دھیان رکھنا اور ذہن کو کہیں اور بھٹکنے نہ دینا۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

واچ میں مسکرا کر بولا۔ "اگر آپ گھر جانا چاہئیں تو جاسکتی ہیں۔"

سوزی نے پارلر کے اندر سے بیگ لیا اور گھر کے لئے روانہ ہوگئی۔

"لوگ سچ تو کہتے ہیں کہ یہ جگہ آسیبی ہے میرا وقت کیسے گزر گیا وہ لڑکی عریشا، یہ آج جاب کا پہلا دن میرے لئے کتنا برا گزرا، ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہوا چلو خیر جاب تو ملی۔" سوزی بالوں میں کلپ لگاتے ہوئے خود سے ہمکلام ہوئی۔

اگلے دن سوزی جلدی اٹھی ناشتہ کیا اور پارلر چلی گئی۔

"ویلکم مس سوزی" خانی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتی ہوئی بولی۔

Thankyou میڈم۔" سوزی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"سوری سوزی کل آپ کا پہلا دن تھا اور میں پارلر نہیں آئی۔" خانی نے بولا۔

سوزی اپنا بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی کل پارلر میں کوئی نہیں آیا تھا۔"

خانی اخبار اٹھاتے ہوئے۔ "پر آج بہت سے لوگ آنے والے ہیں۔"

پھر کچھ دیر بعد پارلر میں ہجوم لگ گیا، خانی اور سوزی نے مل کر سب کو تیار کیا رات کے آٹھ بجے کے قریب وہ فری ہوئیں۔

خانی کو کام کے سلسلے میں جلدی گھر جانا پڑا اور پھر معمول کے مطابق سوزی چینج روم میں پیشہ ور لباس تبدیل کرنے گئی اور جب وہ چینج روم سے باہر آئی تو اسے اپنے پیر پر کچھ گیلا گیلا سا محسوس ہوا وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار چیخ اٹھی اس کے پیر خون سے لت پت تھے کہ اچانک پورے پارلر میں ایک عجیب وغریب بو پھیل گئی۔

سوزی کا اس بو کی وجہ سے دم گھٹ رہا تھا۔ "یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔" پھر پارلر کی لائٹ بند ہوگئی سوزی چیخے جارہی تھی کہ اس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا تو ایک جھٹکے سے ہال کی لائٹ آن ہوئی۔

سوزی نے گردن پیچھے کی طرف موڑی تو اس کی چیخ نے اس ماحول میں اور خوف پیدا کیا سوزی کے سامنے اب ایک لمبے قد کی عورت کھڑی تھی جس کی گردن اس کے جسم کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

سوزی کو جیسے کچھ یاد آیا وہ اپنے بیگ کی طرف بھاگی اور بیگ سے ایک کارڈ نکالا جس پر آیت الکرسی لکھی تھی پھر اس نے وہ کارڈ اس عورت کی طرف کردیا جس سے عورت سوزی کے قریب نہیں آرہی تھی سوزی پارلر سے باہر نکل گئی اور فون کرکے خانی کو بلایا۔

تھوڑی دیر میں خانی اور عالم بابا پارلر کے اندر داخل ہوئے پارلر کی ہر چیز بکھری ہوئی پڑی تھی۔

عالم بابا نے کچھ پڑھا اور پارلر کے ایک کونے کی طرف منہ کرکے پھونک ماری تو ایک عورت بابا کے پاس ڈگمگاتی ہوئی آ گئی۔

"کون ہو تم اور کیوں یہاں انسانوں کو پریشان کرتی ہو۔" بابا نے غصے سے اس عورت سے پوچھا۔

"میں جولی ہوں یہ جگہ میری ہے میری قبر ہے اس جگہ، پر میری قبر کو مٹا دیا گیا، میں بھی اس جگہ کو نہیں چھوڑوں گی اگر یہ پارلر یہاں سے نہ ہٹایا گیا تو میں سب کو ماردوں گی۔"

یہ سن کر بابا نے خانی کو مشورہ دیا کہ تم یہ جگہ چھوڑ دو کیونکہ پچھلے وقتوں میں یہاں پر قبرستان تھا لیکن اب لوگوں نے اپنے فائدے کے لئے قبرستان پر اپنے گھر اور دکانیں بنالی ہیں۔" اور بابا کی بات سن کر خانی نے تہیہ کرلیا کہ اس جگہ پر پارلر نہیں رہنے دے گی۔"

خانی کو اپنی فیورٹ جگہ چھوڑنے پر دکھ تو بہت ہوا پر وہ کسی کا حق بھی تو نہیں چھین سکتی تھی، خانی نے اپنا پارلر دوسری جگہ شفٹ کرلیا، خانی کا پارلر اب خوب چل رہا تھا، پارلر میں سوزی اور اس کی میڈم خانی اب بہت خوش تھیں کیونکہ ان کو اب کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM



آسیب کا سایہ

ڈاکٹر رانا عامر شہزاد۔ننکانہ صاحب

نوجوان کی آواز سنائی دی لاشوں کی حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہے، آنکھیں سرے سے غائب، پیٹ سے آنتیں باہر نکلی ہوئی اور زیادہ تر اعضا غائب اور ایسی صورت میں……

خوف ودہشت کے سمندر میں غوطہ زن……ناقابل فراموش دہشت ناک……کہانی

میں آج جو واقعہ آپ کو سنانے جا رہا ہوں میرے ساتھ تقریباً پچیس سال پہلے پیش آیا، ان دنوں میں ایک چھوٹے سے شہر میں بطور پولیس آفیسر فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میری زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی۔ مجھے چڑیل، جنات اور بدروحوں وغیرہ کے متعلق کہانیاں پڑھنے اور ڈراؤنی فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ دین اسلام کے مطابق جنات کی موجودگی پر تو میرا پکا ایمان تھا مگر اس بات پر مجھے قطعاً یقین نہیں تھا کہ جنات وغیرہ لوگوں کے جسموں پر قبضہ کر لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر انہی دنوں ڈپٹی صاحب نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا اور ایک ایسی اسائنمنٹ تفویض کی جس نے مجھے جنات کی کہانیوں میں موجود حرکات پر یقین کرنے پر مجبور کر دیا۔

ڈپٹی صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”مسٹر خالد آپ

www.urdusoftbooks.com

ہمارے ڈپارٹمنٹ کے ایک بہترین اور قابل پولیس آفیسر ہیں، آپ نے پہلے بھی اپنے جملہ فرائض احسن طریقوں سے سرانجام دیئے ہیں لیکن ان دنوں ہم ایک بہت گھمبیر مسئلے سے دوچار ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے بہت دور پریت نگر نامی ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ جہاں پچھلے دو مہینوں میں سات نوجوان لڑکوں کی پراسرار ہلاکتیں ہوچکی ہیں اور مرنے والوں کی لاشیں انتہائی خطرناک حالت میں ملتی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف اہل پریت نگر بلکہ اردگرد کے گاؤں کے لوگوں میں انتہائی تشویش پائی جاتی ہے اور پورا علاقہ نہایت افسردہ اور خوف و ہراس میں مبتلا ہے۔ وہاں کی پولیس تاحال اس معمہ کو سلجھانے اور قاتلوں کو پکڑنے سے معذور دکھائی دے رہی ہے جس کی وجہ سے ہم سب پر ہائی کمان کا زبردست پریشر ہے۔

لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ اسائنمنٹ آپ کو سونپی جائے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ پہلی فرصت میں پریت نگر کے لئے روانہ ہوجائیں گے اور جلد از جلد اس اہم اسائنمنٹ کو کامیابی سے مکمل کرکے ہمارے اعتماد میں اور اضافہ کریں گے میری تمام مدد اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

میں نے فوراً حامی بھرلی اور جلدی سے گھر روانہ ہوا۔ اور ضروری سامان باندھ کر بذریعہ ٹرین پریت نگر روانہ ہوگیا۔ سات گھنٹے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد آخر میں پریت نگر کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر اترا اور ایک تانگہ پکڑ کر گاؤں کی جانب گامزن ہوگیا پریت نگر نام کی طرح بہت خوب صورت گاؤں تھا۔ ہرے بھرے کھیت، کھیتوں میں لگے ٹیوب ویلز اور گاؤں کا کچا راستہ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ مگر افسوس کہ اتنے خوب صورت گاؤں کو کس کی نظر لگ گئی تھی کہ گاؤں کا ہر باشندہ انتہائی پریشان اور خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

جلد ہی میں تھانے کی عمارت کے اندر موجود تھا۔ تھانے کو ایک ویرانہ کہنا ہی مناسب ہوگا عمارت بہت پرانی اور بوسیدہ ہوچکی تھی صحن میں پیپل کا بہت بڑا اور گھنا درخت موجود تھا جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور تھانہ چار دیواری اور تمام بنیادی سہولیات سے محروم تھا، تھانے میں تین سپاہی موجود تھے جن سے میں نے اپنا رسمی سا تعارف کرایا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ مجھ سے گھل مل گئے۔

تھانے کے اندر مناسب رہائش کی عدم دستیابی کے بعد مجھے میرے عملے کی مدد سے گاؤں میں ایک چھوٹا سا خوب صورت کمرہ رہائش کے لئے رات ہونے سے پہلے ہی مجھے مل گیا۔ میرا باقی اسٹاف مقامی ہونے کی وجہ سے مجھے اکیلے ہی رہائش رکھنا پڑی۔

نماز عشاء کے بعد ہم سب نے مل کر گاؤں میں ہونے والے واقعات پر تفصیلی گفتگو کی تھی تبھی مجھے شیدے سپاہی سے معلوم ہوا کہ شروع سے ہی پریت نگر بہت پرامن گاؤں تھا۔ یہاں کے تمام باشندے بہت اچھے کردار کے حامل ہیں کسی سے کسی کی کوئی دشمنی نہیں، پھر بھی پچھلے دو مہینوں سے گاؤں میں موجود چوہدری رفاقت کی پرانی حویلی سے نوجوانوں کی لاشیں مل رہی ہیں۔

اور لاشوں کی حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہیں، آنکھیں سرے سے غائب، پیٹ سے آنتیں باہر نکلی ہوئی کسی کا کوئی اعضا غائب اور رنگ بالکل نیلا ہوتا ہے۔"

میں غصے سے بولا۔ "تو آپ سب کس مرض کی دوا ہیں اتنے بے گناہ لوگوں کو بے دردی سے قتل کردیا گیا اور قاتل آج تک آزاد پھر رہے ہیں!"

تبھی دوسرا سپاہی انور بولا۔ "صاحب جی!

"ہم نے گاؤں والوں سے مل کر قاتل کو پکڑنے کے لئے ہر ممکن کوششیں کی ہیں۔ چوہدری صاحب بھی ہمیں ہر طرح سے مدد فراہم کرتے رہے ہیں مگر قاتل اتنا ہوشیار ہے کہ کسی قسم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا اور گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ شروع سے ہی حویلی پر جنات کا سایہ ہے اس لئے یہ کام جنات کا ہی ہے۔"

میں نے غصے سے انور کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بکواس کرتے ہیں یہ جاہل لوگ اس جدید دور میں بھی پرانی بوسیدہ باتوں پر یقین رکھتے ہیں افسوس ہے ایسے لوگوں پر۔"

اگلے ہی دن میں سپاہیوں کے ہمراہ حویلی میں گیا تا کہ قاتلوں کو پکڑنے کے لئے کوئی لائحہ عمل بنا سکوں۔ مگر خلاف توقع میرے تینوں سپاہیوں نے حویلی کے اندر جانے سے انکار کر دیا وہ بری طرح خوف میں مبتلا ہو چکے تھے۔ میرے پرزور اصرار کے باوجود بھی وہ حویلی کے اندر جانے سے انکاری رہے۔ یہاں تک کہ شیدا بولا۔

"صاحب جی! ہم سب نوکری چھوڑنے کو تیار ہیں مگر حویلی کے اندر کسی صورت نہیں جائیں گے کیونکہ حویلی کے اندر جو بھی گیا پھر واپس نہ آیا۔"

میں ان کو کوستا ہوا اکیلا ہی حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ حویلی بہت بڑی تھی انتہائی پرانی ہونے کے باوجود بھی یہ تین منزلہ عمارت بہت خوب صورت لگ رہی تھی صحن میں موجود تالاب بہت خوب صورت نظارہ پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں میں نے ساری حویلی کا مکمل معائنہ کیا جس میں بہت سارے چھوٹے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔ سب بوسیدہ اور کھلے ہوئے تھے مگر دوسری منزل پر ایک بڑا کمرہ لاک تھا تالے سے محسوس ہو رہا تھا جیسے کافی عرصے سے یہ کمرہ بند ہو۔

مجھے اس بند کمرے کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ پھر واپسی پر میں چوہدری رفاقت کی کوٹھی پر پہنچا جو کسی ضروری کام کی وجہ سے پچھلے دو دنوں سے گاؤں میں موجود نہ تھا۔

اس لئے میں نے اس سے ملنا ضروری سمجھا تا کہ کارروائی مزید آگے بڑھائی جا سکے۔ گاؤں والوں کی نظروں میں چوہدری کی بہت عزت تھی اور بقول ان کے چوہدری بہت نیک اور معزز انسان تھا مگر میری نظر میں وہ اچھا انسان نہ تھا اور میرا دل کہتا تھا کہ ان واقعات میں چوہدری رفاقت کا ہاتھ ضرور شامل ہے۔

پیشہ ورانہ طور پر چوہدری سے ملاقات کے دوران میں نے کچھ ایسی باتیں نوٹ کیں جس سے میرا شک چوہدری تک جانا لازم تھا۔

چوہدری سے ملاقات خوشگوار ماحول میں ہوئی اور چوہدری نے مجھ سے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! ہمارے گاؤں کو نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ گاؤں کے سب لوگ اچھے اور دیندار ہیں اور میں بھی گاؤں والوں کو اپنی فیملی کی طرح پیار کرتا ہوں اس لئے انسپکٹر صاحب میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جلد از جلد قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے ہر ممکن اقدامات کیجئے اور ہمارے گاؤں کو اس اذیت سے بچانے میں ہماری مدد کیجئے۔"

میں نے چوہدری کو بتایا کہ "میں آج آپ کی پرانی حویلی میں گیا تھا۔ تا کہ مکمل معائنہ کر سکوں وہاں دوسری منزل پر ایک کمرہ لاک ہے اسے تو کھولئے ہو سکتا ہے اس کمرے سے کوئی سراغ مل جائے۔"

تو چوہدری نے جواب دیا۔ "انسپکٹر صاحب! یہ واقعات تو پچھلے دو مہینوں سے شروع ہوئے ہیں اور یہ کمرہ تو کافی عرصہ سے بند ہے ہمارے آباؤ اجداد کہتے تھے اس کمرے میں آسیب موجود ہے، وہاں سے عجیب وغریب آوازیں آتی تھیں اسی وجہ سے ہم نے وہ حویلی چھوڑی تھی اور آج تک اسی خوف کی وجہ سے ہم نے وہ دروازہ نہیں کھولا۔

میرے بہت اصرار پر بھی چوہدری کمرہ کھولنے کے لئے آمادہ نہ ہوا اور سخت لہجے میں بولا۔ "اگر میں یہ دروازہ کھول دوں تو میرے خاندان پر کوئی ناگہانی آفت آنے کا خطرہ ہے لہٰذا اس کو کھولنا میرے لئے ممکن نہیں اور ویسے بھی اس دروازے سے گاؤں میں ہونے والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔

ظاہری طور پر تو چوہدری اچھا انسان نظر آ رہا تھا مگر میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ چوہدری ہر حال میں ان واقعات میں ملوث ہے ہو سکتا ہے کہ چوہدری کی مرنے والوں سے دشمنی ہو اور وہ آسیب کی آڑ میں ان کو

ختم کروا دیتا ہو۔ مگر ٹھوس ثبوت اور شواہد کے بغیر میں اس با اثر چوہدری کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا اوپر سے گاؤں والے بھی چوہدری پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔

ہفتے کے دن ابھی میں تھانے میں پہنچا ہی تھا کہ شیدا گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ ''صاحب جی! غضب ہو گیا آج پھر ایک لاش حویلی میں ملی ہے۔''

پھر میں فوراً جائے وقوعہ پر پہنچا اور لاش دیکھ کر میرے حواس گم ہونے لگے مرنے والے کی آنکھیں غائب تھیں، پیٹ بہت بری طرح زخمی تھا، دایاں بازو اور ایک پاؤں غائب تھا۔ اور رنگ مکمل طور پر نیلا ہو چکا تھا جیسے نیلی سیاہی لاش پر ڈال دی گئی ہو۔ سارا گاؤں وہاں جمع ہو چکا تھا۔ سب سہمے اور ڈرے ہوئے تھے مرنے والے کے گھر والے غم سے نڈھال ہو رہے تھے۔ موقع پر چوہدری بھی پہنچ گیا جو خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا اور آتے ہی بولا۔ ''انسپکٹر صاحب خدا کے لئے کچھ کریں اور نفری طلب کیجئے۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ کدھر ہے آپ کا قانون جو اس قدر معذور ہو چکا ہے کہ ہمارے تحفظ سے آنکھیں چرا رہا ہے۔''

ضروری کارروائی کے بعد لاش کو سپرد خاک کر دیا گیا پھر میں نے گاؤں کی میٹنگ بلائی اور سب گاؤں والوں کو اس بات پر متفق کیا کہ جب تک قاتل قانون کے شکنجے میں نہیں آ جاتا تب تک سب مل کر بالخصوص حویلی کے ارد گرد اور بالعموم گاؤں کے چاروں اطراف پہرہ دیں گے۔

پھر گاؤں والے باری باری پہرہ دینے لگے اور میں بھی حویلی پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا جب تک پہرہ لگا رہا تب تک گاؤں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا اور اسی لئے لوگ میری بہادری کو سراہتے ہوئے میری تعریفیں کرنے لگے مگر مجھے صرف اپنے کام سے مطلب تھا اور میں جلد از جلد یہ کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔

عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں تھانے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے مجھے ایک خط تھما دیا اور بولی۔ ''صاحب جی! خط پڑھنے کے بعد جواب ضرور لکھ دیجئے گا اور میں کل اسی وقت اسی جگہ لوگوں کی نظروں سے بچ کر آپ سے جوابی خط لے جاؤں گی۔'' اور جاتے ہوئے بولی۔ ''انسپکٹر جی! خط اکیلے ہی پڑھیے گا۔'' اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔

میں تھانے جا کر اب تک ہونے والی ساری کارکردگی لکھنے لگا تاکہ اسے ہیڈ آفس بھیج سکوں زیادہ کام کی وجہ سے خط پڑھنا میں بھول ہی گیا۔

نماز عشاء کے بعد اپنے کمرے میں جا کر مجھے خط کا خیال آیا تو میں نے فوراً اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا جس کی تحریر کچھ یوں تھی۔

خالد السلام علیکم

جب سے آپ ہمارے گاؤں آئے ہیں، میں آپ کی بہادری، عقلمندی اور اچھی عادات کی وجہ سے دل سے آپ کی عزت کرنے لگی ہوں۔ ساری ساری رات مجھے نیند نہیں آتی اور میں آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں، مجھے لگتا ہے جیسے آپ سے پیار کرنے لگی ہوں، میرے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے مگر مجھے صرف آپ کی محبت کی ضرورت ہے لہٰذا براہ مہربانی میری محبت کو قبول کر کے خدمت کا موقع دیں۔ پوری زندگی آپ کی باندی بن کر رہوں گی۔

والسلام
صرف آپ کی
سونیا رفاقت

میں نے خط پڑھتے ہی سوچا ابھی ایک مصیبت ٹلی نہیں اور دوسری آنے کو تیار ہے۔ ویسے بھی ان دنوں مجھے پیار وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں پیار وغیرہ کو صرف ڈرامہ سمجھتا تھا اور گاؤں کے لوگ میری بہت عزت کرتے تھے اس لئے میں اپنے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے خط کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

اور اگلے دن بوڑھی عورت سے کہہ دیا۔ ''اپنی مالکن سے کہو کہ میں پیار و محبت پر یقین نہیں رکھتا اس

لئے مستقبل میں مجھے کوئی خط نہ لکھیں۔"

☆......☆......☆

ہم سب نے مل کر پورا ایک مہینہ سخت پہرہ دیا تو گاؤں میں کوئی بھی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا جس کی وجہ سے مجھے یقین ہوگیا کہ قاتل جو بھی ہے اس کا تعلق اسی گاؤں سے ہے کیونکہ پہرے میں ہم نے ہر طرف کڑی نظر رکھی ہوئی تھی رفتہ رفتہ پہرے کو نرم کردیا گیا ویسے بھی گزرتے وقت کے ساتھ لوگوں کے دلوں سے بھی کچھ وحشت کم ہونے لگی تھی ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک اور لاش حویلی کے تالاب سے ملی جس کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔

میں سخت حیران ہوا کہ تقریباً ڈیڑھ مہینے میں دوران پہرہ کوئی مسئلہ نہیں ہوا مگر جیسے ہی تھوڑی نرمی ہوئی پھر چالاک قاتل نے گھناؤنا کام کر دکھایا اب تو مجھے سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ یہ سب کچھ چوہدری ہی کروا رہا ہے کیونکہ پہرے میں کمی کروانے میں چوہدری پیش پیش تھا۔ پورے گاؤں میں جیسے صف ماتم بچھ گئی ہو ہر شخص نہایت افسردہ نظر آ رہا تا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا لوگ جیسے ہنسنا بھول گئے ہوں۔ چاروں اطراف سناٹا چھا گیا تھا ہر کسی کو اپنی جان کی فکر ہو رہی تھی کہ نجانے کب اس کی باری آ جائے اور ویسے بھی جب کسی گاؤں میں درجن کے قریب نوجوان لڑکے انتہائی سفاکی اور بے دردی سے قتل کردیے جائیں وہاں خوف نہ ہو تو کیا ہوگا؟

نماز ظہر کے بعد میں امرودوں کے باغ میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک چوہدری کی اکلوتی بیٹی سونیا میرے سامنے آ گئی آج پہلی بار میں نے اسے اتنے قریب سے دیکھا تھا وہ انتہائی خوب صورت تھی میں ابھی غور سے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ انداز شوخی سے بولی۔

"انسپکٹر صاحب! میں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے میں تو آپ کی راہوں میں پلکیں بچھائے رہتی ہوں مگر آپ ہیں کہ مجھ سے نظریں ہی نہیں ملاتے۔ خدا کے لئے اتنے ظالم نہ بنئے کچھ میرا بھی خیال کریں۔"

میں نے غصے سے سونیا کو سمجھایا کہ گاؤں میں لوگوں کے گھر اجڑ رہے ہیں لوگ وحشت کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور تمہیں اس نازک گھڑی میں عشق سوجھ رہا ہے جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے میرا کام کرنے دو اور ویسے بھی یہ پیار وغیرہ سب ڈرامہ بازی ہے بس دو دن کا بخار ہے جلد ہی اتر جائے گا۔"

میری باتیں سن کر وہ رو دی اور بولی۔ "خدا گواہ ہے کہ گاؤں میں ہونے والے واقعات سے میں خود بھی بہت پریشان ہوں، مرنے والے سب میرے بھائیوں جیسے ہیں مگر یہ کم بخت دل کو بھلا کون سمجھائے۔" اس کا یہ انداز بیان میرے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا مگر میں اسے وہیں چھوڑ کر تھانے پہنچ گیا۔

رات کو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میں سوچ رہا تھا کہ گاؤں میں جو قیامت صغریٰ برپا ہوئی ہے اس نے کتنے گھروں کے چراغ گل کردیے ہیں آخر لوگوں کا کیا قصور ہے؟ جتنے بھی لوگ مارے گئے تھانے میں ان کا کوئی بھی ریکارڈ موجود نہ تھا وہ سب اچھے انسان تھے پھر انہیں اتنی بے دردی سے کیوں قتل کردیا گیا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب سوجھی کہ کیوں نہ میں کسی رات اکیلا حویلی میں جاؤں اور بند کمرے کو کھولوں، شاید مجھے کوئی سراغ مل سکے۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ چوہدری کا ان ہلاکتوں میں ضرور کوئی کردار ہے پھر نجانے کب میری آنکھ لگی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دن تیزی سے گزرتے رہے مگر ہر ممکن اقدامات کے باوجود قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

چوہدری نے حویلی کو مکمل طور پر سیل کردیا تھا اس لئے اب کوئی بھی حویلی میں نہیں جاسکتا تھا۔ میں بھی بارہا کوششوں کے باوجود بند کمرے تک پہنچنے میں ابھی تک ناکام تھا۔

تقریباً آٹھ دن بعد حویلی کے تالاب سے ایک اور لاش ملی اور پورے علاقے میں افراتفری پھیل گئی اور

ہر طرف لوگوں کو اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ اخبارات اور ٹی وی پر میڈیا پولیس کی کارکردگی کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب بھی ان حالات میں سخت پریشان تھے ان پر سینئرز حکام کا سخت پریشر تھا مگر پھر بھی انہوں نے مجھ پر اعتماد جاری رکھا اور میرے کہنے پر مزید نفری پریت نگر بھجوادی مگر کچھ حاصل نہ ہو رہا تھا۔

میری سخت جدوجہد اور ہر ممکن اقدامات پر اہل پریت نگر بھی مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور سونیا بھی مسلسل میرا پیچھا کررہی تھی انہی دنوں میں بھی دل سے مجبور ہوگیا اور تیزی سے سونیا کی طرف مائل ہونے لگا اور دھیرے دھیرے ہماری انتہائی خفیہ ملاقاتوں نے محبت کا روپ دھار لیا ہماری محبت خالص اور پاکیزہ تھی مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے تڑپنے لگے اور اس تڑپ کے باوجود بھی میرے فرائض میں کوئی کوتاہی نہ آئی اور میں مسلسل اپنے کام پر مکمل توجہ دے رہا تھا۔

میرے عملے نے انتہائی جانفشانی سے کام کیا اور کافی حد تک مختلف پیشہ ورانہ مہارتوں کی مدد سے ہم نے ان واقعات پر قابو پالیا مگر جب تک قاتلوں کا سراغ نہ ملتا ہم کسی صورت چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ایک دن میں تھانے میں پراگریس رپورٹ لکھنے میں مصروف تھا کہ سونیا نے مجھے کسی نوکرانی کے ہاتھ خط بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا۔

مسٹر خالد السلام علیکم!

آج میں آپ کی محبت کا امتحان لینا چاہتی ہوں اگر آپ پورا اترے تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ آپ بھی مجھ سے میری طرح سچی محبت کرتے ہیں اگر ناکام ہوئے تو آج سے ہماری محبت ختم لہٰذا آج آپ کو مجھے حویلی میں ملنے آنا ہوگا اور وہ بھی رات کو اور ویسے بھی گاؤں میں رونما ہونے والے واقعات کا حویلی سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ کچھ خاص لوگ میرے ابو کو پھنسانے کے لئے ڈرامہ رچا رہے ہیں اب گاؤں میں خفیہ ملاقاتیں کرنا کافی دشوار ہو رہا ہے اسی لئے ہمیں اب حویلی میں ہی ملنا چاہئے تاکہ ہم بلاخوف وخطر ملن کی سنہری ملاقاتوں سے لطف اندوز ہوسکیں آخر کب تک ہم جوانی کی تڑپ کو جسموں میں قید رکھیں؟ امید ہے آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ آج رات حویلی میں ضرور آئیں گے مگر یاد رہے آپ نہ آئے تو پوری زندگی میرا چہرہ دیکھنے سے محروم رہیں گے۔ والسلام۔

صرف آپ کی سونیا

پہلے تو میں سونیا کی اس حرکت اور خواہش پر حیران ہوا مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حویلی جانے کا ارادہ کیا اور ویسے بھی میں حویلی میں جا کر بند کمرہ کھولنا چاہتا تھا تاکہ میرا کمرے والا سسپنس دور ہو۔

میں نے سونیا کی بات مان لی اور خط میں لکھ دیا کہ میں اپنی جان کو ملنے آج رات حویلی میں ضرور آؤں گا۔

رات کے 11 بجے میں اپنے کمرے سے نکلا اور بہت احتیاط سے حویلی کی جانب چل پڑا، گرمی بہت زیادہ تھی ہر طرف ہو کا عالم تھا حویلی گاؤں سے ذرا باہر بنی ہوئی تھی راستے میں بہت بڑا قبرستان تھا جس کے قریب سے گزرتے وقت دل ذرا سا خوف محسوس کررہا تھا مگر ایک تو محبوب سے ملنے کی خواہش مگر دوسرا کمرے کا راز جاننا میرے لئے بہت بڑی بات تھی۔

حویلی پر پہنچتے ہی سونیا نے مین گیٹ پر میرا پرتپاک استقبال کیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی اور نہایت پیار اور شوخی سے بولی۔ ”جلدی سے اندر چلئے کوئی دیکھ نہ لے۔“ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ حویلی کے ارد گرد کوئی پہرے دار موجود نہیں سونیا صورتحال کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ”جناب بے فکر رہئے آج کوئی پہرے دار نہیں آیا۔“ میں فوراً بولا۔ ”کیوں؟“

تو وہ میرے بالکل قریب آ کر بولی۔ ”کیونکہ آج ہمارے حقیقی ملن کی رات ہے اس لئے!“ اور مجھے نہایت پیار سے حویلی کی دوسری منزل پر موجود اسی بند کمرے کے دروازے پر لے گئی اور بند کمرے کا تالا

کھولنے لگی میں نے فوراً کہا۔ ''سونیا جی چوہدری صاحب تو کہتے ہیں کہ اس کمرے کو ہم نے کبھی کھولا نہیں اور اس کے کھلنے سے ہمارے خاندان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔'' تو وہ بڑے پیار اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ''جناب ایسی کوئی بات نہیں اصل میں اس کمرے میں ہمارے بزرگوں نے بہت سارا خزانہ چھپا رکھا ہے صرف اسی لئے اس کو ہمیشہ بند رکھا جاتا ہے۔''

میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اس نے پیار سے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے بولنے سے منع کر دیا۔ سونیا آج بہت خوب صورت لگ رہی تھی کمرہ اندر سے بہت خوب صورت تھا کھڑکیوں کے اوپر بہت خوب صورت پردے لٹک رہے تھے۔ ٹیبل، روشن دان، صوفے، کرسیاں اور کھانے پینے کے لئے استعمال ہونے والے تھوڑے سے برتن بھی کمرے میں موجود تھے اور فرش پر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا مگر کمرہ بجلی سے محروم تھا البتہ روشنی کے لئے لالٹین موجود تھی جن کی مدھم روشنی میں بیٹھ کر ہم پیار و محبت کی باتیں کر رہے تھے اس وقت میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کر رہا تھا کہ سونیا جیسی خوب صوت اور جوانی کے نشے سے بھرپور لڑکی کا مجھے قرب حاصل تھا۔

باتیں کرتے کرتے اچانک سونیا اٹھی اور بولی۔ ''مسٹر خالد معاف کیجئے میں آپ کی خدمت میں کچھ پیش کرنا تو بھول گئی۔'' وہ دھیرے سے بیڈ سے اٹھی اور ٹیبل پر پڑے جگ سے کچھ بھر کر گلاس لا کر مجھے اپنے پیارے ہاتھوں سے پلاتے ہوئے بولی۔ ''لو جان جوس پیئیں۔''

گلاس منہ کے قریب آتے ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ یہ شراب ہے میں حیرت سے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سونیا یہ کیا ہے؟ تم مجھے حرام اور گندی چیز پلا رہی ہو۔''

تو وہ فوراً بولی۔ ''بے شمار ہجر کی راتوں کی سختیاں جھیل کر اب ملن کی رات آئی ہے تو تم انکار کیوں کرتے ہو اگر میں تمہارے قرب کے حصول کے لئے اس خوفناک حویلی میں صرف تمہاری خاطر آ سکتی ہوں تو تم میرے لئے شراب نہیں پی سکتے۔''

میں نے اس کے نشیلے لبوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سونیا میں تمہارے لئے جان بھی دے سکتا ہوں مگر خدا کے لئے مجھے شراب سے دور رکھو۔'' تو وہ اپنی لمبی زلفوں کو چہرے سے ہٹا کر بولی۔ ''او کے شراب نہ سہی مگر شباب تو چلے گا نا؟''

اور مجھے بیڈ پر لٹا کر بوس و کنار کرنے لگی۔ سنا تھا جوانی دیوانی ہوتی ہے اسی لیئے میں بھی ہوس کی ندی میں بہنے لگا سونیا ہوش وحواس سے بیگانہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور پھر میں نے بھی آج ہر حد پار کرنے کی ٹھان لی تھی۔

اچانک سونیا نے بڑھتے ہوئے ہاتھ روک لئے اور لڑھک کر بیڈ سے فرش پر جا گری۔ فوراً میں بھی سونیا کو اٹھانے کے لئے لپکا اور اسے اٹھا کر بیڈ پر بٹھایا اور گرنے کی وجہ پوچھنے لگا تو سونیا بولی۔ ''یار جان کوئی مسئلہ نہیں اچانک چکر آ گیا تھا مگر تم نے اپنے گلے میں اللہ کے نام والا لاکٹ پہن رکھا ہے پلیز اسے اتار دو۔''

اب ایسے کام کے دوران اتنی پاک اور مبارک ہستی کا نام جسموں سے ٹکرانا تو غلط بات ہے۔ میری نظر لاکٹ پر پڑی تو مجھے فوراً ہوش آ گیا اور میں جلدی سے اٹھ کر شرٹ پہننے لگا تو سونیا جلدی سے بولی۔ ''پلیز یہ لاکٹ اتار کر جلدی سے میری بانہوں میں آ جاؤ اور برسوں سے لگی میری پیاس بجھا دو۔''

مگر میں بولا۔ ''نہیں سونیا یہ غلط کام ہے ہمیں اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود سے گزرنا نہیں چاہئے۔''

سونیا میری منتیں کرنے لگی مگر میں واپسی کے لئے اصرار کرنے لگا کیونکہ اب میرا ضمیر اور ایمان دونوں جاگ چکے تھے اتنے میں سونیا اٹھی اور بولی۔ ''براہ مہربانی جلدی سے لاکٹ اتار دو وقت تیزی سے گزر رہا ہے میں نے گھر بھی جانا ہے۔'' اور میز کی جانب بڑھنے لگی۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں نے پیچھے سے

سونیا کو دیکھا تو اچانک میری نظر اس کے پاؤں پر پڑی جو الٹے تھے میرے تو ہوش ہی اڑ گئے میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہونے لگا اور سونیا شراب کا ایک گلاس پینے کے بعد ایک گلاس میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''خالد پلیز اب انکار نہ کرنا۔'' مگر میں بری طرح ڈر چکا تھا خوف سے میرا جسم کانپ رہا تھا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔'' سونیا مجھ سے کہہ رہی تھی۔'' جان کیا ہوا اتنے پریشان کیوں ہو۔'' مگر میری آواز بند ہو رہی تھی۔'' ت۔ت ک......کون ہو؟''

سونیا حیرت سے انجان ہو کر بولی۔'' خالد کیا بات ہے تم اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہو خیریت تو ہے ارے حویلی سے خوفزدہ تو نہیں ہو گئے۔''

میں نے بھاگ جانے والے انداز میں اس سے کہا۔'' تم میری سونیا نہیں ہو۔ تمہارے پاؤں الٹے کیوں ہیں؟''

سونیا کو معلوم ہو گیا کہ میں اس کی اصلیت جان گیا ہوں تو فوراً ہی اس کی شکل بگڑنے لگی بالوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے سانپ نمودار ہونے لگے آنکھیں جلتے ہوئے انگاروں کی مانند بالکل سرخ ہو گئیں ناک اور منہ سے بچھو اور دیگر خوفناک حشرات نکلنے لگے جسم گلنے سڑنے لگا۔ چہرہ ایک جانب سے پگھل کر نیچے لڑھکنے لگا اور جبڑے کی ہڈیاں واضح نظر آنے لگیں۔

خوف اور دہشت کی وجہ سے میں اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا مگر تیزی سے دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا پھر اٹھ کر دروازہ ڈھونڈنے لگا مگر حیرت انگیز طور پر کمرے میں کوئی دروازہ نہ تھا یعنی یہ کمرہ اب چاروں طرف سے مکمل طور پر سیل ہو چکا تھا چاروں طرف صرف دیواریں ہی نظر آ رہی تھیں اور سونیا کے روپ میں وہ بدروح اب مکمل طور پر چڑیل بن چکی تھی جو ہر حال میں مجھے ختم کرنا چاہتی تھی۔

پھر خوفناک اور نفرت بھرے انداز سے بولی۔

''اور انسپکٹر صرف تیری وجہ سے مجھے میرے شکار کی تلاش میں کافی دنوں سے شدید مشکلات کا سامنا ہے پہلے تو میں کسی نہ کسی طریقے سے اپنا شکار حویلی تک لے ہی آتی تھی مگر جب سے تو اس گاؤں میں آیا ہے تیری اوچھی حرکات اور پہرے وغیرہ سے مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ تجھے تو میں جلد ہی ختم کر دیتی مگر میری تمام کوششیں رائیگاں جا رہی تھیں تبھی میں نے تیری محبوبہ کا روپ دھار کر تجھے یہاں بلایا مگر یاد رکھ، اب تو بھی یہاں سے زندہ نہ جا سکے گا۔''

اس کی خوفناک نظروں میں میرے لئے انتہا کی نفرت جھلک رہی تھی اور مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی اسی لمحے وہ منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی اور کمرہ زبردست زلزلے کی مانند زور زور سے ہلنے لگا کمرے میں موجود چیزیں اڑنے لگیں اس بھیانک چڑیل نے جب شیشے کے برتنوں کی جانب دیکھا تو وہ دیواروں سے ٹکرا کر ٹوٹ کر میری جانب بڑھنے لگے اور میں بری طرح زخمی ہونے لگا کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون بہنے لگا۔

بہتے خون کو دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے وہ میری جانب بڑھنے لگی خوف سے میری سانسیں بند ہو رہی تھیں مگر میرے قریب آ کر وہ چیخ مار کر دور جا گری اور نہایت نفرت بھری شیطانی آواز سے بولی۔'' او انسپکٹر تم صرف اس صورت میں اس بند کمرے سے نکل سکتے ہو اگر اپنے گلے میں موجود لاکٹ اتار دو۔'' اس کی بات سن کر میں سارا معاملہ سمجھ گیا کہ اس مبارک لاکٹ کی موجودگی میں یہ خوفناک چڑیل میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لہٰذا میں نے آیت قرآنی کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ نیز ہمت کر کے اٹھ بیٹھا اور بولا۔'' اے بدروح میں ایسے ہی چوہدری پر شک کرتا رہا مگر اصل مجرم تو تو ہے اور واقعی گاؤں والے بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ حویلی میں کوئی بدروح موجود ہے اور غور سے سن لے میں کسی صورت یہ لاکٹ نہیں اتاروں گا چاہے تو جو بھی کر لے۔'' اور میں نے اونچی آواز میں آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

وہ بدروح بری طرح سے چیخنے اور چلانے لگی اس کے جسم میں آگ لگنا شروع ہوگئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے فرش پر بیٹھنے لگی۔ پھر بولی۔ "اے اللہ کے نیک انسان آج اس مبارک لاکٹ کی وجہ سے تمہاری جان بچ گئی لہٰذا تم باہر جاسکتے ہو۔" اور واقعی اب کمرے میں دروازہ نمودار ہوچکا تھا پھر وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "مگر تمہیں قسم ہے اس ہستی کی جس کے نام کا تم نے لاکٹ پہن رکھا ہے پلیز یہاں ہونے والے واقعہ کا کسی سے ذکر مت کرنا۔"

میں فوراً بولا۔ "نہیں بلکہ آج میں تمہیں ختم کرکے ہی یہاں سے جاؤں گا کیوں کہ میرے مرشد پاک نے ہمیشہ برائیوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور وہ ہمیشہ شر کو ختم کرتے تھے۔"

وہ فوراً بلند آواز سے بولی۔ "جب تک میرا انتقام ختم نہیں ہوجاتا تم مجھے کسی صورت ختم نہیں کرسکتے اور یادرکھنا تمہارا انجام بھی انتہائی خطرناک ہوگا۔"

میں اس سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم دے کر کہتا ہوں مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور بے قصور لوگوں کو اتنی بے دردی سے کیوں ختم کررہی ہو؟"

وہ نرم لہجہ کرتی ہوئی بولی۔ "انسپکٹر اتنی بڑی ہستی کی قسم تم نے مجھے کیوں دی؟"

پھر وہ رونے لگی اس کی آواز میں انتہائی دکھ اور گہرا درد محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے دل سے غم آنسو بن کر نکل رہا تھا روتے روتے اچانک وہ خوب صورت لڑکی کے روپ میں آگئی مگر وہ روپ سونیا کا نہیں بلکہ اس کا اپنا تھا اور وہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میرے جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں میں نے بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر بیٹھنے کی کامیاب کوشش کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا پھر میں نے اس سے کہا۔ "اب بولو۔"

تو اس نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں حیران ہوگیا کہ اتنی بھیانک اور کوفناک چڑیل کی جگہ اب نہایت خوب صورت لڑکی موجود تھی۔ جسے دیکھ کر میں گہری سوچ میں پڑگیا کہ حضرت انسان کتنا بے بس ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود وہ اپنا رنگ بدلنے پر بھی قادر نہیں مگر اللہ نے اس مخلوق کو روپ بدلنے تک کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ پھر سوچا جو میرا پروردگار کرتا ہے بہت بہتر کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں ہر حال میں خدائے واحد کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے کیونکہ میں بھی ایک کامل انسان کی وجہ سے ہی آج زندہ بیٹھا ہوا تھا۔

پھر وہ دھیرے سے بولی۔ "انسپکٹر صاحب! میں نے آج تک جتنے بھی لوگوں کو قتل کیا ان سب کا ذمہ دار چوہدری ہے۔"

میں فوراً حیرت سے بولا۔ "وہ کیسے؟" کیونکہ شروع سے میں بھی اسی پر شک کررہا تھا۔ وہ گہرا اور لمبا سانس لے کر بولی۔

"میرا نام رضیہ تھا میرے گھر والے پیار سے مجھے رجو کہہ کر پکارتے تھے ہم لوگ ساتھ والے گاؤں میں رہائش پذیر تھے ہم لوگ بہت عزت دار اور خوشحال زندگی بسر کررہے تھے ہم سب چچا تایا وغیرہ کے ہمراہ اکٹھے ہی رہتے تھے گھریلو اختلافات کے باوجود ہم سب ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔ غرضیکہ زندگی جنت کی مانند گزر رہی تھی۔

ایک شام میں کسی ضروری کام کی وجہ سے گھر سے باہر نہر کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گاڑی سے دو اہلکار نکلے اور مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔ انہوں نے میرے ناک پر کوئی کپڑا رکھا جس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا اور میں مزاحمت کرنے سے محروم رہی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اسی کمرے میں پایا۔ جہاں ہم موجود ہیں رات کافی بیت چکی تھی ابھی مجھے ہوش آئے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ تین آدمیوں سمیت چوہدری کمرے میں داخل ہوا اور آتے

ہی شیطانی انداز سے بولا۔ ”رجو کیسی ہو میری جان تمہارے حسن نے تو مجھے پاگل ہی کر دیا۔ تمہیں تو میں نے کئی بار سمجھایا تھا کہ میری بانہوں میں آ جاؤ، مالا مال کردوں گا مگر تم مجھے ہمیشہ نظر انداز کر دیتی تھی۔

مگر آج تو میں پوری رات اپنی پیاس بجھاؤں گا ارے دل تو کرتا ہے کھا ہی جاؤں تمہیں۔“ چوہدری کے خوفناک ارادے کو دیکھ کر میں نے روتے ہوئے اس کی منت سماجت شروع کر دی مگر اسے مجھ پر کوئی ترس نہ آیا اور اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے مجھے بیڈ کے اوپر باندھ دیا اور میرے کپڑے اتارنے لگا۔

میں نے غصے سے اسے کہا۔ ”تو بہت بڑا مکار اور منافق ہے گاؤں والوں کے سامنے بڑا نیک اور معزز بنا پھرتا ہے یہ بھی نہیں سوچتا کہ تیری میرے جیسی ایک جوان بیٹی ہے تو شیطان ہے لعنت ہے تم پر۔ یہاں سے باہر جا کر میں سب کو تیری اصلیت بتاؤں گی ڈرتی نہیں میں تجھ سے۔“

اور غصے سے پاگل ہو کر اس کے منہ پر تھوک دیا اور چوہدری نے مجھے تھپڑ رسید کرنا اور گالیاں دینا شروع کر دیں اور میں نجانے کیا کیا خطاب اسے دیتی رہی مگر وہ غصے سے پاگلوں کی طرح میرے جسم کو نوچنے لگا جیسے بھوکا کتا کھانے پر ٹوٹتا ہے۔ بے غیرت نے دل بھر کر اپنی ہوس پوری کی اور پھر باقی تینوں کتوں کو مجھ پر چھوڑ کر براہ راست گھناؤنا منظر دیکھتا رہا اور شراب پیتا رہا۔

جب سب کتوں نے اپنی ہوس پوری کر لی تو ایک کتا بولا۔ ”چوہدری صاحب اس کا زندہ رہنا اب ہمارے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے اس لئے اسے......“ چوہدری نے بات کاٹتے ہوئے کہا مار ڈالو اس کتیا کو اور اسی بیڈ کے نیچے گڑھا کھود کر دفن کر دو اور اوپر بیڈ رکھ دو پوری زندگی کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوگی سالی مجھ پر یعنی چوہدری رفاقت پر تھوکتی ہے۔“

پھر مجھے بے دردی سے قتل کر کے اسی بیڈ کے نیچے دفن کر دیا گیا اتفاق سے وہ رات اماوس کی رات تھی اور اسی نسبت سے شیطان اس رات حویلی میں کسی خاص عمل اور مقصد کی وجہ سے موجود تھا جس نے کسی خاص عمل کی وجہ سے میری روح پر قبضہ کر لیا۔

اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”تمہیں بدلہ لینا ہے ان تمام حرام زادوں سے جنہوں نے تمہیں مکمل طور پر برباد کر دیا مگر یاد رکھنا تم اس حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکو گی البتہ میں اپنی شکتیوں سے تمہیں ایک خاص شکتی دیتا ہوں وہ یہ کہ تم کسی بھی عورت کا روپ دھار سکو گی اور ٹوٹ پڑو اپنے دشمنوں پر۔“ تب میں نے ان تمام لوگوں کو ختم کرنے کا ارادہ کیا جو ہر کسی کی عزت سے کھیلنا اپنا مشغلہ سمجھتے ہیں۔

میں روزانہ سوچ سوچ کر روتی تھی کہ میرے والدین اور خاص طور پر میرے اکلوتے بھائی کا میری عدم موجودگی میں کیا حال ہوگا لوگ تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ شاید میں کسی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہوں۔ گاؤں والوں نے میرے متعلق طرح طرح کی باتیں کر کے میرے گھر والوں کی زندگی اجیرن بنا دی ہوگی۔

ہائے! میرے گھر والے۔ پھر میں نے باقاعدہ اپنے کام کا آغاز کیا۔

اور پھر سب سے پہلے میں نے اپنی خاص شکتی سے ان تینوں کتوں کو حویلی میں بہت خوب صورت لڑکی کے روپ میں بلایا اور وہ بے غیرت ہوس کے مارے یہ بھی بھول گئے کہ انہوں نے یہاں کسی بے گناہ کو بے دردی اور سفاکی سے قتل کر کے دفن کیا ہوا ہے لہٰذا میں باری باری ان ہوس کے ماروں کو قتل کر کے حویلی کے تالاب میں پھینک دیتی تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس اور بے چینی دیکھ کر مجھے تسکین ملے۔

میں نے بہت کوشش کی کسی طرح چوہدری رات کے وقت حویلی میں آ جائے مگر وہ بے حد ہوشیار ثابت ہوا اسے کسی خاص عامل کی وجہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ گاؤں میں ہونے والے واقعات میں کسی بدروح کا کام ہے اور وہ صرف رات کے وقت ہی کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے اس لئے وہ کسی صورت حویلی میں نہ آسکا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

میں جلد ہی ہوس کے مارے لوگوں کو ٹھکانے لگانے لگی، لوگوں کو ورغلانے کے لئے روپ بدلنے والا ہتھیار میرے بہت کام آیا کبھی میں کسی خوب صورت لڑکی کا روپ دھار لیتی اور کبھی ان کی محبوبہ بن جاتی جس کی وجہ سے شکار آسانی سے میرے چنگل میں پھنس جاتا اور پھر دھیرے دھیرے یہ بے غیرت لوگ اپنے انجام کو پہنچ جاتے اور شکار کا خون شیطان پیتا اور اور مجھے مزید شکتیاں دیتا۔“

باتیں کرتے کرتے وہ خاموش ہوگئی اور اپنے والدین کو یاد کرکے رونے لگی اور میں سوچنے لگا۔

حیرت ہے ایسے لوگوں پر جو اللہ کی عائد کردہ حد سے تجاوز کرتے ہیں اور صرف چند لمحوں کی لذت کی خاطر اپنی زندگی گنوا دیتے ہیں نیز یہ کہ زنا کی اتنی خطرناک اور بھیانک سزا ان کو دنیا میں ہی مل گئی تو آخرت میں ان کا کیا بنے گا اور اپنے مالک وخالق سے دعا کرنے لگا کہ یا اللہ تمام مسلمانوں کو مجھ سمیت زنا جیسے گناہ عظیم سے بچا اور مرنے والوں کے گناہ معاف فرما کر جنت الفردوس میں ان کو جگہ عطا فرما۔

پھر رجو بولی۔”کہاں کھو گئے انسپکٹر صاحب!“

”میرے بولنے سے پہلے ہی وہ بولی۔”آپ بھی میرے ہاتھوں سے مارے جاتے مگر آپ کو مبارک لاکٹ نے بچالیا۔“

میں نے کہا۔”بچانے والی تو صرف اللہ کی ذات ہے۔اب تم لوگوں کو قتل کرنا چھوڑ دو کیونکہ کسی کو ورغلا کر قتل کرنا اسلام میں جائز نہیں اور ویسے بھی تم تینوں دشمنوں کو ختم کر چکی ہو اور رہی بات چوہدری کی تو مجھے اس پر پہلے دن سے ہی شک تھا اسے اب قانون بہت سخت سزا دے گا۔“ رجو فوراً غصے سے پھنکارتی ہوئی بولی۔

”نہیں وہ میرا شکار ہے صرف میرا اسے بس میں ہی ختم کروں گی تم کسی بہانے رات کو اسے یہاں لے آؤ۔“

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ قانون اسے عبرت ناک سزا دے گا تم مجھ پر اعتماد کرسکتی ہو مگر اس نے کہا۔”میری روح کو چین صرف اسی وقت آئے گا جب میں خود اپنے ہاتھوں سے اس خبیث چوہدری کو قتل کردوں گی۔“

اسی لمحے میرے دل میں ایک بات آئی میں نے رجو سے پوچھا۔”اگر تم چوہدری کو ختم کر ڈالو تو کیا پھر بھی قتل وغارت کا سلسلہ جاری رکھوگی؟“

رجو گہرا سانس لے کر بولی۔”ہاں کیونکہ جب تک ہوس پرست شیطانوں کا اس گاؤں سے خاتمہ نہیں ہوجاتا میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔“

میں نے پھر اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واسطہ دیتے ہوئے کہا۔”اب تم کسی کو قتل نہیں کروگی۔“

وہ بولی۔”ایک تو آپ مجھے اتنی مبارک ہستی کا واسطہ دیتے ہو تو میں مجبور ہوجاتی ہوں او کے مجھے منظور ہے اب میں چوہدری کے علاوہ کسی اور کو قتل نہیں کروں گی مگر آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

میں فوراً تجسس سے بولا۔”ہاں بولو۔“

رجو بولی۔”میں مسلمان ہوں اس کمرے میں بیڈ کے نیچے میری بے گور وکفن لاش موجود ہے جسے اسلامی رسومات کے مطابق دفن نہیں کیا گیا لہٰذا جب تک میری لاش کو باقاعدہ اسلامی طریقوں کے مطابق قبرستان میں دفن نہیں کیا جاتا میری روح یونہی بھٹکتی رہے گی۔“

تو میں نے رجو سے کہا۔”تم مجھے اپنا سمجھ کر مجھ پر اعتماد کرو میں اس وعدے کو ضرور پورا کروں گا۔ مگر تمہیں بھی میری بات ماننا ہوگی۔“ میری بات سن کر بلند آواز سے رونے لگی۔”جی میں ہر بات مانوں گی۔“

میں نے کہا۔”تم چوہدری کے قتل سے باز رہو گی۔“ میں بحیثیت بھائی اپنی بہن کے مجرم کو عبرتناک سزا دلواؤں گا کیونکہ کوئی بھی غیرت مند بھائی اپنی معصوم بہن کی عزت لوٹنے والے کو نہیں بخشے گا۔“

وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور میں نے موقع کی مناسبت سے اخلاقی اور دینی دلائل سے اسے قائل

کرنے کی کامیاب کوشش کی آخر وہ مان گئی۔ اور میں اسے حوصلہ دیتے ہوئے حویلی سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اذان فجر شروع ہوگئی میں نے مسجد میں با جماعت نماز ادا کی پھر ناشتہ کرکے تھانے پہنچ گیا کچھ ضروری کام نمٹانے کے بعد میں نے چوہدری کو تھانے بلایا اور وہ آتے ہی بولا۔ ''انسپکٹر صاحب خیریت تو ہے آج سویرے سویرے مجھے تھانے بلالیا۔''

میں نے چوہدری سے کہا۔ ''مبارک ہو جناب قاتل کا سراغ مل گیا ہے۔''

چوہدری کے چہرے سے حیرت اور مصنوعی خوشی واضح محسوس ہورہی تھی۔

پھر چوہدری بولا۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے قاتل کو ہر حال میں عبرتناک سزا ملنی چاہئے۔ جس نے کتنے ہی گھرانے اجاڑ دیئے۔''

میں فوراً بولا۔ ''ضرور ملے گی!''

میں نے دھیرے سے چوہدری سے کہا۔ ''جناب مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان تمام واقعات کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔''

اور پھر وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ ''انسپکٹر صاحب وہ کیسے؟'' میں طنز اور پیار سے بولا۔ ''جناب رجو کو تو جانتے ہی ہوں گے۔''

چوہدری یہ بات سن کر چونک اٹھا اس کی یہ حالت اس کے گناہ کی تصدیق کے لئے کافی تھی اس کی تو جیسے زبان ہی بند ہوگئی۔

''م......م...... میں نہیں جانتا کسی رجو کو تم کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر؟''

پھر رات ہونے والا سارا واقعہ میں نے چوہدری کو سنایا اس نے میری بات نہ صرف ماننے سے انکار کردیا بلکہ الٹا مجھے دھمکیاں دینے لگا کہ تم مجھے جانتے نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرسکتا ہوں تمہاری بچت اسی صورت میں ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو اور اصل قاتل کو بمعہ ثبوت پکڑو یہ ڈرامے بازیاں بند کرو۔''

اور غصے سے دھمکیاں دیتا ہوا تھانے سے نکل گیا۔

ہیڈ آفس رابطہ کرنے سے پہلے میں چوہدری سے ایک ملاقات کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ پھر چوہدری سے ملاقات کرنے کے بعد میں نے مکمل رپورٹ ہیڈ آفس پہنچادی اور مزید نفری طلب کی تاکہ بھرپور اور فیصلہ کن کارروائی کرنے میں مزید آسانی ہو۔

میں نے گاؤں سے بزرگ لوگوں کو اکٹھا کرکے ان کو آگاہ کیا کہ کس طرح چوہدری نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کی عزت لوٹ کر اسے قتل کرکے حویلی میں موجود ہمیشہ بند رہنے والے کمرے میں دفن کردیا تھا اب اسی لڑکی کی بے چین روح گاؤں والوں سے بھیانک انتقام لے رہی ہے۔ مگر ان کی آنکھوں پر چوہدری کے اعتماد کی پٹی بندھی ہوئی تھی وہ الٹا مجھے برا بھلا کہنے لگے کہ ''انسپکٹر صاحب کچھ شک نہیں کہ آپ ایک اچھے اور بہادر پولیس آفیسر ہیں مگر ایک نہایت اچھے اور معزز انسان پر الزام لگانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔''

لیکن میں نے سخت لہجے میں ایک بار پھر چوہدری سے درخواست کی کہ مجھے حویلی کا بند کمرہ کھولنے کی اجازت دے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا پھر میں نے اپنے سینئرز سے رابطہ کرکے ان سے اس بند کمرے کو کھلوانے کے لئے خصوصی درخواست کی اور ساتھ ہی رجو کے گھر والوں کو اطلاع بھی کردی جسے سن کر رجو کی پوری بستی ہی تھانے میں پہنچ گئی۔

سب لوگ جمع ہوچکے تھے کچھ جوشیلے نوجوان بھی پریت نگر سے ہمارے ساتھ مل گئے، نوبت خطرناک لڑائی تک پہنچ چکی تھی پولیس کی تازہ نفری بھی آچکی تھی اب چوہدری کے پاس صرف دو ہی راستے تھے یا تو بند کمرہ کھولنے دیتا یا اپنا گھناؤنا جرم قبول کرلیتا۔

آخر قانون کی سختی اور کچھ پورے علاقے کے مسلسل اصرار بالخصوص چوہدری کی اکلوتی بیٹی سونیا کی ضد پر چوہدری حویلی میں موجود کمرہ کھولنے پر آمادہ ہو ہی گیا جلد ہی ہم سب حویلی کے اندر موجود تھے۔ ایک بہت بڑا ہجوم حویلی کے اردگرد اور اندر موجود تھا ان سب

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہر حال میں قاتل کو پکڑ کر اسے عبرتناک سزا دی جائے۔

بڑی مشکل سے دروازہ کھولا گیا دروازہ کھلتے ہی اندر سے بدبو کے بھبھوکے اڑنے لگے کمرہ اندر سے انتہائی بوسیدہ اور غلیظ نظر آ رہا تھا حالانکہ جب میں رجو سے ملا تھا تب یہ انتہائی خوب صورت نظر آ رہا تھا پھر میں جلد ہی سمجھ گیا کہ رجو نے اپنے شکار پھانسنے کے لئے اس کمرے کو مصنوعی آراستہ کیا ہوگا۔ پھر رجو کی بتائی ہوئی جگہ سے لاش نکال لی گئی جو حیرت انگیز طور پر بالکل سلامت اور تازہ محسوس ہو رہی تھی اور لاش نکلتے ہی کمرے میں موجود بدبو انتہائی خوب صورت خوشبو میں تبدیل ہوگئی جسے ہر سمجھ دار آدمی نے واضح محسوس کیا شاید یہ رجو کی بے گناہی ثابت کرنے کا ذریعہ تھی۔

میں نے چوہدری کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”جی چوہدری صاحب اب آپ کیا کہتے ہیں۔“

تو وہ فوراً ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں مجھے لگتا ہے یہ میرے کسی دشمن کی چال ہے اور انسپکٹر تم بھی اس سے ملے ہوئے ہوتا کہ مجھے پھنسایا جاسکے۔“ اور لوگوں سے متوجہ ہو کر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے جھوٹی قسمیں کھانے لگا۔

اسی وقت کمرے سے ایک سیاہ دھواں بلند ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سفید ہیولہ نظر آنے لگا سارے ہجوم کی سسپنس سے بھرپور نظریں اس ہیولے پر مرکوز تھیں۔

پھر اس ہیولے سے رجو کی آواز بلند ہوئی جو چوہدری سے مخاطب ہوئی۔ ”اوئے خبیث چوہدری اپنے گناہ کا اقرار فوراً سب کے سامنے کرو ورنہ ابھی تجھے جہنم رسید کرتی ہوں۔“

آواز میں تختی، نفرت، غصہ اور رعب شامل تھا۔

خلاف توقع چوہدری نے اب بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کردیا دراصل وہ ہر حال میں اپنا بھرم سب کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس ہیولے نے چوہدری کو وہاں سے اٹھانا شروع کردیا اور کافی بلندی پر لے گیا اور چوہدری گھبرا کر چیخیں مارنے لگا تب رجو نے چوہدری کو آخری بار خبردار کیا کہ اپنے جرم کا اعتراف کرو ورنہ ابھی چھوڑ دوں گی تو اس بار چوہدری فوراً سب کے سامنے اونچی آواز میں بولا۔

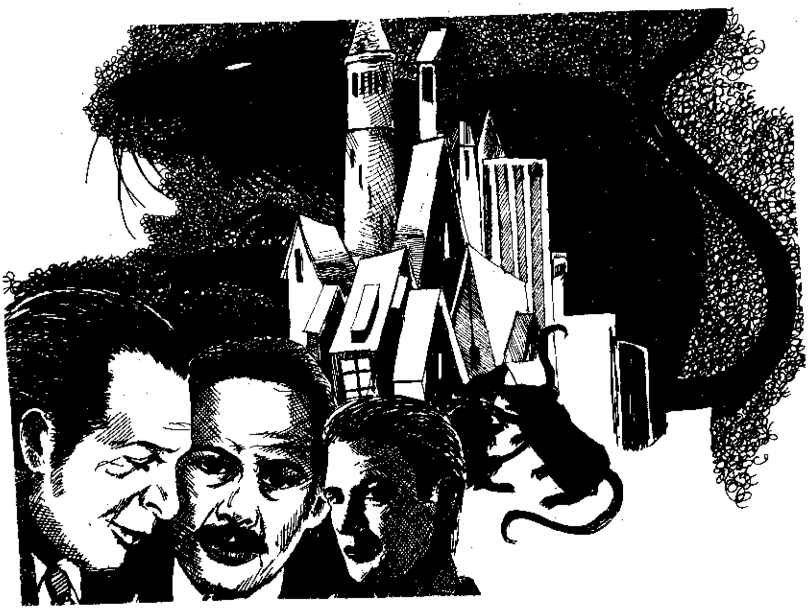
”ہاں میں اپنے گھناؤنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ہی رجو کی عزت لوٹ کر اسے قتل کروا ڈالا تھا۔“ اور رجو کے قہقہوں کی آوازیں فضا میں بلند ہونے لگیں جن میں خوشی اور غمی دونوں کا یکساں اظہار محسوس ہو رہا تھا۔

پھر رجو نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے چوہدری کو تالاب کے قریب زمین پر رکھ دیا اور کہا۔ ”بھائی خالد اب آپ خود اسے سزا دلوایئے اور میری لاش کو غسل دے کر باقاعدہ نماز جنازہ پڑھ کر اسلامی رسومات کے عین مطابق قبرستان میں دفن کردیں تاکہ میری روح کو حقیقی خوشی میسر ہو۔“

پھر میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ”چوہدری کو گرفتار کرلو۔“ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی کانسٹیبل آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ حویلی میں موجود ایک بہت بڑے اور پرانے درخت سے ایک سیاہ سانپ بالکل چوہدری کے اوپر گرا اور چوہدری کو تین چار بار مختلف جگہوں سے ڈس لیا اور چوہدری چند ہی لمحوں میں تڑپ تڑپ کر لقمہ اجل بن گیا اور اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

پھر ہم سب نے مل کر رجو کی میت کو اس کی تمام خواہشات کے مطابق قبرستان میں دفن کیا اتفاق سے دونوں یعنی رجو اور چوہدری کی قبریں بالکل ساتھ ساتھ بنیں۔ فاتحہ پڑھتے وقت مجھے آسمان کی جانب سفید اور پرنور دھوئیں سے رجو انتہائی خوش ہو کر الوداع کہہ رہی تھی اور تھوڑی دیر میں وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آسیبی گھر

مریم فاطمہ۔ کراچی

خوبرو لڑکی آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا اور جب باہر دیکھا تو ایک کالی بلی اپنی غضب ناک نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی کہ پھر اچانک بلی اپنی جگہ سے غائب ہوگئی۔

دل پر سکتہ طاری کرتی اور خوف کے شکنجے میں جکڑتی عقل میں نہ آنے والی ڈراؤنی کہانی

"**چلو** بچو! باہر نکلو ہمارا نیا گھر آ گیا۔" مسٹر جیمز نے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر سے پیچھے جوہانا اور میٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جوہانا سترہ سالہ خوب صورت سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ جبکہ دوسری طرف میٹ ان کا گھرے بھورے بالوں اور سبز آنکھوں والا اٹھارہ سال کا بیٹا تھا۔ یہ تین لوگوں کی فیملی تھی۔ ان کی والدہ دو برس پہلے انتقال کرگئی تھیں۔

اپنی بیوی کے مرنے کے بعد مسٹر جیمز کا اپنے گاؤں والے گھر میں دل نہ لگا اور وہ اس گھر کو بیچ کر شہر میں یہ نیا گھر خرید بیٹھے۔

یہ گھر خاصا پرانا تھا۔ اور مسٹر جیمز نے بچوں کو یہاں لانے سے پہلے ہی اس گھر کی حالت کے بارے میں آگاہ کردیا تھا۔ لیکن وہ گھر ان دونوں کی توقع سے بھی بڑھ کر کہیں زیادہ بوسیدہ حالت میں نکلا۔ سامنے

www.urdusoftbooks.com

لان میں ایک بہت بڑا درخت تھا۔ جس پر کسی مخصوص قسم کے بیر لگے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میٹ بہت خوش ہوا۔ اب تینوں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آ چکے تھے۔

''واہ! کمال ہوگیا۔ ہمارا خود کا اپنا لان۔'' میٹ نے کہا۔

''مجھے تو یہاں ڈر محسوس ہو رہا ہے۔'' جوہانا نے خود میں سمٹتے ہوئے کہا۔

''ڈرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ گھر بس تھوڑا پرانا ہے۔ اس لئے تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔ تھوڑی سی محنت سے ہم اسے بالکل نئے جیسا بنا دیں گے۔'' مسٹر جیمز نے کہا۔ اور پھر وہ گاڑی میں سے سامان نکالنے لگے۔

جوہانا کو نا معلوم کیوں اس گھر سے خوف آ رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھی۔ اور گھر کو بغور جانچنے لگی۔ ''تمہیں پسند آئے گا۔ ویسے بھی یاد کرو تم اکثر کہا کرتی تھی کہ گاؤں کی زندگی بہت ہی بور کر دینے والی ہوتی ہے۔'' میٹ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی گھر میں سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تو تینوں ہی چونک پڑے۔

''اوہ میرے خدا وہ کیا تھا ڈیڈ۔'' جوہانا نے گھبرا کر پوچھا۔

مسٹر جیمز اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے آگے آئے۔ تب ہی کھڑکی کھلی اور ایک شریر سا نظر آنے والا بچہ باہر نکل کر بھاگا۔ مسٹر جیمز ہنس دیئے۔

''مجھے تو لگا کہ کوئی بھوت ہے۔'' جوہانا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو جوہانا تمہارے نئے گھر کا بھوت۔'' مسٹر جیمز نے اس بھاگتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میٹ ہنس دیا۔ پھر یہ لوگ باری باری کر کے سامان اندر لے کر جانے لگے۔

سارا دن انہیں کام کرنے میں لگ گیا۔ اور اس رات وہ لوگ جلدی ہی سونے کے لئے لیٹ گئے۔

لیکن جوہانا کو دور دور تک نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پہ لیٹی کمرے کی چیزوں کو گھور رہی تھی۔ ہر چیز اسے گھورتی محسوس ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ بستر سے اٹھی اور میز پر سے دوربین اٹھا کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ سامنے والا گھر خالی پڑا تھا۔ مسٹر جیمز نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا جبکہ اچانک ہی جوہانا کو لگا کہ سامنے کھڑکی میں کوئی ہے۔ لیکن اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہیولہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ اب سوائے تاریکی اور اندھیرے کے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جوہانا سوچ میں پڑ گئی کہ آخر وہاں کیا تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ دیکھنے بھی پہنچ جاتی لیکن اس وقت رات ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس نے دوربین واپس اپنی جگہ رکھی اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے روز گھر کے تینوں فرد صبح ہی صبح بیدار ہو گئے۔ جوہانا کو کل رات والا واقعہ یاد تھا۔ لیکن اس نے ناشتے کی میز پر کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مسٹر جیمز کچھ ضروری سامان وغیرہ لینے بازار چلے گئے۔ میٹ گھر پر بور ہو رہا تھا۔ سو وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

جوہانا کو لگا کہ یہ اچھا موقع ہے، اس بات کا پتہ چلانے کا کہ کل رات باہر کون تھا۔ یہ جاننے کے لئے اس نے سوئٹر اور مفلر ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکلی وہ سیدھی چلتی ہوئی اس گھر کے سامنے رک گئی۔ تب ہی اچانک اس گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ جوہانا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بچے نے شرماتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''ہنری۔'' اس بچے نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم اندر کیا کر رہے تھے۔ یہ گھر تو بند ہے۔''

''میں یہاں کھیلنے آتا ہوں۔'' ہنری نے کہا اور ایک طرف بھاگ گیا۔

جوہانا کو وہ بچہ کچھ عجیب سا لگا۔ وہ واپس اپنے گھر آ گئی۔ لیکن اسے مسلسل کسی کی موجودگی کا احساس

ہو رہا تھا۔ یہ بات اسے ڈرائے دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ بری طرح چونک پڑی اس نے پاس میں پڑا میٹ کا Bat اٹھایا اور ہمت کر کے آگے بڑھی۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور مسٹر جیمز کے ہمراہ میٹ اندر داخل ہوا۔ "او مائی گاڈ یہ تو آپ دونوں ہیں۔" جوہانا ہانپتے ہوئے بولی۔ "کیوں تمہیں کیا لگا تھا؟" مسٹر جیمز نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے لگا کہ کوئی......" اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تمہیں ضرور لگا ہوگا کہ چور یا ڈاکو گھس آئے ہیں۔ مسٹر جیمز کی بات پر وہ بس گردن ہلا کر رہ گئی۔ انہیں یہ تو بتا نہیں سکتی تھی کہ اسے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی بھوت ہے۔ دوپہر کو کھانے میں ان لوگوں نے سینڈوچز کھائے۔

☆......☆......☆

اس رات بڑے زوروں کی بارش ہوئی۔ کالے سیاہ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ ایسے میں جوہانا اپنے کمرے میں بستر میں لیٹی آرام کر رہی تھی کہ تب ہی اسے لگا کہ کوئی کمرے کا دروازہ کھرچ رہا ہے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ وہ تو پہلے ہی اس گھر سے ڈری ہوئی تھی۔ لیکن ہمت کر کے اٹھی اور دروازہ کھول دیا، اب جو سامنے دیکھا تو ایک کالے رنگ کی بلی دروازہ کھرچ رہی تھی۔ جوہانا نے اسے دیکھ کر ہلکی سی چیخ ماری۔ اور بلی ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ دوسری طرف چلی گئی۔ جوہانا جلدی سے آگے بڑھی اور میٹ کے کمرے میں گھس آئی۔ "میٹ لگتا ہے پڑوسیوں کی بلی ہمارے گھر میں گھس آئی ہے۔"

"پڑوسیوں کی بلی؟" میٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں پڑوسیوں کی بلی۔" جوہانا نے کہا اور میٹ کو ساتھ لے کر پورا گھر چھان مارا لیکن وہ بلی پھر دوبارہ کہیں دکھائی نہ دی تو میٹ نے اسے اس کا وہم

قرار دیا۔لیکن جوہانا بضد تھی۔

پھر کچھ خیال آتے ہی وہ بولی۔ "آؤ تمہیں دکھاتی ہوں بلی کے پنجے کے نشانات، اس نے اپنے پنجوں سے دروازے کو کھرچا ہے۔" لیکن اب جو میٹ نے وہاں دیکھا تو کوئی نشان نہ تھا۔ "یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا۔" میٹ نے بے زار لہجے میں کہا۔ "میں تو سونے جارہا ہوں۔" وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔اور جوہانا اچنبھے میں پڑ گئی۔

وہ رات اسے وقفے وقفے سے بلی کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ خوف سے سہمی ہوئی بستر میں دبکی رہی۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دیکھتی کہ کیا وہ بلی واپس آگئی ہے۔ اس نے سوچا کہ میٹ سے کل صبح پوچھے گی کہ اس نے بعد میں کسی بلی کے بولنے کی آواز سنی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد میٹ لان میں لگے بیر کے درخت پر سے بیر توڑ رہا تھا کہ جوہانا اس کے پاس چلی آئی۔ "میٹ کیا تم نے رات کو کسی بلی کی آواز سنی۔"

"پھر وہی بکواس۔ ارے نہیں سنی یار۔تم ایک کام کرو کہ ایک چکر لائبریری کا لگا آؤ۔ تھوڑا دل بہل جائے گا ورنہ گھر بیٹھے بیٹھے تم بھوت پریت کی باتیں سوچتی رہو گی۔"

جوہانا نے کچھ سوچ کر اثبات میں سرہلا دیا۔اور لائبریری کی طرف چل دی۔ لائبریری میں اس نے گھوسٹ انسائیکلو پیڈیا پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ ایسی چیزوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنا چاہتی تھی، پھر لائبریری سے واپس آکر وہ سیدھی میٹ کے کمرے میں چلی آئی۔ "میٹ تم جانتے ہو میں نے لائبریری میں بھوتوں اور چڑیلوں کے بارے میں کتاب پڑھی ہے۔اور پتا ہے مجھے کیا معلوم ہوا۔"

"اوہ تم وہاں بھی یہ فضول مسئلے کے پیچھے رہی۔"

میٹ بے زاری سے بولا۔ "تم واقعی پاگل ہوگئی ہو۔"

"میٹ یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔ میں نے پڑھا کہ جو گھر زیادہ عرصے تک کے لئے خالی رہتا ہے وہاں بھوت پریت حکومت کرنے لگتے ہیں اور وہ بلی کی شکل میں ظاہر ہوسکتے ہیں اور کل رات میں نے بلی ہی دیکھی تھی۔"

"لیکن میں نے نہیں دیکھی تھی ذرا اپنی عقل استعمال کرو جوہانا اگر یہاں بھوت یا چڑیلیں ہوتیں تو وہ صرف تمہیں ہی کیوں تنگ کررہی ہیں۔ مجھے اور ڈیڈ کو تو ابھی تک انہوں نے کچھ نہیں کہا۔بس چپ ہوجاؤ اور میری بات سنو! ابھی جب تم گئی ہوئی تھیں تو تمہارے پیچھے ساتھ والے گھر سے ایک لڑکی آئی تھی لنڈزی نام ہے اس کا میری اور اس کی بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔ بہت جلد ہم دونوں باہر کہیں گھومنے پھرنے جائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی اپنے لئے بوائے فرینڈ ڈھونڈ لو۔"

"اوہ میں تو جارہی ہوں۔تم نے میری بات کا یقین نہیں کرنا تو نہ کرو۔"

"ہاں ہاں جاؤ تمہاری اس بے کار کی بات کا تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔" میٹ نے پیچھے سے آواز لگائی۔

اگلے روز شام کے وقت لنڈزی میٹ سے ملنے آئی۔ میٹ نے جوہانا کی بھی اس سے ملاقات کروائی۔ لنڈزی دیکھنے میں تو بڑی خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی لیکن نامعلوم کیوں جوہانا کو وہ بھی کچھ پراسرار لگی، اس نے میٹ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دل میں پریشان ہوتی رہی۔

جوہانا اس رات اپنے کمرے میں لیٹی سو رہی تھی کہ بلی کے میاؤں میاؤں کرنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چپل پہنی اور بستر سے اٹھ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب پہنچی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر دیکھا تو وہی کالی بلی راہداری میں چلتی ہوئی جارہی تھی۔ اور ویسے ڈرنے جیسی کوئی بات نہیں تھی لیکن جس بات سے جوہانا ڈر گئی وہ یہ تھی کہ

بلی جیسے ہی زمین پر پاؤں رکھتی تو کسی انسان کے قدم رکھنے جیسی آواز پیدا ہوتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلی ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

جوہانا آنکھیں جھپکنے لگی۔ وہ حیران تھی کہ ابھی تو وہ بلی وہیں تھی پھر اچانک کیسے غائب ہوگئی۔

اور پھر تو یہ سلسلہ روز کا چل نکلا روزانہ اسے بلی چلتی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر ہوا میں تحلیل ہوجاتی۔ اس روز بھی رات کے پہر جب سب سو رہے تھے تو جوہانا کو کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آواز راہداری میں سے آرہی تھی۔ جوہانا اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا لیکن آج وہاں کوئی بلی نہ تھی۔

بلکہ کوئی لڑکی راہداری میں چلتی چلی جارہی تھی۔

جوہانا کا سارا خون خشک ہوگیا وہ ڈر کے مارے واپس کمرے میں آگئی اور دروازہ اچھی طرح بند کرلیا۔ وہ رات اس نے جاگتے ہوئے گزاری۔

اگلے روز رات کے وقت پھر اسے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ آج وہ یہ معمہ حل کرکے ہی رہے گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر جھانکا باہر وہی لڑکی اسے راہداری میں چلتی نظر آئی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے گلے میں سلور کا لاکٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں چمک رہا تھا۔

اچانک ہی جوہانا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ ایسا ہی لاکٹ تو لنڈزی نے بھی پہنا ہوا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔

جوہانا جلدی سے واپس کمرے میں آئی اور جلدی جلدی لنڈزی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ تین چار بار گھنٹی بجنے کے بعد لنڈزی نے فون اٹھالیا۔ ''ہیلو۔ ہیلو لنڈزی میں جوہانا بات کررہی ہوں۔''

''ہیلو جوہانا کیسی ہو۔ خیریت اتنی رات کو کیسے فون کرلیا۔''

''وہ دراصل تم نے کہا تھا کہ تم گھر پہنچ کر فون کروگی تو تم نے فون نہیں کیا تو میں نے خود کرلیا۔''

جوہانا نے جھوٹ بولا۔ اتنی رات گئے فون کرنے کا اسے یہی بہانہ سمجھ میں آیا۔ اسے اصل بات تو بتا نہیں سکتی تھی۔ ''اچھا؟ میں نے ایسا کہا۔''

''کمال ہے مجھے تو یاد نہیں۔'' ابھی وہ مزید کچھ بات کرتیں کہ پیچھے سے جوہانا کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ جوہانا کی چیخ نکل گئی اس نے گھوم کر دیکھا تو سامنے وہی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں سلور کا لاکٹ چمک رہا تھا لیکن اس کی شکل بالکل بھی لنڈزی جیسی نہیں تھی۔

فون جوہانا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرگیا۔

وہ لڑکی سپاٹ چہرہ لئے جوہانا کو ہی گھور رہی تھی۔ جوہانا نے سوچا کہ اس سے جان بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ یہاں سے بھاگا جائے اس نے اپنی پوری قوت جمع کی اور وہاں سے بھاگنے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ سامنے لگی تصویر میں سے دو ہاتھ باہر نکلے اور اسے بھی تصویر میں کھینچ لیا۔ اب جوہانا بھی تصویر کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

جوہانا کی چیخ و پکار سن کر میٹ اور مسٹر جیمز کمرے سے باہر نکل آئے۔ میٹ آگے آگے تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں پہنچا۔ اسی تصویر میں سے دونوں ہاتھ باہر آئے اور اسے بھی اندر کھینچ لیا۔ دروازے پر کھڑے مسٹر جیمز نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اپنا ذہنی توازن ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے۔

اس گھر کے آسیب نے جوہانا اور میٹ کو زندہ نگل لیا۔ اور مسٹر جیمز بھی ہمیشہ کے لئے پاگل ہوگئے۔

اس دن کے بعد سے اس گھر میں کوئی نہیں جاتا۔ عرصہ بیت گیا لیکن وہ گھر بند پڑا ہے۔

کہتے ہیں کہ وہاں جوہانا اور میٹ کی روحیں بسیرا کرتی ہیں۔ کسی میں بھی اس گھر میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔ جوہانا کا خیال درست ہی ثابت ہوا تھا۔

''اس گھر میں واقعی آسیب تھا۔''

اسرار

محمد خالد شاہان۔صادق آباد

قسط نمبر 22

نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

"تم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اگر میرا دوست میری مدد کو نہ آتا تو تم میری گردن کاٹ چکے ہوتے۔اب اپنی گردن بچاؤ۔"

اژدھا غار میں غائب ہوکر باہر جنگل میں غار کے منہ کے قریب ہی نکل آیا ناگو نے اژدھا کو پھنکار کر اپنی طرف آتے دیکھا تو منہ ہی منہ میں منتر پڑھ پڑھ کر اژدھا پر پھونکے مارنے لگا۔لیکن اس کا ایک بھی منتر کام نہیں کر رہا تھا۔کسی منتر کا اژدھا پر اثر نہیں ہو رہا تھا اژدھا اس کے قریب سے قریب آ گیا تو ناگو نے آگ میں سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر اژدھا پر ماری لکڑی کی آگ اژدھے کے قریب جاتے ہی بجھ گئی۔ناگو نے دوسرا منتر پھونکا تو ایک بہت بڑا مگرمچھ غار میں سے نکل کر اژدھا کی طرف بڑھا اور اسے دبوچنا چاہا۔مگر اژدھا بھی غافل نہیں تھا اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور ایک دم سے مگرمچھ کی گردن کے گرد اپنا سارا بدن لپیٹ کر کسنا شروع کر دیا مگرمچھ کا دم گھٹ گیا اور اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔

ناگو نے جب اپنا ہر منتر بے کار دیکھا تو اٹھ دوڑا اژدھا کے لئے اب وہ بڑا آسان شکار تھا۔

شریم نے اژدھا سے کہا۔"اس ظالم انسان کو چھوڑنا نہیں اژدھا بھائی۔"

تو اژدھا نے کہا۔"یہ اب مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔"ساتھ ہی اژدھے نے اپنے جبڑے کھول کر زور سے سانس اندر کو کھینچا۔

ناگو اس وقت تاڑ کے درختوں میں پہنچ چکا تھا اژدھا کے سانس نے اسے پہلے تو اسے وہیں کھڑا کر لیا۔وہ آگے کو دوڑ رہا تھا اور اژدھا کا سانس اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناگو اسی جگہ کھڑا ٹانگیں چلانے لگا۔اژدھا نے اور زور سے سانس کھینچا تو ناگو نے اژدھا کی طرف آنا شروع کر دیا۔قریب آتے آتے وہ اژدھے کے منہ کے بالکل قریب آ گیا۔ناگو کا جسم تیزی سے اژدھا کے منہ کے اندر چلا گیا اور ناگو کی آخری چیخ بلند ہوئی اور پھر ناگو کی چیخ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئی۔

شریم نے آگے بڑھ کر اژدھا سے کہا۔"اژدھا بائی تم نے دنیا کو ایک ظالم انسان سے نجات دلائی اب مجھے راج کماری کے پاس لے چلو۔اسے میری مدد کی ضرورت ہو گی۔"

اژدھا نے کہا۔"میرے پھن کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤ۔"اژدھا نے اپنا پھن نیچے کیا شریم اچھل کر اس کے سر کے اوپر بیٹھ گیا۔

تو اس کے ساتھ ہی اژدھا نے پوری تیز رفتاری سے رینگنا شروع کیا چلتے چلتے وہ جنگل میں عین اس جگہ



پہنچ گیا جہاں وحشی راج کماری کو پکڑ کر واپس لارہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے اور نیزے اچھال رہے تھے۔

شریم نے اژدھا سے کہا۔ "راج کماری مصیبت میں ہے مجھے یہاں اتاردو۔ میں راج کماری کو ان سے چھڑالوں گا۔"

اژدھا نے شریم کی طرف دیکھتے ہوئے پھر وہی بات دہرائی۔ "ایک بھائی کے ہوتے ہوئے ایک بھائی کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تم آرام سے دیکھو کہ میں ان وحشیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔" شریم کو اژدھے نے ایک درخت کے پیچھے اتاردیا۔ اور خود اس راستے میں جا کر پھن اٹھائے بیٹھ گیا جدھر سے وحشیوں نے ابھی گزرنا تھا۔

وحشی خوشی سے جھومتے لہراتے شور مچاتے اچھلتے کودتے راج کماری کو پکڑ کر سردار کے پاس لے جارہے تھے کہ اچانک جنگل ایک خوف ناک پھنکار کی گرج سے دہل اٹھا۔ سارے کے سارے وحشی وہیں جم کر رہ گئے وہ دہشت زدہ تھے ایسی گرج انہوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ اژدھا نے دوسری پھنکار ماری اور درخت کی اوٹ سے نکل کر ان وحشیوں کے سامنے آکر لہرانے اور ان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ وحشیوں نے اژدھے پر نیزے پھینکنے شروع کردیئے۔ اژدھے کی پھنکار کی اس قدر گرمی تھی کہ نیزے اس کے منہ کے قریب جاتے ہی پگھل کر بھاپ بن کر اڑ جاتے، کئی درختوں کو اژدھے کی پھنکار نے آگ لگادی۔ وحشیوں نے راج کماری کو تو چھوڑ دیا، اب اپنی جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ لیکن اژدھے نے ان کے سارے راستے بند کردیئے تھے۔ جنگل میں اب چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔

شریم نے لپک کر راج کماری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا۔ "گھبراؤ نہیں میں شریم ہوں۔"

"شریم بھائی تم...... جلدی سے اس طرف آجاؤ۔" شریم راج کماری کو لے کر آگ میں جلتے درختوں سے دور لے گیا۔

راج کماری کا رنگ زرد ہورہا تھا اژدھے کو دیکھ کر اس کا حلق زیادہ خشک ہوگیا۔

شریم نے کہا۔ "فکر نہ کرو اب تم میرے ساتھ ایک خوف ناک جنگل کے سفر پر ہو۔ اس لئے بہادر بن کر حالات کا مقابلہ کرو میں تمہیں یہ بھی بتادینا چاہتا ہوں کہ یہ اژدھا ہمارا دوست ہے اور اس نے ہم دونوں کو سمندر کے طوفان سے نکال کر ہندوستان کے ساحل تک پہنچایا تھا۔"

راج کماری نے اژدھے کے نتھنوں اور منہ سے آگ کے شعلے نکلتے دیکھے تو ششدر ہوکر رہ گئی۔

"کیا یہ اژدھا ہمارا دوست ہے؟"

"ہاں، راج کماری کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ یہ کس دلیری سے ہمارے دشمنوں کا مقابلہ کررہا ہے۔"

اژدھا نے تقریباً سارے وحشیوں کو جلا کر ختم کردیا اس کے سانس سے نکلنے والی آگ اتنی زیادہ تباہ کن تھی کہ جس جنگل کے جسم کو آگ لگتی اس کی ہڈیاں تک آگ میں جل کر راکھ ہوجاتیں۔ سارے وحشیوں کو جلا کر اژدھا نے شریم اور راج کماری سے کہا۔

"اب میں واپس اپنی سمندری دنیا میں جانا چاہتا ہوں اور اب میں تمہاری اور کیا مدد کرسکتا ہوں۔"

راج کماری ڈر کر ایک درخت کے اوٹ میں ہوگئی۔ اصل میں وہ ڈر کر شریم کے پیچھے ہوجانا چاہتی تھی مگر شریم تو اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے مجبوراً اسے درخت کے پیچھے ہونا پڑا۔ شریم راج کماری کو درخت کے پیچھے جاتے دیکھا تو ہنس کر کہا۔

"یہ بہت ڈرتی ہے اژدھا بھائی۔"

اژدھا نے کہا۔ "ہر آدم زاد مجھے دیکھ کر ڈر کر بھاگ جائے گا۔ اب یہ بتاؤ شریم بھائی کہ میں تمہارے اور کیا کام آسکتا ہوں۔"

شریم نے کہا۔ "میں اسے لے کر یہاں سے سیدھا وسطی ہندوستان کی ریاست میں جاؤں گا راستہ بڑا دور ہے کیا تم ہمیں ہندوستان کے وسط میں پہنچاسکتے تاکہ ہمارا جنگل کا خطرناک راستہ تو کٹ جائے۔"

اژدھا نے کہا۔ "میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے

شریم بھائی اور تمہیں چھوڑ کر مجھے واپس بھی آنا ہے کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ منزل کے قریب پہنچادوں۔ میرے سر کے اوپر بیٹھ جاؤ۔" راج کماری کا تو اژدھے کے پاس آتے ہوئے دم نکلا جارہا تھا۔

اور پھر اژدھا کئی دریاؤں اور پہاڑوں جنگلوں سے گزر گیا بہت دور آگے جاکر اژدھا راج کماری اور شریم کو ایک بہت بڑے دریا کے پار اتار دیا اور کہا۔ "شریم بھائی اب اگر میں اور آگے گیا تو مجھے واپسی میں دیر ہوجائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس جگہ سے واپس چلا جاؤں تاکہ وقت پر سمندری ناگ بادشاہ کے دربار میں پہنچ سکوں۔"

شریم نے اژدھا کو اجازت دے دی اور وہ واپس ہوگیا اژدھا کے جانے کے بعد شریم نے راج کماری سے پوچھا۔ "کیا تم بتاسکتی ہو کہ یہاں سے تمہاری ریاست کتنی دور ہے۔"

راج کماری نے اردگرد دیکھا پھر زمین سے پتھر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ یہ دکن کا علاقہ ہے۔ یہاں سے اوپر کی طرف سات سوکوس پر ہماری ریاست ہے لیکن ابھی ہمیں بڑے خطرناک جنگلوں سے گزرنا پڑے گا۔"

شریم نے کہا۔ "دنیا کا ایسا کوئی خطرناک جنگل نہیں جس میں سے میں نہ گزرا ہوں۔ راج کماری جی تم فکر نہ کرو میں تمہیں تمہارے محل میں ہی پہنچا کر دم لوں گا۔" اور وہ دونوں دریا کے کنارے کنارے شمال کی طرف روانہ ہوگئے دونوں جنگلوں میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

☆......☆......☆

ناگنی نے ایک پرتگالی جہاز کے مالک ڈریک کے مال بردار جہاز پر نوکری کرلی تھی اور جہاز سمندر میں پرتگال کی ایک بندرگاہ کی طرف سفر کررہا تھا ناگنی کے بارے میں جہاز کے مالک ڈریک کو صرف اتنا ہی علم تھا کہ وہ ایک بے کار لڑکی ہے جسے اس نے ترس کھا کر اپنے جہاز پر نوکری پر رکھ لیا تھا جہاز بادبان کھولے ہوا میں اپنی منزل کی طرف بڑھا چلا جارہا تھا ناگنی کے دل میں بس ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح وہ پرتگال سے اسپین پہنچ جائے اور شاہان کا سراغ لگائے۔

اچانک اس رات موسم بہت خراب ہوگیا طوفانی ہوائیں چلنے لگیں مگر ڈریک کا جہاز بڑا مضبوط تھا وہ طوفانی موجوں میں بھی سفر کرتا رہا۔ لیکن صبح ہوئی تو ایک قیامت اس جہاز کا انتظار کررہی تھی جہاز کا لنگر ٹوٹ گیا۔ اور اس کا سمت دکھانے والا آلہ طوفان کی نذر ہوگیا اب جہاز یہی کرسکتا تھا جس طرح بھی ہوسکے واپس چلا جائے ناگنی واپس نہیں جانا چاہتی تھی ڈریک نے اعلان کردیا کہ جہاز واپس جائے گا۔

ناگنی نے کہا۔ "میں واپس نہیں جاؤں گی۔"

ڈریک بولا۔ پھر تمہیں سمندر میں اترنا ہوگا کیونکہ میں تمہارے لئے اپنا جہاز تباہ نہیں کرسکتا۔"

ناگنی کو ڈریک پر بڑا غصہ آیا اور کہنے لگی۔ "میں اتروں نہیں بلکہ اڑ جاؤں گی۔" تو ڈریک نے زور سے ناگنی کے کندھے پر ہاتھ مارا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

"ذرا اڑ کر تو دکھاؤ۔"

ناگنی نے کہا۔ "میں اڑ کر واپس نہیں آؤں گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم جہاز کو آگے نہیں لے جاؤ گے۔ مجھے صرف اتنا بتادو کہ یہاں سے اسپین کتنی دور ہے۔"

ڈریک یہی سمجھ رہا تھا کہ ناگنی اس سے مذاق کررہی ہے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسپین یہاں سے ایک ہزار میل مغرب کی طرف ہے اچھا تو اب اڑ کر تو دکھاؤ ننھی بچی۔"

ناگنی نے ایک گہرا سانس لیا اس کے ساتھ ہی وہ سفید رنگ کا باز بن گئی اور پروں کو پھڑ پھڑا کر جہاز کے عرشے پر سے اڑ گئی ڈریک اور دوسرے ملاح منہ کھلے اسے دیکھتے ہی رہ گئے ناگنی نے اڑتے اڑتے جہاز کے اوپر ایک گول چکر لگایا۔ اور پھر ایک غوطہ لگا کر جیسے جہاز کے ملاحوں کو سلامی دی اور سمندر پر مغرب کی طرف اڑنا شروع کردیا یہ وہ منظر تھا جو سمندری ملاحوں نے کبھی نہ دیکھا تھا ناگنی سمندر سے کافی بلندی پر اڑی چلی جارہی تھی

اس کا اپنا اندازہ بھی تھا کہ وہ مغرب کی طرف اڑ رہی ہے جدھر اسپین ہے۔

اڑتے اڑتے اسے شام ہوگئی تو آسمان پر ایک بار پھر کالی گھٹائیں امڈ آئی اور بڑی تیز ہوائیں چلنے لگیں تھوڑی ہی دیر میں آندھی نے طوفان کی شکل اختیار کرلی ہوا کے تھپیڑوں نے ناگنی کو سمندر کے اوپر پھینک دیا اس کے پر بھیگ گئے اب وہ باز بن کر نہیں اڑ سکتی تھی اس نے فوراً سانپ کی شکل بنائی اور سمندری لہروں پر تیرنا شروع کردیا بڑی بڑی لہروں میں تیر کی طرح تیرتی چلی جارہی تھی سمندر میں آکر اسے سمت کا اندازہ نہیں ہورہا تھا جونہی وہ سمندر میں آئی اس کے پرانے دوست ساتھی شیش ناگ یعنی چھ منہ والے بڑے اژدھے نے اس کی بو سونگھ لی تھی وہ بھی سمندر میں ہی تھا بو کے تعاقب میں وہ ناگنی کے پاس آکر سمندر سے باہر نکل آیا ناگنی نے اپنے پرانے دوست شیش ناگ کو دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔

شیش ناگ نے ناگنی کو اپنے سر پر بیٹھا لیا اور کہا۔ ”مجھے تمہارا بھائی شریم ملا تھا۔“

ناگنی نے چونک کر پوچھا۔ ”کہاں......؟“ اس کے بعد شیش ناگ نے اسے ساری کہانی بیان کردی اس نے ناگنی کو یہ بھی بتایا کہ شریم سمندری طوفان میں پھنس گیا تھا اور اس نے اسے نکال کر ہندوستان کے ساحل پر پہنچادیا ہے۔“

”کیا راج کماری اس کے ساتھ تھی۔“ ناگنی نے پوچھا۔

اژدھا نے کہا۔ ”ہاں وہ اس کے ساتھ تھی اب وہ دونوں ہندوستان کے جنگلوں میں سفر کررہے ہیں۔“ اژدھا نے ناگنی کو یہ بھی بتایا کہ ”شریم اور راج کماری کو اس کے باپ کی ریاست میں پہنچانے کے بعد اسپین میں شاہان کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا ناگنی نے پوچھا۔

”کیا شریم نے شاہان کے بارے میں کوئی اور بھی بات کی تھی؟“

”نہیں بس اتنا کہا تھا کہ اسے شاہان کی کوئی خبر نہیں ہے۔“ ناگنی نے اژدھا سے اسپین کے ساحل کے بارے میں پوچھا۔

اژدھا کو اسپین کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔

ساری رات دونوں پرانے دوست سمندر میں سفر کرتے رہے۔ دن نکلا تو انہیں دور ایک پہاڑی سمندر سے ابھری ہوئی دکھائی دی اس پہاڑی کے اوپر ایک پرانا محل سا بنا تھا جس کے گول گول گنبد بھی تھے ناگنی نے اژدھا سے پوچھا۔ ”یہ پراسرار محل کس کا ہے؟“

اژدھا نے کہا۔ ”وہ کبھی ادھر نہیں آیا خدا جانے کس کا محل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ویران ہوگا کیونکہ اس پہاڑی پر کوئی انسان نہیں رہ سکتا۔“

”تمہارا خیال درست لگتا ہے۔“

وہ پہاڑی پر پہنچ گئے اژدھا کو واپس بھی جانا تھا کیونکہ وہ اپنے علاقے سے ہزاروں میل دور نکل آیا تھا اس نے ناگنی سے واپس جانے کی اجازت مانگی تو ناگنی نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی اور کہا۔

”اچھا خدا حافظ پھر ملیں گے۔“ اژدھا ناگنی کو سلام کرکے پھر سے سمندر میں اتر گیا۔

اس اکیلی پہاڑی کے پاس ناگنی اکیلی رہ گئی وہ ابھی تک سانپ کی شکل میں تھی اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ پھر سے انسان بن جائے مگر یہ سوچ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ کہ اسے سانپ کی شکل میں ہی اوپر والے محل کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس محل میں کون کون سے لوگ رہتے ہیں ناگنی نے اوپر جاتی سیڑھیاں چڑھنی شروع کردی۔

وہ سیڑھیوں کے ساتھ بنی ہوئی ہے بے حد پختہ پتھر کی دیوار پر رینگتی ہوئی اوپر چلی جارہی تھی جب وہ پہاڑی کا پورا چکر کاٹ چکی تو سامنے محل کا وہ ہی دروازہ آگیا جس کے اندر شاہان جاکر نقاب پوش جادوگروں کی قید میں پھنس گیا تھا۔

ناگنی دروازے پر رینگ کر چڑھ گئی دروازہ بند تھا اور کوئی سوراخ بھی نہیں تھا جس کی مدد سے وہ محل کے اندر داخل ہوسکتی محل کے آخری منزل کافی اونچی تھی ناگنی نے سوچا کہ پہلی منزہ سے ہی محل میں داخل ہونا چاہئے۔ وہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

دوبارہ دروازے سے اتر کر نیچے آ گئی۔ نقاب پوش کا جہاز سمندر میں اب نہیں کھڑا تھا وہ کہیں چلا گیا تھا اتنے میں ناگنی نے آواز سنی یہ اواز دروازہ کھلنے کی تھی جیسے اندر سے کوئی دروازہ کھول رہا ہوں، وہ جلدی سے ایک خشک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی۔

محل کا بڑا دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا اور اندر سے دو نقاب پوش ایک تابوت کو لے کر باہر نکلے اس قسم کے تابوت میں لاش رکھی ہوتی ہے ناگنی نے سوچا شاید یہ نقاب پوش اس خطے میں رہتے ہیں اور کسی مردے کو سمندر میں پھینکنے جا رہے ہیں وہ انہیں غور سے دیکھنے لگی نقاب پوش محل کی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر جانے والی گول سیڑھیاں چڑھنے لگے ناگنی نے محل کے اندر جانے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ یہ سوچا کہ پہلے ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہئے کہ یہ کون ہیں اور تابوت اٹھا کر کہاں لے جا رہے ہیں۔

نقاب پوش محل کی سب سے اوپر والی منزل پر آ گئے یہاں پہنچ کر انہوں نے تابوت کو گنبد کے نیچے سیاہ پتھر کے بڑے چبوترے پر رکھا اور واپس چلے گئے ناگنی کو تابوت کی لاش سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی بلکہ وہ ان نقاب پوشوں کا پتہ چلانا چاہتی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں اور دور دراز سمندر کے اس خطرناک اور ویران جزیرے میں کیا کر رہے ہیں اس محل کا راز کیا ہے؟

نقاب پوش آگے آگے جا رہے تھے اور ناگنی سانپ کی شکل میں رینگتی ہوئی ان کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی محل کے دروازے میں سے گزر کر یہ لوگ محل کے باغ میں آ گئے یہاں دیواروں پر لمبی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں وہ پھر ایک ڈیوڑھی میں سے نکل کر سرنگ سے باہر نکل آئے ناگنی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔

دونوں نقاب پوش تہہ خانے میں آ گئے یہی وہ تہہ خانہ تھا جس کے کنویں میں شاہان کئی روز سے گرا ہوا تھا اور باہر نکلنے کا اسے راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کنویں کے پاس ایک چبوترہ تھا اس چبوترے پر سے یہ نقاب پوش اس تابوت کو اٹھا کر لے گئے تھے جس کے اندر عمارہ بے ہوش تھی اور جسے شاہان نے اچین پہنچایا تھا ناگنی کو بھی کچھ خبر نہیں تھی کہ شاہان کنویں میں پڑا ہے نقاب پوش چبوترے پر کوئی منتر پڑھ کر اگر بتی جلا کر واپس چلے گئے۔

اس کے ساتھ ہی ناگنی نے محسوس کیا کہ وہاں شاہان کی خوشبو آ رہی ہے وہ چوکنا ہو گئی ادھر کنویں میں گرے ہوئے شاہان کو بھی ناگنی کی بو محسوس ہوئی وہ سر جھٹک کر ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا وہ اپنی پوری آواز سے بولا۔

"اوپر کون ہے ناگنی کیا تم ہو؟"

ناگنی نے شاہان کی آواز سنی تو جلدی سے کنویں کی منڈیر پر آ کر اپنا سر نیچے کر کے جھانکا۔ اندھیرے میں اسے شاہان پتھروں پر بے بس و مجبوری کی حالت میں پڑا اسے صاف نظر آ گیا۔ اس نے اوپر سے ہی آواز دی۔

"شاہان بھائی میں ہو ناگنی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

شاہان نے کہا۔"وہ جو میں اس قسم کے کنووں میں گرنے کے بعد اکثر کرتا ہوں یعنی یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوا۔"

ناگنی نے کہا۔" فکر نہ کرو میں تمہاری مدد کروں گی۔" ناگنی نے ایک دم سے شکل اختیار کی کنویں میں ایک بار پھر جھک کر انسانی آواز میں شاہان کو تسلی دی اور کہا۔

"میں اپنا آپ رسی بن کر نیچے پھینک رہی ہوں اسے پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنا۔" ناگنی نے گہرا سانس لیا وہ اس دفعہ ایک لمبا اور سرخ سانپ بن گئی جو رسی جتنا موٹا تھا اس نے خود کو کنویں کے باہر رکھا اور باقی سارا دھڑ رسی کی طرح کنویں کے اندر لٹکا دیا۔

شاہان نے ناگنی کی دم کو جلدی سے پکڑ لیا اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا شاہان جب کنویں سے باہر آیا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا دونوں نے ایک دوسرے کو جلدی جلدی اپنی داستان سنا دی ناگنی نے شاہان کو بتایا۔

"شریم راج کماری کو لے کر ہندوستان کے جنگلوں میں سفر کر رہا ہے یہ بات مجھے اژدھا نے بتائی تھی

اورخیال یہ ہے کہ وہ وہاں سے اسپین آنے کاارادہ رکھتا ہے۔"

شاہان نے کہا۔"میرا خیال ہے کہ ہمیں شریم کی مدد کرنی چاہئے کیونکہ وہ اکیلا ہے۔"

ناگنی نے کہا۔"میں تمہارے ساتھ جانے کوتیار ہوں۔"

اس پر شاہان نے کہا۔"مگر میرے ذمہ بھی ایک ذمہ داری ہے۔"

"کون سی ذمہ داری ہے؟" ناگنی نے پوچھا۔

شاہان بولا۔"میں عمارہ کوابھی تک اس کے گھر اسپین نہیں پہنچا سکا۔"

ناگنی بولی۔"عمارہ کہاں ہے۔"

شاہان نے کہا۔"اس کنویں میں گرنے سے پہلے میں نے دیکھا تھا کہ یہاں ایک تابوت ہے اس تابوت کے اندر عمارہ بے ہوش تھی۔"

ناگنی نے جلدی سے کہا۔" اس صندوق کو تو دونقاب پوش اٹھا کر محل کی سب سے اونچی منزل میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"بس اسی صندوق میں عمارہ بند ہے آؤ اوپر چل کر اسے آزاد کرواتے ہیں۔" ناگنی اور شاہان اوپر والی منزل کی طرف بھاگے راستے میں ناگنی سے پوچھا۔

"یہ کون لوگ ہیں۔" شاہان نے کہا۔

"یہ لوگ جادوگر ہیں۔بڑے خوف ناک قسم کے جادوگر ہیں اور ایک ان کا نقاب پوش سردار ہے یہ سردار عمارہ کا سر کاٹ کر کوئی جادو کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔"

"پھر تو ہمیں چاہئے کہ فوراً عمارہ کو جا کر تابوت سے نکال لیں۔"

"ہاں اسی لئے تو میں تمہیں لے کر اوپر جارہا ہوں۔"

وہ ابھی پہلی منزل سے نکل کر دوسری منزل کی اندھیری سیڑھیوں پر تھے کہ اچانک ایک خوف ناک گرج سنائی دی اور اسکے ساتھ ہی سارا کمرہ بلکہ سارا محل اندھیرے میں ڈوب گیا انہیں سامنے اور پیچھے سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا ناگنی چونکہ سانپ کی شکل میں تھی۔اس لئے وہ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی اس نے دیکھا کہ سامنے پتھر کی بڑی مضبوط دیوار آن گری ہے اور وہ سیڑھیوں پر قید ہوکررہ گئے تھے۔اس نے شاہان سے کہا ان لوگوں کو شاید پتہ چل گیا ہے۔

شاہان کہنے لگا۔"یہ لوگ جادوگر ہیں میں نے ان کے سمندری جہاز پر انسانی لاش اور غیبی آوازیں سنی تھیں ان کو ضرور ہمارا علم ہوگیا ہے اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔"

ناگنی نے کچھ سوچ کر کہا۔"میرا خیال ہے کہ میں چھوٹی چڑیا بن کر تمہاری جیب میں چھپ جاتی ہوں کوئی نہ کوئی جادوگر یہاں ضرور آئے گا پھر جو ہوگا دیکھ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی دیوار میں ہیبت ناک گرج ایک بار پھر پیدا ہوگئی اور اس کی بڑی بڑی پتھر کی سیلوں نے کھسکنا شروع کردیا ناگنی اس وقت ایک زرد رنگ کی چڑیا بن گئی شاہان نے چڑیا کو اپنی جیب میں چھپالیا اور خود سامنے والی دیوار کے پاس لگ کر انتظار کرنے لگا کہ اب کیا ہوتا ہے پتھر کی بڑی سیل پرے ہٹ گئی اندر سے دوسینگوں والا بڑا جادوگر نکل کر سامنے آگیا نقاب کے پیچھے اس کی دو سرخ آنکھیں روشنی کی کرنیں باہر پھینک رہی تھیں شاہان کی طرف نظریں گاڑتے ہوئے جادوگر نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سے ایک نیلے رنگ کی تیز شعاع نکل کر شاہان کے جسم پر پڑی شاہان کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر اوپر چھت کی طرف اچھال دیا ہے۔ تو وہ اٹھ کر نیچے گر پڑا۔

جادوگر نے آگے بڑھ کر شاہان کے سر پر اپنی انگلی رکھ دی یہ انگلی ہڈی تھی گوشت اس میں بالکل نہیں تھا انگلی میں سے گرم آگ نکل کر شاہان کی کھوپڑی میں اترنے لگی شاہان کو ویسے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا اور نہ اسے کوئی جادو ہلاک کرسکتا تھا اسے اپنی جیب میں رکھی ہوئی چڑیا یعنی ناگنی کی فکر تھی کہ کہیں اس پر جادو اثر نہ کر جائے شاہان نے فوراً ہاتھ اوپر اٹھائے اور کہا۔

"جادوگر مجھے معاف کردے۔ میں تو اس محل کی سیر کرنے آ گیا تھا میں بےقصور ہوں۔" شاہان چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو جادوگر کے حوالے کردے تا کہ ناگنی کی جان بچ جائے اور اس کے بعد وہ سوچ کر اس پراسرار محل سے عمارہ کو لے کر نکلنے کی کوشش کریں گے۔

جادوگر نے شاہان سے کہا۔ "میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" جادوگر شاہان کو لے کر محل کے ایک تاریک تہہ خانے میں آ گیا جہاں دو نقاب پوش جادوگر ایک انسانی کھوپڑی سامنے رکھے اس کے سر پر کالے سانپ کو خون پلا رہے تھے جادوگر نے ان نقاب پوشوں سے کہا۔

"اسے قید کرلیا جائے کل اس کا خون دوسرے سانپوں کو پلا دیا جائے گا۔"

"جو حکم آقا۔" دونوں نقاب پوش جھک کر آداب بجالائے جادوگر یہ کہہ کر واپس چلا گیا نقاب پوشوں نے شاہان کو ایک زنجیر سے دیوار کے ساتھ باندھ دیا۔ اور سانپ کے منہ میں قطرہ قطرہ خون ڈالنے لگے۔

اچانک انسانی کھوپڑی پر بیٹھے ہوئے سانپ نے ایک جھرجھری سی لی اور کھوپڑی سے اتر کر چبوترے پر آ گیا۔ اور اس طرح لیٹ گیا کہ جیسے بے ہوش ہو گیا ہو دونوں نقاب پوش بڑے حیران ہوئے کہ یہ سانپ جو ابھی چست و چالاک تھا اسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔

اصل میں سانپ نے ناگنی دیوی کی تیز بو محسوس کرلی تھی جو چڑیا کی شکل میں شاہان کی جیب میں تھی شاہان نے بھی سانپ کی اس تبدیلی کو دیکھ لیا تھا مگر ابھی وہ ناگنی کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح سے اس کی اسکیم کے ناکام ہو جانے کا خطرہ تھا اور عمارہ کو نقصان پہنچ سکتا تھا مگر یہ کام سانپ نے خود ہی کر دیا ناگنی نے شاہان کی جیب میں سے ہی سانپ کی بو پالی تھی اس نے اندر ہی سے اپنی زبان میں سانپ کو حکم دیا کہ دونوں نقاب پوشوں کو ہلاک کردو۔

چبوترے پر نیم بے ہوش پڑے ہوئے سانپ نے عظیم ناگنی دیوی کا حکم سنا تو ایک دم سے پھنکار مار کر اٹھ کر پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور اچھل کر ایک نقاب پوش کی گردن پر ڈس لیا، دوسرا نقاب پوش ابھی سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ سانپ اچھل کر دوسرے نقاب پوش کی گردن پر گرا اور اس کی گردن پر بھی ڈس لیا اس سانپ کا زہر بہت تیز تھا، دونوں نقاب پوش زمین پر گرے اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر دونوں کے جسم پھٹ گئے۔

ناگنی شاہان کی جیب سے نکل کر باہر آ گئی اور اس نے انسانی شکل اختیار کرلی اور شاہان سے کہا۔

"یہ سانپ ہماری مدد کرے گا۔"

سانپ شاہان کے سامنے سر زمین پر رکھے بیٹھا تھا ناگنی نے اس سے پوچھا۔

"اس پراسرار محل کا راز کیا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔"

سانپ نے کہا۔ "سانپوں کی دیوی عظیم ناگنی یہ لوگ سمندری جادوگر ہیں ان کی سمندر کے نیچے حکومت تھی، اور پھر سمندر میں لاوا پھٹ پڑنے سے ان کا ملک غرق ہو گیا انہوں نے اوپر آ کر اس محل میں حکومت بنالی یہ لوگ اپنے جادو کا جہاز لے کر سمندر میں نکل جاتے ہیں اور انسانوں کو پکڑ کر یہاں لاتے ہیں ان کی گردن کاٹ کر ان کے خون پر منتر پڑھ کر پی جاتے ہیں اس طرح سے ان کا خیال ہے کہ یہ کبھی دوبارہ لاوے سے غرق نہ ہو سکیں گے۔"

ناگنی نے پوچھا۔ "یہ کہاں سے جادو حاصل کرتے ہیں۔"

سانپ کہنے لگا۔ "ان کا جادوگر بادشاہ نقاب کے اندر اپنے گلے میں ایک تعویز چھپائے رکھتا ہے سارا جادو اس تعویز میں ہے اگر یہ تعویز سمندر میں گرا دیا جائے تو ان کا سارا جادو ختم ہو جائے گا۔"

ناگنی نے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔" سانپ نے جھک کر سلام کیا اور چلا گیا، ناگنی نے شاہان سے کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں عمارہ کو اپنی حفاظت میں لینا چاہئے تا کہ جب ہم حملہ کریں تو یہ نقاب پوش اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔"

شاہان بولا۔ "عمارہ اس محل کے اوپر والی بارہ دری میں تابوت کے اندر بند ہے آؤ میرے ساتھ ہم اوپر چلتے ہیں۔"

پھر ناگنی کچھ سوچ کر بولی۔ ”مگر ٹھہرو، میرا خیال ہے کہ مجھے انسان کی شکل میں نہیں جانا چاہئے۔ میں سانپ بن کر تمہارے ساتھ جاتی ہوں۔“ ناگنی سانپ بن گئی چھوٹا سانسواری رنگ کا سبز آنکھوں والا بڑا ہی زہریلا سانپ، شاہان نے ناگنی کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا ناگنی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر خطرہ ہو تو وہ اسے کسی طرح زمین پر چھوڑ دے۔

شاہان نے تہہ خانے سے نکل کر محل کی اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر ایک نقاب پوش پہرے دے رہا تھا ناگنی نے شاہان کی جیب میں سے سر نکال کر کہا۔

”شاہان تم مجھے اسی جگہ چھوڑ دو میں اس پہرے دار کو راستے سے ہٹاتی ہوں۔“

ناگنی سانپ کی شکل میں شاہان کی جیب سے نکل کر سیڑھی کی دیوار پر رینگتی ہوئی دروازے کے پاس چلی گئی نقاب پوش پہرے دار کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا کیونکہ وہ سامنے بارہ دری تھی جس کے اندر عمارہ کا تابوت رکھا تھا نقاب پوش پہرے دار نے سانپ کو نہیں دیکھا تھا وہ پہرہ دے رہا تھا۔

رات کا آخری پہر تھا آسمان پر ستاروں کی چمک پھیکی پڑ رہی تھی کیونکہ صبح ہونے والی تھی ناگنی آخری سیڑھی پر سے رینگ کر سامنے والی دیوار کی طرف جانے لگی تو نقاب پوش کی نظر اس پر پڑ گئی اس نے بجلی کی تیزی کے ساتھ جھک کر سانپ پر تلوار پھینک دی۔

ناگنی کا خیال کیا بلکہ یقین تھا کہ وہ سامنے والی دیوار پر پہنچ جائے گی اس دیوار سے وہ اس پہرے دار پر حملہ کرنا چاہتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ایک ہزار سال بعد ناگنی پر ایسی آفت دوسری بار پڑی تھی۔

تلوار سیدھی ناگنی کے جسم پر آ کر پڑی اور ناگنی کے جسم کے دو ٹکڑے ہوگئے ناگنی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا پھر اسے کچھ بھی ہوش نہ رہا یہ ناگنی کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا جو دوسری بار ہوا تھا اور اسی لئے ناگنی نے شاہان اور شریم کو پہلے بتا دیا تھا کہ اگر کبھی میرے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں اور میں مر جاؤں تو اسے ہمالیہ پہاڑ کی ترائی میں ناگ مندر کے تالاب میں لے جا کر ڈال دینا تو میرا شریر دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔

ناگنی نے بے ہوش ہوتے ہوتے ایک عقل مندی کی بات کی کہ جب جسم پر تلوار پڑی اور جسم دو ٹکڑے ہو گیا تو اس نے بے ہوش ہوتے ہوتے بھی اپنے آپ کو سیڑھیوں پر لڑھکا دیا تاکہ وہ واپس سیدھا شاہان کے پاس پہنچ جائے کیونکہ خطرہ تھا کہ نقاب پوش پہرے دار اس کے جسم پر تلوار مار مار کر قیمہ نہ بنا دے ایسی حالت میں ناگنی کا پھر سے زندہ ہونا بڑا مشکل تھا۔

شاہان سیڑھیوں پر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور پہرے دار کو دیکھنے لگا کہ ناگنی اسے ڈسے گی اور وہ مر جائے گا لیکن شاہان نے دیکھا کہ نقاب پوش پہرے دار نے زور سے تلوار پھینکی اور اس کے ساتھ ہی پہرے دار کی بجائے سانپ کے دو ٹکڑے لڑھکتے ہوئے اس کے قدموں میں آن گرے شاہان کی تو جان ہی نکل گئی یہ ناگنی کے جسم کے ٹکڑے تھے یہ کیا ہو گیا کیسے ہو گیا شاہان کا دماغ چکرانے لگا اس نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا اور جلدی سے ناگنی کے جسم کے دونوں ٹکڑے جو سانپ کی شکل میں تھے اٹھا لئے اور رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لئے اور اوپر چڑھنے لگا۔

اب وہ نقاب پوش پہرے دار سے سب سے پہلے ناگنی کے قتل کا انتقام لینا چاہتا تھا وہ اوپر محل کی چھت پر آ گیا پہرے دار نقاب پوش نے شاہان کو اپنے سامنے دیکھا تو تلوار لہرا کر اس پر حملہ کر دیا یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ اس نے چیخ نہیں ماری تھی ورنہ سارے نقاب پوش ہوشیار ہو جاتے اور پھر عمارہ کو وہاں سے نکال لے جانا مشکل ہو جاتا۔

شاہان نے بڑے آرام سے نقاب پوش پہرے دار کے ہاتھ سے تلوار چھین کر اسے اپنے ہاتھ میں تھام لیا نقاب پوش نے خنجر نکال لیا اور لپک کر شاہان کے سینے میں گھونپ دیا شاہان نے خنجر بھی چھین کر محل سے نیچے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں پھینک دیا شاہان نے نقاب پوش

پہرے دار کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کیونکہ اب خطرہ تھا کہ وہ چیخ مار کر اپنے ساتھیوں کو بلا سکتا تھا نقاب پوش نے شاہان کی گردن کو دبوچ کر دبانا شروع کر دیا۔

شاہان کو بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ یہ تو ایسے ہی بات تھی کہ کوئی آدمی پتھر کے ستون کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دبانا شروع کر دے۔ شاہان نے نقاب پوش کو نیچے گرا کر اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اب وہ آواز نہیں نکال سکتا تھا شاہان نے اس کا نقاب اتار دیا۔ وہ کانپ گیا اس کی ناک غائب تھی ناک کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ تھا آنکھوں میں گہرے گڑھے تھے ان گڑھوں میں دو چھوٹے چھوٹے ڈیلے حرکت کر رہے تھے۔ شاہان نے پہرے دار کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ پھر اس نے خنجر سے پہرے دار کی دونوں آنکھیں نکال کر باہر پھینک دیں اس کے بعد شاہان نے نقاب پوش کی شہ رگ کاٹ ڈالی اس کے جسم سے خون کی جگہ نیلا پانی باہر نکلنے لگا اسے سانپ کی بات یاد آ گئی کہ یہ سمندری مخلوق تھی شاید اس لئے ان کی رگوں میں سمندر کا پانی گردش کر رہا تھا نقاب پوش پہرے دار کی جان نکل رہی تھی۔

شاہان کا جوش انتقام ابھی بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا اس نے پہرے دار کی لاش کو اٹھا کر محل سے نیچے سمندری چٹانوں میں پھینک دی نوکیلی چٹانوں پر گرتے ہی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سمندر میں گر پڑے۔ شاہان کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تھا اس کے بہترین دوست ساتھی ناگنی کی لاش سانپ کی شکل میں اس کے جسم کے دو ٹکڑے اس کی جیب میں پڑے تھے سامنے بارہ دری میں عمارہ کا تابوت تھا۔

شاہان نے آگے بڑھ کر تابوت کو کھولا اس کے اندر عمارہ بے ہوش پڑی تھی شاہان عمارہ کے بے ہوش جسم کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور سیڑھیاں اتر کر محل کی پہلی منزل پر آ گیا یہاں خاموشی تھی رات کا پچھلا پہر ہونے کی وجہ سے شاید نقاب پوش سو رہے تھے۔ شاہان کے لئے یہ اچھا موقع تھا ویسے بھی شاہان سخت طیش کی حالت میں تھا اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جو کوئی بھی اس کے سامنے آیا وہ اسے اڑا کر رکھ دے گا۔ چاہے عمارہ اور ناگنی کی زندگیاں خطرے میں کیوں نہ پڑ جائیں۔ خدا کا شکر تھا کہ اسے محل کی ڈیوڑھی تک کوئی نہ ملا ورنہ یہ بات ناگنی اور عمارہ کے لئے سخت خطرناک ہو سکتی تھی ڈیوڑھی میں ایک لیمپ جل رہا تھا اس کی روشنی میں شاہان نے دیکھا۔

ایک نقاب پوش کو پہرے دیتے ہوئے جو تخت کے پاس کھڑا ہاتھ میں لمبا نیزہ پکڑے پہرہ دے رہا تھا۔

شاہان نے بے ہوش عمارہ کو دیوار کے ساتھ زمین پر اندھیرے میں لٹا دیا اور خود دیوار کے سائے میں آگے بڑھا نقاب پوش کو آہٹ سی محسوس ہوئی اس نے نیزہ سیدھا کر دیا اور پوچھا کون ہے شاہان نے اسی زبان میں کہا۔ تمہارا باپ اصل میں شاہان سخت غضب ناک ہو چکا تھا ناگنی کے قتل ہو جانے پر اسے اس قدر دکھ ہوا تھا کہ وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا نقاب پوش نے جب یہ لفظ سنے تو نیزہ لہراتا اسے حملہ کرنے کے انداز میں جھکاتا آگے بڑھا۔ شاہان اندھیرے سے باہر نکل آیا اس نے کہا۔

”آؤ میرے شکار میں تمہاری گردن توڑ کر اس کی گیند بناؤں گا۔“

”پہرے دار نے چلا کر کہا۔“ کون ہو تم بدبخت جو موت کو آوازیں دے رہا ہے۔“

شاہان نے کہا۔” میں خود موت ہوں تمہاری۔“ اور شاہان نے چھلانگ لگا کر نقاب پوش کی کمر کے گرد دونوں ہاتھ ڈال کر اسے اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ اس کی کمر کی ہڈی کڑ کڑا کے چھ سات جگہوں سے ٹوٹ گئی اور وہ شاہان کے بازوؤں میں یوں جھومنے لگا جیسے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی کوئی گٹھری ہو۔ شاہان نے اسے زمین پر لٹا دیا اور نیزہ اس کے سینے میں گاڑ دیا۔

پھر وہ عمارہ کو اٹھا کر محل کی ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا۔ باہر سمندر اس کے سامنے کافی نیچے ٹھاٹھیں مار رہا تھا دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا بادبانی جہاز وہاں سے خدا جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

شاہان نے پہاڑی سے اترنا شروع کر دیا

چکر کھاتی گول سڑک پر سے ہوکر وہ سمندر کے کنارے چٹانوں کے پاس آیا تو اسے ایک کشتی دکھائی دی جسے ریت میں کھینچ کر ایک پتھر سے باندھا گیا تھا شاہان نے عمارہ کو کشتی میں لٹا دیا اور رسی کو ہاتھ کے ایک جھٹکے سے ہی توڑ ڈالا کشتی گھسیٹ کر اس نے سمندر میں ڈالی اور چپو چلانے لگا پہاڑ کے اردگرد سمندر میں بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں مگر سمندر آگے جاکر پرسکون ہوگیا تھا شاہان کشتی کو چلا رہا تھا اس کے تھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کچھ دور تک اسے پہاڑی کے اوپر محل کا سنہری گنبد دکھائی دیتا رہا پھر وہ پہاڑی سمیت نظروں سے اوجھل ہوگیا شاہان کی کشتی اب کھلے سمندر میں تھی وہ سورج کے حساب سے مغرب کی طرف کشتی چلا رہا تھا کیونکہ اندلس کا ملک وہاں سے مغرب کی طرف ہی تھا۔ اس کے سامنے اب دو اہم کام تھے ایک تو عمارہ کو اندلس میں اس کے ماں باپ کے پاس پہنچانا تھا۔ اور دوسرا جو سب سے بڑا کام تھا جس کے بارے میں شاہان بہت زیادہ پریشان تھا۔ وہ ناگنی کو لے کر ہمالیہ کی چوٹی پر موجود جھیل پر جانے کا تھا جہاں ناگنی کو صندل کی لکڑی کی صندوقچی میں بند کر کے جھیل کے عظیم الشان ناگ مندر کے تالاب میں ڈالنا تھا۔

شاہان نے عمارہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس کے منہ پر پانی کے باربار چھینٹے مارے آخر وہ ہوش میں آگئی۔ اس نے چونک کر شاہان کو دیکھا اور پوچھا۔

"شاہان بھائی ہم کہاں ہیں۔" شاہان نے اسے ساری کہانی بیان کی اور پھر جیب کے اندر سے ناگنی کے جسم کے دونوں ٹکڑے نکال کر دکھائے، عمارہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے ناگنی کی لاش اس سے نہ دیکھی گئی۔

"اب اس کا کیا بنے گا شاہان بھائی؟" عمارہ نے پوچھا۔

شاہان نے کہا۔ "میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر ناگنی کی لاش لے کر ہمالیہ کی طرف نکل جاؤں گا وہاں اس کا علاج ہوگا اور خدا نے چاہا تو اسے پھر سے زندگی مل جائے گی۔"

کشتی نامعلوم سمندر میں چل رہی تھی اب لہریں اسے اپنے آپ مغرب کی طرف بہائے لئے جارہی تھی شاہان کو سب سے زیادہ اب اس بات کی پریشانی تھی کہ عمارہ کے کھانے اور پینے کا کیا بندوبست ہوگا اور کچھ نہیں تو کم از کم اسے پینے کے لئے پانی تو ملنا چاہئے مگر اتنے بڑے سمندر میں بھی پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں تھا اس لئے کہ سمندر کا پانی کڑوا ہوتا ہے اگر انسان پی لے تو اس کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔

دوپہر کو عمارہ نے کہا۔ اسے سخت پیاس لگی ہے۔

شاہان اسے کیا جواب دیتا وہاں پانی کہاں سے لاتا آسمان پر پرندہ تک دکھائی نہ دیتا تھا مچھلیاں بھی کشتی کے قریب بھی نظر نہیں آتی تھیں شاہان نے کہا۔

"عمارہ بہن پانی کے لئے تمہیں تھوڑا صبر کرنا پڑے گا شاید کوئی جزیرہ آجائے اور وہاں پانی کے ساتھ ساتھ ہمیں کھانے کو بھی کچھ مل جائے۔"

لیکن جزیرہ تو نہ ملا ہاں دور شاہان کو ایک چٹان سی سمندر میں ابھری ہوئی دکھائی دی۔

شاہان نے کہا۔ "شاید یہ کوئی پہاڑی ہے جو سمندر سے باہر نکل آئی ہے اس قسم کے پہاڑ سمندر کے نیچے اکثر ملتے ہیں جن کی چوٹیاں سمندر سے باہر نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔

دوپہر ڈھل رہی تھی عمارہ کا پیاس کے مارے برا حال ہو رہا تھا کہ شاہان نے اس چٹان کے ساتھ کشتی لگادی شاہان اور عمارہ کشتی سے اتر آئے یہ چٹان کافی بڑی تھی اور اس کے اردگرد کافی بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے شاہان نے عمارہ کو ایک طرف بیٹھایا اور خود ادھر ادھر جاکر پانی کی تلاش کرنے لگا عمارہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایک جگہ شاہان کو چٹان کے اندر سے قطرہ قطرہ پانی پتھروں میں جمع ہو رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا چشمہ بن گیا تھا پانی میٹھا تھا عمارہ نے اپنی پیاس بجھائی اور خدا کا شکر ادا کیا شاہان نے کہا کہ اس جگہ ہمیں رات میں آرام کرنا چاہئے عمارہ کو بھوک بھی لگ رہی تھی وہ بولی۔

"یہاں رکنے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم سمندر میں ہی نکل چلیں شاید آدھی رات کو کسی جزیرے پر پہنچ

جائیں۔"

شاہان نے کہا۔ "جیسے تمہاری مرضی۔" عمارہ کشتی میں بیٹھ گئی شاہان کشتی کو چٹان سے دور لے جانے ہی لگا تھا کہ اچانک اس کی نظر دور اس طرف سمندر میں پڑ گئی جدھر سورج غروب ہو رہا تھا اور سمندر سرخ ہو رہا تھا ادھر شاہان کو ایک کشتی چٹان کی طرف آتی نظر آئی یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں شاہان نے جیسے ہی اپنے آپ سے سوال کیا عمارہ ادھر ہی دیکھ رہی تھی سورج کی سنہری روشنی میں انہیں کشتی میں تین چار آدمیوں کے خاکے دکھائی دے رہے تھے۔

شاہان نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ یہ خوف ناک آدم خور ہوں تم اس چٹان کے پیچھے پتھروں کی اوٹ میں چلی جاؤ۔" شاہان کشتی کو چٹان کے پیچھے پتھروں کی اوٹ میں لے گیا وہ خود بھی عمارہ کے ساتھ ایک اونچے پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔ اور آنے والی کشتی کو دیکھنے لگا۔

کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں سفر کرتی چٹان کے قریب آرہی تھی اب وہ بڑی آسانی سے دیکھ رہے تھے کہ کشتی میں تین ملاح سروں پر سرخ رومال باندھے کھڑے تھے ان کے ہاتھ میں خنجر تھے اور ایک آدمی کشتی میں سر جھکائے بیٹھا تھا شاہان نے کہا کہ معاملہ خطرناک لگ رہا ہے عمارہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم بھاگ چلیں۔"

کشتی چٹان کے پاس آکر رک گئی تینوں ڈاکو خوش نظر آرہے تھے، کشتی میں ایک شخص بندھا پڑا تھا، انہوں نے بھاری بھرکم بارعب چہرے والے قیدی کی رسیاں کھول کر ایک ملاح نے کہا۔

"جاؤ اور اس چٹان پر بھوکے پیاسے رہ کر موت کا انتظار کرو۔ تمہاری یہی سزا ہے کہ تم سسک سسک کر مرو۔" اور پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے قیدی کو چٹان پر چھوڑ کر کشتی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوگئے۔

قیدی نے ایک نظر سمندری چٹان کو اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہاں اسے اپنی موت صاف نظر آرہی تھی جب ڈاکو ملاحوں کی کشتی سمندر میں کافی دور نکل گئی تو شاہان نے عمارہ کو ساتھ لیا اور جلاوطن قیدی کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا ایک بار تو قیدی چونک کر پیچھے ہوگیا اور گرتے گرتے بچا اسے کبھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ اس قسم کی ویران جگہ پر بھی ایک آدمی اور ایک عورت اسے مل سکتے تھے۔ اس نے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔

"تم ...... تم کون لوگ ہو۔" وہ ہسپانوی زبان بول رہا تھا عمارہ چونکہ ہسپانوی جانتی تھی اس لئے وہ بڑی خوش ہوئی کہ اسے اپنے وطن کا آدمی مل گیا ہے اس نے بھی ہسپانوی زبان میں کہا کہ وہ اور شاہان بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچے ہیں اور وہ اسپین اپنے ماں باپ کے پاس جارہی ہے جو میڈرڈ میں تجارت کرتے ہیں۔ شاہان بھی یہ زبان سمجھتا تھا جلاوطن قیدی عمارہ سے مل کر بہت خوش ہوا۔

شاہان نے پوچھا۔ "دوست تم کون ہو تمہارا جرم کیا ہے اور یہ لوگ کون ہیں جو تمہیں یہاں مرنے کے لئے چھوڑ گئے ہیں؟"

جلاوطن قیدی بولا۔ "میرا نام پیڈرو ہے میں ایک تجارتی جہاز کا کپتان ہوں یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک گمنام جزیرہ ہے اس جزیرے پر میرا مال سے بھرا ہوا جہاز کھڑا ہے اور اس جہاز پر بحری ڈاکوؤں نے قبضہ کرلیا ہے انہوں نے میرے ساتوں کے سات ملاحوں کو مروا دیا ہے اور مجھے مرنے کے لئے اس چٹان پر چھوڑ گئے ہیں۔"

شاہان نے پوچھا۔ "بحری ڈاکوؤں کا جہاز کہاں ہے۔"

پیڈرو نے کہا۔ "ان کا جہاز بھی اس جزیرے پر ہے وہ آج رات شاید وہاں پر رکیں گے اور کل میرے جہاز کا سارا سامان اپنے جہاز پر لاد کر میرے جہاز کو آگ لگا کر چلے جائیں گے۔"

عمارہ بولی۔ "شاہان بھائی ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔"

کپتان ہنس پڑا۔ "تم لوگ خود میری طرح یہاں

پھنس گئے ہو تم میری کیا مدد کر سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم آپس میں اچھی اچھی باتیں کر کے خدا کو یاد کریں اور موت کا انتظار کریں۔"

شاہان مسکرایا۔ "ہم جلاوطن نہیں ہیں کپتان ہمارے پاس ایک کشتی بھی ہے اور ہم تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔"

"کشتی بھی ہے کہاں ہے؟" کپتان نے حیرانی سے پوچھا۔

"چٹان کے دوسری طرف کھڑی ہے۔" شاہان نے اس کے جواب میں کپتان نے شاہان اور عمارہ کو غور سے دیکھا اور کہا۔

"تم لوگ یہاں کیسے آ گئے......؟"

شاہان نے کہا۔ "یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ میں عمارہ کو اس کے ماں باپ کے پاس اسپین شہر چھوڑنے جا رہا ہوں ہمارا جہاز طوفان میں غرق ہو گیا تھا اور ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر اس چٹان پر پہنچ گئے۔"

کپتان کہنے لگا "یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم دونوں مل کر خونخوار سمندری ڈاکوؤں کا مقابلہ کیسے کریں گے ان کے جہاز پر دو توپیں بھی لگی ہوئی ہیں اور وہ پچاس ڈاکو ہیں ہر ایک کے پاس تیز دھار والے خنجر اور تلواریں ہیں کپتان کے پاس تو ہر وقت بارود سے بھرا ہوا پستول رہتا ہے۔"

شاہان ایک بار پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "فکر نہ کرو خدا ہماری مدد کرے گا ہم اسی وقت یہاں سے چلے چلیں گے تاکہ رات ہونے تک جزیرے پر پہنچ جائیں۔"

"کیا تم جزیرے تک ہمیں سمندری راستہ بتا سکتے ہو۔"

"کیوں نہیں میں نے اس سمندر میں بہت سفر کیا ہے۔"

"تو پھر ہمارے ساتھ آؤ۔" شاہان نے کپتان کو ساتھ لیا اور چٹان کے دوسری طرف لے جا کر کشتی دکھائی جسے ایک پتھر کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔

کپتان نے کہا۔ "ہمارے پاس ہتھیار بھی نہیں ہے ہم نہتے اتنے خونخوار ڈاکوؤں کا کیسے مقابلہ کریں گے ہمیں ایک بار پھر اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تینوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ مجھے اس عورت کے مرنے کا بڑا افسوس ہوگا۔" کپتان نے عمارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شاہان نے کہا۔ "یہ سارا کام تم مجھ پر چھوڑ دو کپتان۔"

"مگر تم اکیلے کیا کرو گے۔"

شاہان نے کہا۔ "یہ تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو جائے گا۔ کہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔"

کپتان نے سر جھٹک دیا جیسے اسے شاہان کی کسی بات پر بھروسہ نہ ہو، مجبوراً وہ کشتی میں سوار ہو گیا شاہان نے کشتی کو سمندر میں ڈال دیا اور کشتی کا رخ کپتان کی ہدایت کے مطابق جزیرے کی طرف کر دیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ ان کی کشتی ایک چھوٹے سے گمنام اور ویران مگر سرسبز جزیرے کے قریب پہنچ گئی۔ کپتان بڑا ہی ماہر سمندری ملاح تھا وہ کشتی کو جزیرے کی پیچھے کی طرف لے آیا تھا تاکہ ڈاکوؤں کی اس پر نگاہ نہ پڑے سنہری دھوپ میں جزیرے کے درخت چمک رہے تھے سمندری ہوا ان کی شاخوں کو ہولے ہولے جھلا رہی تھی جزیرے کا یہ ساحل بالکل ویران تھا نہ کوئی کشتی دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی آدمی نظر آ رہا تھا۔

کپتان نے کشتی کو ایک طرف جزیرے کی جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑا کر دیا اور اسے اچھی طرح سے باندھ دیا شاہان نے آہستہ سے کہا۔

"اس کشتی کی اب ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ ہم واپس تمہارے جہاز پر جائیں گے۔" کپتان پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم یا تو دیوانے ہو یا پھر خواب میں باتیں کر رہے ہوں۔" شاہان بھی ہنس دیا۔

شاہان نے کہا۔ "ہاں میں سچ مچ دیوانہ ہوں......"

عمارہ بولی۔ "اب آگے بھی چلو گے کہ یہاں باتیں کرتے ہی رہ جاؤ گے۔"

شاہان نے کپتان سے کہا۔" تمہارا جہاز کس طرف تھا کپتان نے بتایا کہ اس کا جہاز سمندری ڈاکوؤں کے جہاز کے ساتھ دوسری طرف کھڑا ہے۔"

شاہان نے کہا۔" ہمیں جزیرے کی دوسری طرف جانا ہوگا۔"

"کیا تم نے یہ جزیرہ پہلے بھی دیکھا ہے۔"

"ہاں دور سے دیکھا ہے مگر یہاں آج پہلی بار اس طرف آیا ہوں۔ میں اس کے جنگلوں سے واقف نہیں ہوں۔"

شاہان نے کہا۔"ہم جنگل میں سے نکل کر بالکل ساحل کے سامنے مغرب کی طرف بڑھیں گے جہاں تمہارا جہاز کھڑا ہے۔"

عمارہ بولی" یہ راستہ زیادہ لمبا نہیں پڑے گا۔"

کپتان نے کہا۔"نہیں کیونکہ یہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے اس کی گولائی زیادہ سے زیادہ چار میل ہے اس حساب سے ہمیں دو میل کا سفر طے کرنا ہوگا۔"

عمارہ نے کہا۔" رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

خیر عمارہ یہ تینوں جزیرے کے ساحل کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف چل پڑے جزیرہ ہرا بھرا تھا درختوں پر پھولوں والی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں یہاں جنگلی انگور بہت تھے اور ناریل کے درخت بھی کافی تھے عمارہ نے جنگلی انگوروں سے اپنا پیٹ بھرا اور زمین پر گرے ہوئے ناریل توڑ کر اپنی پیاس بجھائی وہ آگے بڑھتے رہے تھے اور سورج غروب ہو رہا تھا جزیرے پر رات کے سائے چھانے لگے تھے آگے جا کر ساحل مغرب کی طرف گھوم گیا یہاں سمندری چٹانیں ساحل پر دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں بھورے اور گہرے سبز رنگ کی چٹانیں تھیں جن پر کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ابھی تک وہ ساحل کی ریت پر چل رہے تھے جہاز کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاہان نے کپتان سے پوچھا۔" جہاز دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے۔"

کپتان نے سمندر کی طرف نگاہ جما کر کہا۔"میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ دور اور چلنا ہوگا ہو سکتا ہے کہ ایک میل کا دور سفر باقی ہو۔" وہ چلتے چلے جا رہے تھے اسی طرح انہیں سفر کرتے کرتے رات ہو گئی۔

جہاز کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا عمارہ بے حد تھک گئی آخر وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔" اب مجھ سے اور چلا نہیں جاتا۔"

شاہان نے کپتان سے کہا۔" کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم عمارہ کے پاس بیٹھو اور میں آگے جا کر جہازوں کا پتا کرو کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سمندری ڈاکو کوچ کرنے کی تیاری کر رہے ہوں ایسی صورت میں وہ تمہارے جہاز کو آگ لگا دیں گے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں میں عمارہ کو اس ویران جزیرے کے جنگل میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"شاہان نے کپتان اور عمارہ کو پیچھے ایک جگہ جزیرے کے ساحل کے پاس چٹان کی اوٹ میں چھوڑا اور خود آگے روانہ ہو گیا۔

رات کے وقت جزیرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور ایسا خاموش اور سنسان تھا کہ دیکھ کر ڈر لگتا تھا شاہان کافی دور آگے نکل گیا جزیرے کا ساحل ایک بار پھر گھوم گیا یہاں پہنچ کر شاہان کو پہلی بار سمندر میں کھڑے دو جہازوں کے خاکے دکھائی دیئے۔ جن میں سے ایک جہاز میں روشنی ہو رہی تھی شاہان کو بڑی خوشی ہوئی آخر وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ دوسرے جہاز کا صرف کالا کالا سایہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

شاہان تیز تیز چلنے لگا جب وہ جہازوں کے قریب پہنچا تو جنگل کی طرف گھوم گیا یہاں درختوں کے درمیان سے گزر کر وہ جنگل کے آخری کنارے پر آ کر رک گیا آگے ریت کا ساحل شروع ہوتا تھا پھر سمندر تھا۔ اور سمندر میں دونوں جہاز کھڑے تھے۔

کنارے پر بیٹھے ڈاکو گپیں ہانک رہے تھے کوئی لیٹا ہوا تھا اور کوئی کرتب دکھا رہا تھا اور ریت پر قلا بازی لگا رہا تھا ان کے درمیان آگ جل رہی تھی جس پر وہ ایک

سالم بکرا بھون رہے تھے شاہان کو ان کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی دونوں جہازوں میں سے ایک مال بردار تھا اور اس کا مالک کپتان تھا دوسرا جہاز سمندری ڈاکوؤں کا تھا۔ شاہان غور کرنے لگا کہ حملہ کس طریقے سے اور کس طرح سے کیا جائے شاہان نے اندازہ لگایا کہ ڈاکو پچاس سے زیادہ ہے شاہان کو اس وقت ناگنی بہت یاد آئی۔ جو دو ٹکڑے ہو کر اس کی جیب میں رومال میں لپٹی پڑی تھی اور جیسے دو مہینے کے اندر اندر ہمالیہ کے عظیم ناگ مندر میں لے کر جانا تھا۔

شاہان نے سوچا کہ شاید ابھی ڈاکوؤں نے دوسرے جہاز کا سامان اپنے جہاز پر نہیں لادا تھا یا ہو سکتا تھا مال لاد لیا ہو اور اب سفر کرنے کے لئے صبح کا انتظار کر رہے ہوں۔ اس وقت اگر ناگنی ہوتی تو اڑ کر جہاز کے اوپر جا کر پتہ لگا سکتی تھی کہ مال لادا جا چکا ہے کہ نہیں۔ شاہان کو اتنی دور سے اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا شاہان واپس ہوا تا کہ کپتان کو جا کر خبر کردے دوسری طرف شاہان کے جاتے ہی کپتان نے عمارہ سے کہا۔

”تم یہاں آرام کرو میں تمہارے لئے پانی کا پتہ کرتا ہوں۔“

عمارہ نے کہا۔ ”نہیں کپتان بھائی تم مت جاؤ مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔“

کپتان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے اس جزیرے پر تو کوئی بھی نہیں ہے اور پھر مجھے بھی سخت پیاس لگی ہے کہ میں بس ابھی آیا کہ آیا۔“

عمارہ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اکیلی رہے لیکن کپتان کچھ ضدی اور نادان شخص تھا وہ عمارہ کو اکیلا چھوڑ کر جنگل میں پانی کی تلاش میں چلا گیا عمارہ کو ڈر لگنے لگا کیونکہ وہاں گھپ اندھیرا تھا عمارہ بے چاری ایک پتھر کے پیچھے ہو کر سہمی سہمی بیٹھی تھی عمارہ نے شاہان کو یاد کیا کاش وہ جلد واپس آجائے۔ اتفاق سے دو سمندری ڈاکو بھی ادھر پانی کی تلاش کرتے پھر رہے تھے وہ پانی کا کھوج لگاتے ان چٹانوں کی طرف آ گئے جس کے قریب ہی عمارہ چھپی ہوئی تھی۔

عمارہ نے بھی ستاروں کی ہلکی روشنی میں انہیں دیکھ لیا تھا اس کا سارا جسم خوف سے ٹھنڈا پڑ گیا وہ کپتان یا شاہان کو آواز بھی نہ دے سکتی تھی خطرہ تھا کہ ڈاکو آواز سن کر اس کی طرف نہ آجائیں۔ مگر ڈاکوؤں نے عمارہ کو اندھیرے میں بھی چٹان کے پیچھے چھپے بیٹھے دیکھ لیا تھا وہ اسی جگہ رک گئے اور پھر رینگ رینگ کر عمارہ کی طرف بڑھنے لگے۔ عمارہ بے خبر بیٹھی تھی ڈاکو اس کے سامنے سے غائب ہو گئے تھے وہ یہ سمجھی کہ شاید وہ چلے گئے مگر اسے کیا خبر تھی کہ دونوں سمندری ڈاکو اس کے پیچھے رینگتے ہوئے آرہے ہیں۔

اچانک ایک ڈاکو اچھل کر عمارہ کے اوپر گرا اور اس نے عمارہ کا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا دوسرے نے عمارہ کی گردن میں کپڑا ڈال کر کسنا شروع کر دیا عمارہ کا دم گھٹ گیا اس کی آنکھوں کے ارد گرد تارے ناچنے لگے اور وہ بے ہوش ہو گئی سمندری ڈاکوؤں نے عمارہ کو اٹھایا اور جنگل میں غائب ہو گئے احمق کپتان کو چاہئے تھا کہ وہ عمارہ کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتا۔

شاہان واپس آیا تو عمارہ غائب تھی وہ بڑا پریشان ہوا اونچی آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا ادھر ادھر اندھیرے میں تلاش کیا مگر وہاں عمارہ ہوتی تو اسے ملتی اسے تو سمندری ڈاکو سیدھا اپنے جہاز پر لے گئے تھے اور اپنے سردار کے سامنے پیش کر دیا تھا عمارہ بے ہوش تھی سردار نے عمارہ کو غور سے دیکھا اور بڑا حیران ہوا کہ یہ عورت اس سنسان اور ویران جزیرے میں کہاں سے آ گئی اس نے غراتے ہوئے کہا یہاں ضرور اس کا کوئی ساتھی بھی ہوگا یہ عورت اکیلی اس جزیرے پر نہیں آسکتی اس کا لباس بتاتا ہے کہ یہ شہر کی عورت ہے جنگلی نہیں ہے جاؤ جہاں سے یہ عورت اٹھائی ہے وہاں اس کے ساتھی کو تلاش کرو اور اس کا سر کاٹ کر میرے سامنے پیش کرو۔“

”جو حکم سرکار اور دونوں سمندری ڈاکو خنجر لے کر واپس جنگل میں اس چٹان کی طرف چل پڑے۔ جہاں سے انہیں عمارہ ملی تھی دوسری طرف شاہان واپس آ گیا کپتان پریشانی کی حالت میں اسے ملا اور سارا

قصہ سنایا۔

شاہان نے قدرے غصے سے کہا۔ ”تمہیں کس نے کہا تھا کہ اسے اکیلی چھوڑ کر چلے جاؤ ضرور سمندری ڈاکو اسے پکڑ کر لے گئے ہوں گے۔“ کپتان نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

”دوست شاہان میں اپنی غلطی مانتا ہوں مجھے معاف کردو آؤ اب عمارہ کو تلاش کرتے ہیں۔“

شاہان بولا۔ ”میں تمہارا اور سمندری ڈاکوؤں کا جہاز دیکھ آیا ہوں ضرور عمارہ کو ڈاکو ان جہازوں کی طرف لے گئے ہوں گے۔“

کپتان بولا۔ ”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس جزیرے کا کوئی جنگلی اسے اٹھا کر لے گیا ہوں، کیونکہ رات کے وقت سمندری ڈاکو اس جنگل میں آنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“

شاہان سوچ میں پڑ گیا اور پھر کہنے لگا۔ ”تمہارا خیال بھی درست ہوسکتا ہے لیکن ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے فوراً آگے چلو۔“

اتنے میں انہیں پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی سوکھے پتوں پر چل رہا ہو۔

شاہان نے کپتان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا۔

جیسے اسے نیچے بیٹھ جانے کو کہہ رہا ہوں۔

کپتان وہیں گھاس پر بیٹھ گیا شاہان بھی ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا جزیرے کے اوپر چونکہ چاند نکل آیا تھا اس لئے چاندنی میں جھاڑیاں اور درخت صاف نظر آرہے تھے ان کے سامنے ایک چھوٹا سا کھلا میدان تھا جہاں جھاڑیوں کے جھنڈ تھے سامنے درختوں میں سے وہی دو سمندری ڈاکو ادھر ادھر تکتے احتیاط سے چلتے ہوئے باہر نکلے شاہان نے کپتان کے کان میں کچھ کہا۔ ”تم نے سمندری ڈاکوؤں کو دیکھا ہوا ہے کیا یہ وہی ہیں یا جنگلی لوگ ہیں۔“

چاندنی میں کپتان نے انہیں غور سے دیکھا اور کہا۔ ”یہی سمندری ڈاکو ہیں۔“

شاہان بولا۔ ”یہی لوگ عمارہ کو لے گئے ہیں۔ عمارہ کو اذیت دے کر انہوں نے اس سے ہمارے بارے میں پوچھ لیا ہوگا اور اب یہ ہمیں یہاں پکڑنے آئے ہیں۔“

کپتان نے کہا ” کہ اب کیا کریں ہم نہتے ہیں اور ان کے پاس خنجر ہیں۔“

شاہان نے آہستہ سے کپتان کا کندھا دبا کر کہا۔ ” اب یہ ہوگا کہ میں تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں گا۔ تم یہاں آرام سے بیٹھ کر تماشہ دیکھو۔“

کپتان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ شاہان کا مطلب کیا ہے اور وہ کس قسم کا تماشہ دکھانا چاہتا ہے شاید وہ مذاق کررہا ہے مگر یہ مذاق کرنے کا وقت نہیں تھا۔

کپتان نے کہا۔ ”کیا تم مذاق کررہے ہو۔“ لیکن شاہان آگے جاچکا تھا وہ جھاڑیوں میں سے رینگتا ہوا سامنے والی چھوٹی سی جگہ میں آگیا۔ ابھی تک وہ گھاس پر ہی رینگ رہا تھا چاندنی رات میں کپتان اسے گھاس پر رینگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سمندری ڈاکو بھی آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔ شاہان کو تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کہ ڈاکوؤں پر چھپ کر وار کرتا جونہی ڈاکو ذرا قریب آئے شاہان اٹھ کر سامنے آگیا ڈاکو ایک دم سمجھ گئے کہ جس شکار کو وہ تلاش کرتے پھر رہے تھے وہ یہی ہے دونوں ڈاکو خنجر لہراتے ہوئے شاہان پر ٹوٹ پڑے وہ شاہان کو بڑا آسان شکار سمجھ رہے تھے اور بات بھی ایسی ہی تھی کیونکہ شاہان اکیلا اور نہتا تھا ڈاکو دو تھے اور خنجر ان کے ہاتھوں میں تھے۔

جس وقت ڈاکوؤں نے شاہان پر حملہ کیا تو کپتان کا دل ڈوب گیا اسے یقین تھا کہ شاہان ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہوچکا ہے اور اب اسے شاہان کی لاش اسی جنگل میں ڈاکوؤں کے جانے کے بعد دفن کرنی پڑے گی اسے شاہان سے بڑا انس ہوگیا تھا اور کپتان نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دوست کی لاش گدھوں اور درندوں کے حوالے کرے اور واپس چلا جائے جھاڑی کے پیچھے چھپا کپتان بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے شاہان کو نیچے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

گرایا ہوا ہے اس پر خنجر کے وار کررہے ہیں شاہان چاہتا تھا کہ ڈاکو اپنی حسرت نکال لیں مرنے کے بعد اس کی روحوں کو یہ پچھتاوا نہ رہے کہ انہوں نے شاہان پروار نہیں کئے تھے ڈاکو اب کچھ کچھ حیران سے ہونے لگے تھے کیونکہ انہوں نے شاہان پر اتنے خنجر مارے تھے اس کا تو قیمہ ہی ہوجانا چاہئے تھا لیکن وہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔

شاہان بڑے آرام سے نیچے پڑا مسکرا رہا تھا جب دونوں ڈاکو تھک گئے اور خنجر ان کے ہاتھوں کو زخمی کرتے ہوئے ٹوٹ گئے تو شاہان نے دونوں کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے دونوں کی گردنیں پکڑ کر پوری طاقت سے ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا دیئے تھا کی آواز آئی اور دونوں کی کھوپڑیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور دماغ باہر نکل آئے شاہان اس کی لاشیں وہیں چھوڑ کر کپتان کی طرف واپس مڑا۔

کپتان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ایسا منظر اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا کہ شاہان کے اندر اس قدر طاقت ہوگی اسے معلوم نہیں تھا ابھی تک وہ یہی سمجھا تھا کہ شاہان نے نیچے پڑے پڑے ڈاکوؤں کے وار بچائے تھے اور پھر اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر دونوں کے سر ٹکرا کر انہیں ہلاک کردیا تھا شاہان آیا تو کپتان نے کہا تمہارے جسم میں ایک روبوٹ جیسی طاقت کہاں سے آگئی تم تو ایک دبے پتلے نوجوان ہو۔شاہان۔

شاہان بھی سمجھ گیا کہ کپتان یہی سمجھ رہا ہے کہ اس نے خنجروں کے وار بچائے ہیں شاہان ہنس دیا اور صرف اتنا کہا۔

”وہ اس قسم کی لڑائیوں کا بڑا ماہر ہے اب آگے نکلو ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے ڈاکوؤں کے جہاز پر پہنچ کر عمارہ کو رہا کروانا ہے اگر وہ چلے گئے تو بڑی مشکل ہوجائے گی ......“ اور وہ دونوں جزیرے کے تاریک جنگل میں سمندر کی طرف بڑھنے لگے۔ جہاں سمندری ڈاکوؤں کا جہاز کھڑا تھا۔

سامنے ہی ڈاکوؤں کا جہاز سمندر میں کھڑا تھا۔

اس کے ساتھ ہی کپتان کا تجارتی جہاز بھی تھا۔چاندنی رات میں دونوں جہاز ساتھ ساتھ کھڑے صاف نظر آرہے تھے شاہان اور کپتان درختوں کے پیچھے ان جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں خاموشی تھی۔ شاید سارے ڈاکو سورہے تھے شاہان نے کہا۔

”ہمیں اسی وقت حملہ کردینا چاہئے۔“

کپتان بولا۔”حملے سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”یعنی ہم دونوں نہتے ان تلواروں والے ڈاکوؤں پر حملہ کریں۔“

شاہان نے کہا۔”بہت سی ایسی باتیں ابھی تم دیکھو گے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے کوئی سوال نہ کرو اور خاموشی سے دیکھتے جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں اور صرف ایسا کرو کہ جو میں کہوں وہ چپ چاپ کرتے جاؤ۔“ شاہان نے ایک نظر سے دونوں ڈاکوؤں کا جائزہ لیا۔

اسے یقین تھا کہ عمارہ کو ڈاکوؤں نے اپنے جہاز میں ہی رکھا ہوگا شاہان سے ایک غلطی ہوگئی تھی اسے چاہئے تھا کہ دونوں ڈاکوؤں کو ہلاک کرنے سے پہلے پوچھ لیتا کہ عمارہ جہاز میں کس جگہ پر ہے پھر اسے خیال آیا کہ ہوسکتا تھا کہ عمارہ ان ڈاکوؤں کے قبضے میں نہ ہو بلکہ اسے کوئی درندہ اٹھا کرلے گیا ہو لیکن اگر درندہ اٹھا کرلے جاتا تو وہ ضرور شور مچاتی اور کپتان اس کی چیخوں کی آواز سن سکتا تھا اس کا مطلب تھا کہ ڈاکوؤں نے پہلے کسی طریقے سے عمارہ کو بے ہوش کیا ہوگا اور پھر اسے اٹھا کر جہاز پر لے گئے ہوں گے شاہان نے کپتان سے کہا۔

”تم اسی جگہ ٹھہرو میں ڈاکوؤں کے جہاز کی طرف جارہا ہوں۔“ کپتان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم اکیلے جاؤ گے۔“

شاہان نے کہا۔”ہاں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔“

کپتان نے کہا۔”تم اتنے سارے ڈاکوؤں میں کیسے زندہ رہو گے۔“

شاہان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے تم یہاں سے مت جانا میں واپس اسی جگہ آؤں گا۔“ کپتان چپ چاپ سا ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ شاہان درختوں سے نکل کر سمندر کے ساحل کی طرف گیا کپتان نے دیکھا پھیکی چاندنی میں شاہان دوسری طرف سے ہو کر جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا تھوڑی دور تک وہ شاہان کو دکھائی دیتا رہا اور پھر رات کے اندھیرے اور چاندنی میں گم ہو گیا کپتان نے اوپر درختوں کی طرف دیکھا ایک خاموشی اور اندھیرا تھا اور کچھ بھی نہیں تھا جزیرے کے ساحل کی طرف سے سمندری ہوا آ رہی تھی جنگل اس کے پیچھے سنسان تھا اگر کوئی اس کے پیچھے سے نکل کر درندہ اس پر حملہ کر دیتا تو اس کے پاس مقابلہ کرنے کے لئے کوئی معمولی سا چاقو بھی نہیں تھا۔ مگر ابھی تک یہی ثابت ہوا تھا کہ اس جزیرے میں کوئی درندہ نہیں ہے کپتان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے جہاز کو دیکھ رہا تھا جس میں اس کا لاکھوں روپے کا سامان بھرا ہوا تھا اور جواب ڈاکوؤں کے قبضے میں تھا شاہان کی باتوں پر اسے زیادہ اعتبار نہیں تھا اعتبار کرتا بھی کیسے بھلا ایک دبلا پتلا نوجوان اتنے ڈاکوؤں کا اکیلے کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ بس خاموشی سے اس ڈرامے کو دیکھتے جا رہا تھا جو شاہان اسے دکھا رہا تھا۔

دونوں جہازوں پر موت کی خاموشی طاری تھی شاہان اوپر سے ہو کر سمندر کی لہروں کے ساتھ ساتھ جہازوں کی طرف جا رہا تھا رات اتنی سنسان تھی کہ ہلکی چاندنی کے باوجود وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا دونوں جہاز کے بادبان لپٹے ہوئے تھے اور لنگر گرے ہوئے تھے۔

شاہان بڑی احتیاط سے چھپ چھپ کر آگے بڑھ رہا تھا کیونکہ عمارہ ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی اور ڈاکو اسے نقصان پہنچا سکتے تھے شاہان کی جیب میں ناگنی کی لاش کے دو ٹکڑے کی شکل میں رکھی ہوئی تھی جب بھی اس کا خیال اپنے ساتھی کی اس لاش کی طرف جاتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا شریم اس کے پاس نہیں تھا وہ راج کماری کو لے کر ہندوستان کے جنگلوں میں سفر کر رہا تھا اسے بھی ابھی تک کچھ خبر نہیں تھی کہ ناگنی کے ساتھ کیا بھیانک حادثہ گزر چکا ہے۔

شاہان کو کپتان نے دور سے ہی بتا دیا تھا کہ اس کا جہاز کون سا ہے وہ ڈاکوؤں کے جہاز کے پہلو میں آ گیا وہ سامنے سے جہاز میں سوار ہونا نہیں چاہتا تھا تا کہ خاموشی ہی خاموشی میں عمارہ تک پہنچ جائے اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ سمندر میں سے ہو کر جہاز کی دوسری طرف آ جائے وہاں کوئی کشتی بھی نہ تھی شاہان نے سمندر میں آہستہ سے چھلانگ لگا دی سمندر کی بڑی بڑی لہریں دور دور سے آ کر ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی تھیں جب ایک لہر واپس جانے والی تھی تو شاہان سمندر میں اترا یہ لہر اسے اپنے ساتھ دور تک لے گئی یہاں سے شاہان واپس تیرتا ہوا رات کی خاموشی میں جہاز کے قریب آ گیا لنگر کا رسہ آدھا سمندر میں تھا اور باقی آدھا اوپر جہاز کے عرشے کے جنگلے کی طرف جا رہا تھا شاہان تیرتا ہوا رسے کے پاس آ گیا پھر وہ رسے پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

شاہان بلی کی چال سے اوپر جا رہا تھا بس اسے ایک ہی ڈر تھا کہ اگر ڈاکوؤں نے اسے دیکھ لیا یا پکڑ لیا تو ہو سکتا ہے وہ عمارہ کو قتل کر دیں گے کیونکہ وہ شاہان کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے ہو سکتا ہے کہ طیش میں آ کر وہ اپنی ناکامی کا بدلہ عمارہ کو ہلاک کر کے لینے کی کوشش کریں اگر عمارہ وہاں نہ ہوتی تو یا شاہان کو خیال نہ ہوتا کہ عمارہ وہاں ہو سکتی ہے تو وہ بے دھڑک ڈاکوؤں پر جا کر حملہ کر دیتا مگر اب ایسا نہیں تھا اسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑ رہا تھا۔

شاہان نے جہاز کے عرشے پر سر نکال کر دیکھا عرشے پر ایک ڈاکو پہرہ دے رہا تھا اور اونگھ بھی رہا تھا کبھی وہ اٹھ کر چلنے پھرنے لگتا اور کبھی بیٹھ کر اونگھنے لگ جاتا اس کے ہاتھ میں ایک ننگی تلوار تھی جس وقت پہرے دار نے اونگھنا شروع کیا۔

اسی وقت شاہان جلدی سے جنگلہ پھلانگ کر

عرشے پر آ گیا اور جھک کر دبے پاؤں بھاگ کر جہاز کے بڑے ہوادان کے پاس آ کر رک گیا اور نیچے ہو کر بیٹھ گیا کیونکہ اس مسخرے پہرے دار نے اب اٹھ کر سیڑھیوں کے دروازے کے آگے چلنا چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔

پہرے دار کو خبر بھی نہ ہوئی کہ شاہان اس کے جہاز پر پہنچ چکا ہے۔ اب اس کے سامنے نیچے جانے کا مرحلہ تھا شاہان کے دماغ میں ایک ترکیب آئی اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اس پہرے دار ڈاکو کا حلیہ بدل کر نیچے جائے اس طرح سے کچھ دیر تک اور خاص طور پر رات کے اندھیرے میں کوئی اسے پہچان سکے گا یہ سوچ کر شاہان نے ہوا دان کی دوسری طرف آ کر بڑے بڑے گچھے پڑے تھے وہاں سے آگے کھسکنا شروع کر دیا اور پہرے دار کی عقب میں آ گیا خدا جانے پہرے دار کو اس کی موت نے آواز دی تھی اس نے سچ مچ شاہان کے قدموں کی آواز سن لی تھی کہ وہ ایک دم سے رکا گردن گھما کر ان رسوں کے گچھے کی طرف دیکھا جہاں شاہان چھپا ہوا تھا اور تلوار لئے اس طرف آ گیا شاہان بھی تو چاہتا تھا کہ کسی طرح سے وہ دروازے سے کچھ دور ہٹ جائے۔

شاہان ایک طرف اندھیرے میں ہو گیا ڈاکو جونہی اس کی طرف اندھیرے میں آیا اس کی گردن پر جیسے کوئی بھاری شے آ گری۔ اور وہ منہ کے بل رسوں پر گر پڑا اس کے بعد اس پہرے دار کو اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ شاہان نے کافی زور سے مکا مارا تھا۔ اور اسے مکا لگتے ہی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بھی آئی تھی یہی وجہ تھی کہ شاہان نے پہرے دار کے جسم کو لاش سمجھ لیا اور اسے پکڑ کر اندھیرے میں لے گیا وہاں لے جا کر اس کے کپڑے اتار کر خود پہنے اور سر پر لال رومال باندھا اپنے بالوں کو بکھیر دیا اور ہاتھ میں تلوار پکڑ لی شاہان کا رنگ گندمی تھا جیسے قدیم مصر کے لوگ کا ہوا کرتا تھا اس لئے وہ بڑی آسانی سے ڈاکو لگ رہا تھا۔ پھر ڈاکو کی لاش کو اسنے رسی کے گچھوں کے درمیان جو چھوٹا سا کنواں بن آیا تھا وہاں پھینک دیا تھا کیونکہ سمندر میں لاش پھینکنے سے آواز پیدا ہوتی اور ڈاکو خبردار ہو سکتے تھے۔

شاہان ڈاکو کے حلیے میں سیڑھیوں کے پاس آ کر پہرہ دینے لگا ناگنی کی لاش کے دونوں ٹکڑے رومال میں لپیٹ کر اس نے اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا اس نے سیڑھیوں میں جھک کر دیکھا کوئی اوپر آ رہا تھا شاہان جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور چل پھر کر پہرہ دینے لگا دل میں وہ آنے والے کو کوس رہا تھا کہ اس کمبخت کو بھی اوپر آنے کے لئے یہی وقت رہ گیا تھا کیونکہ اس وقت رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی آنے والا بھی ایک ڈاکو ہی تھا جو شاید نیچے کی گرمی سے تنگ آ کر اوپر کھرا ہوا میں سونے آ گیا تھا۔

شاہان نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ کہ کہیں اس کی آواز پر ڈاکو کو کوئی شک نہ ہو جائے ویسے بھی وہ آنے والے ڈاکو سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا آنے والا ڈاکو بھی ایک ہی تھا۔ آتے ہی اس نے شاہان سے کہا۔ "کیوں دوست صبح میرے سو روپے دے رہے ہوناں۔" شاہان کی بلا جانے کہ یہ کیسے سو روپے تھے جو وہ احمق ڈاکو اس سے یا اس پہرے دار سے لینا چاہتا تھا جس کی لاش رسوں کے درمیان پڑی تھی۔

اس نے معمولی سی ہوں آں کر دی۔ اس پر تو جیسے خبیث ڈاکو کو غصہ آیا غرا کر بولا۔

"یعنی تم مکر رہے ہو میں ابھی یہ خنجر تمہارے دل کے آر پار کر دوں گا بولو سو روپے دو گے یا نہیں۔ بولو۔" کمبخت ڈاکو کا پارہ ایک دم چڑھ گیا تھا۔ یہ تو سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتا تھا شاہان نے کہا۔

"دو گا ضرور دوں گا۔"

شاہان نے یہ جملہ اس لئے جلدی سے ادا کر دیا تھا کہ اس کا منہ بند ہو جائے گا اور یہ پرے ہٹ کر کھڑا ہو جائے گا لیکن اس بدنصیب کی بھی موت اسے بار بار آوازیں دے رہی تھی اس نے چونک کر کہا۔ "تمہاری آواز کیوں بدل گئی ہے تم کون ہو؟" اور پھر شاہان نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔

شاہان نے چونکہ ڈاکوؤں کا لباس پہن رکھا تھا اس لئے وہ ذرا آہستہ سے چل رہا تھا لیکن وہ چوکنا بھی

تھا کہ کسی پر اس کا راز نہ کھل جائے آمنے سامنے جو لکڑی کی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی تھیں وہ چار پانچ ہی تھیں ان میں خاموشی تھی ڈاکوؤں نے شاید ان کوٹھڑیوں میں بھی لوٹ کا مال رکھا ہوا تھا ڈاکو شاید نیچے والی منزل کے عرشے پر ہوادان کی ٹھنڈی ہوا کے نیچے سو رہے تھے کیونکہ وہاں کی اتنی تیزی ہوتی جتنی جہاز کے اوپر ہوتی ہے شاہان اس جگہ کی تلاش میں تھا۔ جہاں ان ڈاکوؤں نے عمارہ کو قید کر رکھا تھا وہ جگہ یا تو کوئی کوٹھڑی یا نچلی منزل کا گودام ہو ہی ہو سکتا تھا۔

شاہان نے فیصلہ کیا کہ پہلے جلدی جلدی ان کوٹھڑیوں کی تلاشی لی جائے ایک کوٹھڑی کے دروازے کو اس نے آہستہ سے اندر کی طرف دھکا دیا دروازہ تھوڑی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا اندر اندھیرا تھا شاہان نے اندر جا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

کوٹھڑی میں کوئی انسان نہ تھا۔ صرف بڑے بڑے ٹاٹ کے بنڈل تھے اسی طرح دوسری کوٹھڑی میں بھی لوٹ مار کا سامان پڑا تھا۔ تیسری کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے بند تھا شاہان کے دل میں شک ہوا کہ شاید اس کوٹھڑی میں ڈاکوؤں نے عمارہ کو قید کر کے باہر سے تالا لگا دیا ہوگا تالا کھولنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا اس نے تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر آہستہ سے جھٹکا دیا تالہ قبضے اور کنڈی سمیت اکھڑ کر شاہان کے ہاتھ میں آ گیا وہ کوٹھڑی میں آ گیا اندھیرے میں بھی اندر رکھے ہوئے مسافروں کے لوٹے ہوئے صندوق اور ریشمی کپڑوں کے تھان اور چاندی کے گلدان گلاب پاش اور پلنگ پڑے تھے عمارہ یہاں بھی نہیں تھی۔

شاہان اب چوتھی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا وہ تیسری کوٹھڑی سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک ڈاکو تلوار کمر میں لٹکائے جمائی لیتا اس کی طرف آ گیا۔ اور شاہان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رازداری سے بولا۔ چوری کرنا تھی دوست تو مجھے بھی ساتھ ملا لیتے اب تمہیں مجھے بھی حصہ دینا ہوگا نہیں تو میں ابھی سردار کو آواز دے کر بلا لیتا ہوں اور دوسرے لمحے تمہاری گردن کے بغیر لاش سمندر میں مچھلیاں کھا رہی ہوں گی۔"

شاہان نے آہستہ سے کہا۔ "میرے ساتھ اندر آؤ۔" اور شاہان اس تیسرے بدنصیب ڈاکو کو لے کر کوٹھڑی میں آ گیا یہ وہ ڈاکو تھے جنہوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کا سامان لوٹ کر ان کے اور ان کے بال بچوں کو ہلاک کیا ہوگا۔ ان پر کوئی بھی رحم نہیں کھا سکتا تھا کوٹھڑی کے اندر آتے ہی شاہان نے دروازہ بند کر دیا اور کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ وہ لڑکی کہاں ہے جو جنگل سے ملی تھی۔" ڈاکو نے کہا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم۔ تمہاری آواز ہمارے دوستوں کی طرح نہیں ہے تم تم کون ہو۔ اس نے پھر وہی حرکت کی جو اس سے پہلے اس کا ڈاکو بھائی کر چکا تھا۔

اندھیرے میں شاہان نے ڈاکو کی گردن کا نشانہ لے لیا تھا ڈاکو نے تو اپنی تلوار پوری طاقت سے دیوار پر دے ماری اور تلوار شاہان کی گردن سے ٹکرا کر ٹیڑھی ہو گئی تھی لیکن شاہان نے اس طرف دھیان نہ دیا اور بڑے سکون کے ساتھ شہ رگ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور پھر شاہان نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔

بہرحال شاہان سمجھ گیا کہ عمارہ دوسری منزل میں نہیں ہے اب پہلی منزل کا گودام ہی دیکھنا رہ گیا تھا شاہان اس قسم کے پرانے بادبانی جہازوں میں بہت سفر کر چکا تھا وہ جانتا تھا کہ کون سا راستہ کدھر کو جاتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے جہاز کی نچلی منزل پر آ گیا۔ یہاں ایک جانب وہ ڈیک تھا۔ جہاں ڈاکو سوئے ہوئے تھے اور خراٹے بھر رہے تھے دوسری جانب گودام تھا گودام کا دروازہ بند تھا اور باہر موٹا سا تالا لگا تھا۔ شاہان نے تالے کو اکھاڑ ڈالا کیونکہ ٹوٹنے سے آواز پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھول کر شاہان اندر چلا گیا۔ مگر یہاں بھی اندھیرا تھا پر شاہان کی نظریں اندھیرے میں بھی دیکھ لیا کرتی تھی گودام میں مختلف قسم کے کاٹ کباڑ پڑا تھا۔ کونے میں ایک پرانا سا پلنگ دکھائی دیا۔ جس پر کوئی اوندھے منہ پڑا ہوا تھا شاہان لپک کر پلنگ کے پاس گیا یہ عمارہ تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ شاہان

نے آہستہ سے اسے بیدار کیا۔

عمارہ نے آنکھیں کھول کر شاہان کو دیکھا اور اس کے ویران چہرے پر خوشی کی لہر پھیل گئی شاہان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ بولنا نہیں میرے ساتھ آؤ ۔عمارہ پہلے تو ڈاکوؤں کے لباس میں شاہان کو پہچان نہ سکی لیکن جب وہ اس پر جھکا تو وہ اس کی آنکھوں کی چمک کو فوراً پہچان گئی وہ پلنگ پر سے اٹھی اور شاہان کے پیچھے چلتی گودام سے باہر آگئی ڈاکو سو رہے تھے ان کے خراٹوں کی آوازیں اب چھت سے ٹکرا کر نیچے آرہی تھی شاہان عمارہ کو ساتھ لئے سیڑھیاں چڑھ کر جہاز کی دوسری منزل کے تنگ راستے میں سے گزرنے لگا اچانک ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور اندر سے جہاز کا سردار کسی کو گالیاں بکتا باہر نکلا۔

اس کی نظر جو عمارہ پر پڑی تو تلوار نکال کر گرجا۔ ”تم کو یہ کون اغوا کر کے لے جارہا ہے۔“ اس نے شاہان کو اپنا ہی ڈاکو سمجھا تھا۔ جو سردار کی امانت میں خیانت کر کے اسے اغوا کر کے لے جارہا تھا سردار نے تلوار کا بھرپور وار کیا۔ تلوار شاہان کے سر پر لگی اور ٹیڑھی ہوگئی سردار نے اپنی تلوار کو اور پھر شاہان کو حیرت سے دیکھا۔

”تم نے سر پر لوہے کا توا باندھ رکھا ہے۔“

”اب تیری موت آگئی ہے۔“ اور سردار نے شاہان کی گردن پر تلوار کا دوسرا وار کیا اس بار سردار کی تلوار کے دو ٹکڑے ہوگئے اس نے خنجر نکال لیا خوش قسمتی کی بات یہ ہوئی تھی کہ سردار نے ابھی تک اپنے ساتھیوں کو آواز نہیں دی تھی اگر وہ دوسرے ڈاکوؤں کو بھی بلا لیتا تو عمارہ کا مارا جانا یقینی تھا۔

شاہان نے سوچا کہ جتنی جلدی ہوسکے اس سردار کو ہلاک کردینا چاہئے تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو نہ بلا سکے۔

بس جب سردار نے خنجر نکالا تو شاہان نے ایک بازو اٹھا کر اپنا بھرپور ہاتھ سردار کی گردن پر مارا سردار کی گردن ایک دم ٹیڑھی ہوگئی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی وہ دھڑام سے گر پڑا اور شاہان نے نے عمارہ سے کہا۔

”جلدی سے اسے گھسیٹ کر اندر لے چلو۔“ دونوں مل کر سردار کی لاش کو گھسیٹ کر اس کے کیبن میں لے گئے لاش کو کیبن میں بند کر کے دونوں تیزی سے باورچی خانے کی طرف گئے وہاں مٹی کے تیل کا ڈرم پڑا تھا۔

شاہان نے نیچے عرشے سے اوپر آنے والا راستہ بند کردیا پھر اس نے مٹی کا تیل سارے راستے میں پھیلا دیا اور دو پتھروں کو ٹکرا ٹکرا کر ایک کپڑے کے ٹکڑے کو آگ لگائی اور وہ جلتا ہوا ٹکڑا آگ پر ڈال دیا۔

شاہان نے عمارہ کو ساتھ لیا اور جہاز کے لنگر پر سے اتر کر ساتھ والے تجارتی جہاز پر عمارہ کو چڑھایا اور خود کپتان کو لینے ساحل سے جنگل کی طرف بھاگا کپتان نے بھی شاہان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھا کہ شاید کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے شاہان یوں بھاگا چلا آرہا ہے قریب آکر شاہان نے کہا جلدی سے اپنے جہاز پر آؤ کپتان بھی اپنے جہاز کی طرف دوڑ پڑا۔ اس وقت ڈاکوؤں کے جہاز پر سے کہیں کہیں سے دھواں اٹھنے لگا تھا جب یہ لوگ اپنے جہاز پر پہنچے تو ڈاکوؤں کے جہاز کے اوپر والے دروازے میں سے آگ کا ایک شعلہ بھڑک کر باہر نکل آیا۔ ڈاکو اندر بند ہوگئے تھے وہ شور مچا رہے تھے اور دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کپتان نے شاہان کے ساتھ مل کر اپنے جہاز کا لنگر اٹھایا اور بادبان کھول دیئے پچھلے پہر کی ہوا چلنے لگی تھی، ہوا نے بادبانوں کو پھلا دیا اور جہاز چلنے لگا دوسرے جہاز کے ڈاکوؤں نے دروازہ توڑ دیا تھا اور جلتے ہوئے جہاز میں سے سمندر میں چھلانگیں مار رہے تھے اور کپتان کے جہاز کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سمندر کی لہریں انہیں قریب نہیں آنے دے رہی تھیں۔ ویسے بھی کپتان کے جہاز کی رفتار کچھ تیز ہوگئی تھی بہت جلد ڈاکوؤں کے جہاز کو آگ نے اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا تھا اس کے بادبان پھڑکنے لگے جیسے سمندر میں آتش بازی چل رہی ہو۔

شاہان عمارہ اور کپتان اپنے جہاز کے عرشے

پر کھڑے اس جلتے ہوئے جہاز کا نظارہ کر رہے تھے بحری ڈاکو جزیرے کی ساحل کی طرف تیرتے ہوئے جا رہے تھے کئی ایک اندر ہی جل کر سیاہ ہو گئے تھے کپتان نے کہا۔

"ان لوگوں کو خدا نے ظلم کی سزا دی ہے اب یہ اس جزیرے پر ہی اپنی باقی زندگی بسر کریں گے۔ کیونکہ اس طرف شاید ہی کوئی جہاز آتا ہے۔"

شاہان نے کہا۔"ہاں ...... ظلم کا بدلہ مل کر ہی رہتا ہے۔اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ کسی پر ظلم نہ کرے۔"

عمارہ بڑی خوش تھی کہ اب وہ اپنے وطن جا سکے گی شاہان نے کپتان سے پوچھا۔

"اس مقام سے اسپین کی بندرگاہ کا فاصلہ کتنی دور ہے۔اور انہیں وہاں تک پہنچنے میں کتنے دن لگ جائیں گے۔" کپتان نے شاہان کو بتایا۔

"اگر ہوا ٹھیک چلتی رہی اور راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو وہ پندرہ دنوں کے بعد اسپین پہنچ جائے گی۔"

جہاز میں کئی ماہ کا خوراک اور پانی موجود تھا۔

شاہان نے ناگنی کے جسم کو ایک صندوقچی میں بند کر کے جہاز میں اپنے کیبن میں رکھ دیا اور جہاز نے اسپین کی طرف اپنا لمبا سفر شروع کر دیا سمندری سفر آرام سے کٹ گیا۔

جہاز سولہویں دن اسپین کی بندرگاہ پر جا کر لگ گیا۔شاہان کو واپسی کی جلدی تھی وہ جتنی جلدی ہو سکے کوہ ہمالیہ کے ناگ مندر میں جا کر ناگنی کے کٹے ہوئے جسم کو مقدس تالاب میں رکھنا چاہتا تھا عمارہ اپنے وطن اسپین پہنچ گئی تھی اب اسے اپنے ماں باپ کے گھر پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی بندرگاہ سے ان کا گھر ایک دن کے فاصلے پر تھا ان کپتان نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ عمارہ کو اس کے گھر پہنچا دے گا شاہان نے عمارہ کو کپتان کے حوالے کیا اور اسی شام ایک ایسے سمندری جہاز میں سوار ہو گیا جو ہندوستان جا رہا تھا۔یہ ایک پرتگالی جہاز تھا جو ہندوستان جا رہا تھا رات کو اسپین کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر وہ دوسرے روز کھلے سمندر میں پہنچ گیا تیز ہوا کی وجہ سے جہاز کی رفتار بھی بہت تیز تھی جہاز کا کپتان بڑا ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھا وہ شاہان کا دوست بن گیا۔

شاہان نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے ہندوستان جا رہا ہے جہاز افریقہ، مڈغاسکر اور برما سے ہوتا ہوا ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر جا کر ٹھہر گیا یہی شاہان کی پہلی منزل تھی کالی کٹ اتر کر شاہان نے ایک رات ہوٹل میں قیام کیا اس کے پاس ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی جس میں ناگنی کی لاش پڑی تھی اور ایک چھوٹی ڈلی سونے کی تھی یہ ڈلی اس نے بازار میں جا کر فروخت کر دی جو رقم ملی اس کی مدد سے وہ ہمالیہ کے پہاڑوں کو جاتے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

سات دن بعد شاہان ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچا جہاں سے ہمالیہ پہاڑ کا سلسلہ شروع ہوتا تھا آج سے سو برس پہلے نہ موٹر گاڑیاں تھیں نہ بسیں تھیں مسافر گھوڑوں وغیرہ پر یا پیدل سفر کرتے تھے شاہان نے ناگنی کے لاش کے ٹکڑے صندوقچی میں سے نکال کر دوبارہ رومال میں ڈالے اپنی کمر کے گرد باندھ دیا اسی خیال سے کہ کہیں صندوقچی گم نہ ہو جائے جھیل ناگ مندر وہاں سے کافی دور بلند پہاڑیوں میں تھی وہاں تک جانے والا راستہ بڑا خطرناک تھا اور تنگ گھاٹیوں نوکیلی چٹانوں خطرناک چڑھائیوں اور برفانی علاقوں سے ہو کر گزرتا تھا شاہان کو ان سارے خطروں کا مقابلہ کرنا تھا۔اور وہ اس کے لئے تیار تھا۔

قصبے میں ایک رات بسر کرنے کے بعد دوسرے روز وہ ایک چھوٹے سے مندر میں پہنچا وہ ناگنی کے بارے میں یہاں سے کسی پجاری سے پوری معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا ان علاقوں میں وہ ہزار سال پہلے آیا تھا مگر تب سے لے کر اب تک زمانہ بدل گیا تھا پہلے والا مندر ڈھے چکا تھا اور اس کی جگہ دوسرا ناگ مندر بن گیا تھا پجاری تو شاہان کو نہ ملا البتہ وہاں سے ایک بوڑھا سادھو مل گیا۔

جب شاہان نے اسے بتایا کہ وہ مسلمان سیاح ہے اور ناگ مندر کی سیر کرنا چاہتا تھا ہے تو سادھو نے کہا۔

"بیٹا میں تمہاری ہمت کی قدر کرتا ہوں لیکن تم مسلمان سیاح کی حیثیت سے وہاں نہیں جاسکو گے۔"

"پھر میں کیا کروں۔"

"میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ناگ مندر میں صرف ہندو لوگ ہی جاسکتے ہیں۔" اس کے ساتھ شاہان کے دماغ میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ ایک ہندو جوگی بن کر وہاں کا سفر کرے پھر تو کوئی اس پر شک نہیں کرے گا اور وہ بھی پورے اطمینان سے اپنا مشن بھی پورا کرلے گا۔ شاہان وہاں سے واپس سرائے میں آگیا اسی روز شام کو اس نے سر منڈوالیا جسم کو موٹے سیاہ کمبل میں چھپایا ہاتھ میں ترشول لیا ہندو جوگی کا روپ بدل کر ناگ مندر کے لمبے اور خطرناک پہاڑی سفر پر روانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

اب شریم کی سنئے۔

شریم راج کماری کو لے کر اس کے باپ کی ریاست کے قریب پہنچ گیا تھا وہ ایک جنگل کی پگڈنڈی سے گزر رہا تھا۔ راج کماری ایک بیل گاڑی میں سوار تھی یہ بیل گاڑی شریم اور راج کماری نے راستے میں ایک دیہاتی سے لے لی تھی راج کماری بیل گاڑی چلا رہی تھی شریم اس کے ساتھ بیٹھا تھا شام کا وقت تھا جنگل میں اندھیرا ہو رہا تھا ایک دریا جنگل کے ساتھ درختوں سے دور ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا راج کماری اور شریم باتیں کرتے جا رہے تھے انہوں نے جنگل میں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنی شریم نے کہا۔

"خاموش بیل گاڑی کو درختوں کے نیچے کرلو۔"

ان کا خیال تھا کہ وہ یہ کچا راستہ چھوڑ دے تاکہ جو گھڑ سوار ادھر آ رہے ہیں وہ آگے گزر جائے۔

راج کماری نے بیل گاڑی سڑک سے اتار کر گھنے درختوں میں جھاڑیوں کی اوٹ میں کرلی بیل بڑے آرام سے گھاس کھانے لگا راج کماری کو لے کر شریم جھاڑیوں کے پاس آ کر بولا۔

"تم ان جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی رہو، میں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ یہ گھڑ سوار کون ہے؟" راج کماری کو اونچی جھاڑیوں کے درمیان چھوڑ کر شریم کچے راستے پر آ کر جدھر سے گھوڑوں کی آوازیں آئی تھی ادھر کو چلنے لگا۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلا ہوگا کہ تین گھڑ سوار بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے آئے اور جہاں راج کماری چھپی تھی وہاں سے قریب ہی درختوں کے نیچے جا کر رک گئے۔

گھوڑوں سے اتر کر انہوں نے ایک بڑا سا تھیلا کھول لیا اور اس میں سے چیزیں نکال نکال کر دیکھنے لگے شریم واپس مڑ کر ان گھڑ سواروں کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور تھیلے میں کیا دیکھ رہے ہیں؟

قریب جا کر شریم نے دیکھا کہ ان لوگوں نے تھیلے میں سے ایک انسانی سر باہر نکال رکھا تھا اور خنجر سے اس کی آنکھیں کھرچ کر نکال رہے تھے شریم ان لوگوں کے ظلم پر کانپ اٹھا۔

کس قدر پتھر دل لوگ تھے یہ خدا جانے کس کا سر کاٹ کر لے آئے تھے اور اب اس کی آنکھیں نکال رہے تھے شریم نے غور سے دیکھا۔

سر کسی عورت کا تھا کیونکہ سر پر لمبے لمبے بال بھی تھے شریم کے دیکھتے دیکھتے انہوں نے عورت کے کٹے ہوئے سر کی دونوں آنکھیں نکال کر پھینک دیں اور قہقہے مار کر ہنس پڑے وہ بڑے ہی خوش ہو رہے تھے یہ تینوں قاتل تھے ان کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی عورت کا ابھی ابھی سر قلم کر کے لائے ہیں اتنے میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

تینوں قاتل ہوشیار ہوگئے ایک نے دور درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس کٹے سر والی عورت کا خاوند ہے، آنے دو۔" دوسرے قاتل نے تلوار نکال کر کہا۔

"اس کا بھی سر کاٹ کر اس کی بیوی کے سر کے ساتھ لے جا کر فروخت کردیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے عورت کا خاوند تلوار لہراتا وہاں آن پہنچا۔

(جاری ہے)



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

صحرا گرد

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

اس سے پہلے کہ گولی نوجوان تک پہنچتی اس نے ایک عجیب درد ناک کراہ سنی اس غیر انسانی آواز نے نوجوان کو کرب و اذیت میں مبتلا کرکے دہلا کر رکھ دیا اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی اور پھر......

لفظ لفظ اور سطر سطر......خوف و ہراس کے گرداب میں......غوطہ زن......دل گرفتہ کہانی

میں ہوٹل کی بالکونی میں کھڑا ان واقعات کو یاد کر رہا تھا جسے اگر میں آپ سے بیان کروں تو آپ اسے میرے دماغ کا خلل سمجھیں گے۔ کوئی بھی سننے والا اس پر یقین کرنے کو کبھی تیار نہ ہوگا جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا۔ یہاں اس بالکونی سے سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہروں کا دھیما دھیما شور صاف سنائی دے رہا تھا اور چودھویں کے چاند کی روشنی میں قاہرہ شہر کی مسجدوں کے آسمان کو چھوتے مینار ایک مسحور کن منظر پیش کر رہے تھے لیکن میرا ذہن ماحول کے اس سحر کو پوری طرح محسوس نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ تو کئی برس پہلے پیش آنے والے واقعات کو دہرانے میں مصروف تھا۔ وہ واقعات جو کافی عرصہ میرے لیے ایک ڈراؤنا خواب بنے رہے۔ وہ واقعات جن کا میں ایک حصہ تھا مگر مجھے نہ جانے کیوں ان پر آج بھی یقین نہیں آتا کہ میں نے یہ سب کچھ اپنی

آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا۔

مجھے آج ایک لمبے عرصے بعد دوبارہ قاہرہ شہر میں آنے کا اتفاق ہوا۔ میں تو شاید اپنے بیتے وقت کی کسک کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے یہاں دوبارہ نہ آتا مگر حالات مجھے یہاں کھینچ لائے۔ مجھے یہاں کچھ کاروباری معاملات سلجھانے تھے۔ میرے جو حالات آج ہیں وہ اس وقت نہیں تھے۔ آج تو میرے بالوں میں سفیدی اتر چکی ہے اور رگوں میں بھی برف نے بسیرا کرلیا ہے مگر اس وقت میں نوجوان اور توانائیوں سے بھرپور تھا۔ مصر کے ریگ زار میرے قدموں کے نیچے تھے اور نظریں بلند اہراموں کی چوٹیوں پر۔

میں ایک فرانسیسی کمپنی میں ملازم تھا جس کا کام قدیم مصری فراعنہ کے مقابر کی تلاش تھا۔ میں اس کمپنی میں صرف پیسے کی خاطر شامل نہیں ہوا تھا بلکہ یہ میرا جنون تھا۔ مصری تاریخ میرے لیے ایک نشے کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں تاریخ کے ان سنگی اوراق کو اپنی آنکھوں اور ہاتھوں سے محسوس کرنا اور پڑھنا چاہتا تھا۔ صحرا میری زندگی کا خواب تھا جہاں میں ان دفن شدہ ڈھانچوں کو بے آرام کرنے کے لیے پھر رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ یہ کمپنی جس کے لیے میں کام کررہا تھا میرے اس نشے، اس جنون کو پورا نہیں کرسکتی اس لیے بعض اوقات میں اکیلا ہی صحرا گردی پر آمادہ ہوجاتا۔ جہاں کسی آثار قدیمہ کی بھنک پڑتی تو خود ہی اکیلا اس کی طرف چل پڑتا۔

بہرحال میں اس تفصیل سے آپ کو بور نہیں کروں گا کہ میں یہ کیسے کرتا بس اتنا بتانا کافی ہوگا کہ میرا جنون مجھے ایسے ٹیڑھے میڑھے صحرائی راستوں پر لے گیا جو قافلوں کی آمدورفت کے مروجہ راستوں سے بہت دور تھے۔ میری عمر اس وقت بمشکل بیس بائیس سال ہوگی۔ اس عمر میں انسان کسی رکاوٹ، کسی مشکل کی پرواہ نہیں کرتا اور دنیا اسے ایک لذیذ شیریں پھل کی طرح نظر آتی ہے۔ یہی ان دنوں میرا حال تھا لیکن مجھے تجربے نے وہ سکھایا جو رڈیارڈ کپلنگ نے سیکھا تھا یعنی

"مشرق مشرق ہے"۔

انہی دنوں میرا سامنا مصر کے اس فسوں سے ہوا جس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا مگر اس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ میں نے اس فسوں کو بچشم خود دیکھا ہے۔ میں تو اسے جادو ہی کہوں گا جس پر کوئی ایسا شخص یقین نہیں کرے گا جو دنیا کو عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس چیز کو بیان نہیں کیا جاسکتا وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ یہی وہ چیز ہے جو آج میں آپ کو بتانے جارہا ہوں اور مجھے یہ بتانے میں خوشی ہورہی ہے کیونکہ میں ان کو بتارہا ہوں جو اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

آج میرے سارے بال سفید ہوچکے ہیں لیکن اس وقت ایک بھی بال سفید نہ تھا اور میں ایک تھکا دینے والے دن کے اختتام پر عرب بدوؤں کے ایک قبیلے میں پہنچا۔ میں سارا دن تپتے ریگ زاروں میں پیدل چلتا رہا تھا میری منزل کوئی اور تھی مگر جہنم کی آگ برساتے سورج کے نیچے صحرا کی تپتی ریت پر سفر کرتے ہوئے میں اپنا راستہ کھوچکا تھا۔ میں اکیلا سفر کررہا تھا۔ دن بھر صحرا کی ریت پر اس بے رحم سورج کے رحم و کرم پر میں شام کو اس نخلستان میں پہنچ گیا تھا۔

وہ بدو عرب تھے ایک ایسا قبیلہ جس کی خانہ بدوشوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہ تھی مگر آپ جانتے ہی ہوں گے کہ عرب فطرتاً بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور یہ قبیلہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس قبیلے کے شیخ کے خیمے کا دروازہ ہر مسافر کے لیے کھلا تھا۔ میں آگے بڑھا اور قبیلے کے سردار شیخ سعید محمد کو سلام کیا جس نے روایتی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ نہادھوکر جب میں تازہ دم ہوگیا تو دنبے کے بھنے ہوئے لذیذ گرما گرم گوشت سے میری دعوت کی گئی۔ اس کے بعد خوشبودار قہوے کی چسکیوں نے میری ساری تھکان اتار دی۔ شیخ سعید میرے سفر کی روداد پوری دل چسپی سے سنتا رہا۔ مصر میں ایک عرصے کی صحرانوردی نے مجھے عربی زبان بڑی اچھی طرح سکھا دی تھی اور اب تو میں اسے اہل زبان کی طرح ہی بولتا

تھا۔ جب رات کی خنکی اترنے لگی تو شیخ نے میرے لیے ایک علیحدہ خیمہ نصب کروا دیا۔

یہ صحرا کی مہمان نوازی تھی۔ ایک نیزہ شیخ کے خیمے کے باہر ریت میں گڑا رہتا جو اس بات کا اعلان تھا کہ جو کوئی بھی مہمان کو گزند پہنچانے کی کوشش کرے گا پہلے اسے شیخ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ مصر کے ریگ زاروں میں شام کا دھندلکا کیسے اترتا ہے۔ ابھی آسمان صاف اور چمک دار ہے اور اگلے ہی لمحے وہ پورا نارنجی رنگ میں نہا جاتا ہے اور پھر فوراً ہی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ستارے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ مخملی بنفشی رات اپنی بھرپور جوانی اور نشے سمیت اتر آتی ہے۔ اس رات بھی اس دور دراز تنہا صحرا میں رات اترنے کا یہ سحر انگیز اور دل کش نظارہ میری پوری توجہ سمیٹے ہوئے تھا اور خاموشی کی زبان میں روح سے باتیں کر رہا تھا۔

میرا خیمہ مہمان نوازی کی روایات کے مطابق قبیلے کی سرحد پر نصب کیا گیا تھا جس کا پردہ اٹھا ہوا تھا اور میں اس سحر انگیز رات کی شوخ جوانی کو اپنی آنکھوں میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ اس چھوٹے سے نخلستان کے چار یا پانچ کھجور کے درخت نظر آرہے تھے جن سے پرے دور دور تک ریت کا آبنوسی قالین بچھا ہوا تھا جو دور تک جا کر افق سے مل جاتا تھا۔ کچھ اونچے نیچے ٹیلے نظر آرہے تھے جن پر ہزاروں لاکھوں جگنوؤں کی مانند جگمگاتے، ٹمٹماتے ستارے عجیب نشہ کر رہے تھے۔ یہ ان خانہ بدوش بدوؤں کے لیے شاید معمول کی بات تھی مگر میں پوری طرح اس کے سحر کا شکار تھا۔

لیٹے لیٹے اچانک میں اٹھ کر بیٹھ گیا رات سے میری توجہ ہٹ گئی کیونکہ مجھے دور ایک ٹیلے کے اوپر کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا کچھ ہی دیر بعد میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی شخص ہے جو ٹیلے سے نیچے اتر رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا وہ آہستہ آہستہ قریب آرہا تھا۔ اس کی چال میں ایک عجیب سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ جب وہ اِدھر سے اُدھر لہراتا ہوا چلتا تو اس چاندنی رات میں عجیب سا نظارہ بنتا۔ وہ ایک لمبی پھٹی پرانی عبا میں ملبوس تھا اور یوں چل رہا تھا جیسے بہت کمزور اور لاغر ہو۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا وہ گہرے گندمی رنگ کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ مخروطی چہرہ اور زرد آنکھیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا خیموں کی طرف ہی آرہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا یوں لگا جیسے پڑاؤ کا ہر کتا اس کی آمد سے باخبر ہو گیا ہو۔ انہوں اکٹھے ہو کر اس کو گھیر لیا۔ میں نے ایسا نظارہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ لاغر بوڑھا ان کتوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی سے ڈرانے لگا مگر کتے تعداد میں زیادہ تھے اور چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھا ایک طرف ہٹتا ہوا میرے خیمے کی طرف آیا اور پھر عین دروازے پر پہنچ کر ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ گر گیا۔ میں اٹھ کر خیمے کے باہر لپکا۔ اس اثناء میں کئی دوسرے لوگ بھی اپنے خیموں سے نکل کر اس کی طرف بڑھے مگر میں سب سے پہلے وہاں پہنچا اور بوڑھے کی گری ہوئی لاٹھی اٹھا کر کتوں کو ڈرا دھمکا کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد میں جھکا اور اجنبی بوڑھے کا سر تھوڑا سا اوپر اٹھا کر اس کو سہارا دیا۔ ایک ہلکی سی آواز اس کے حلق سے نکلی اور اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی کچی مٹی کی ایک صراحی خیمے کے دروازے کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ میں فوراً صراحی تک پہنچا اور اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ پیالے میں پانی ڈالا اور بوڑھے کے منہ میں ٹپکانے لگا۔

ہجوم میرے ارد گرد بالکل خاموش کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے خاموش نیم وا نگاہوں سے میرا شکریہ ادا کیا۔ پانی پینے کے بعد بوڑھا میرے بازوؤں کا سہارا لیتا ہوا دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے کو یوں اٹھتے دیکھ کر ارد گرد کھڑے عرب بدو میرے بارے میں داد و تحسین کے نعرے بلند کرنے لگے جو میں عربی زبان اچھی طرح جاننے کے باوجود بھی سمجھ نہیں سکا کیونکہ یہ الفاظ میرے لیے اجنبی تھے۔ عین اسی وقت شیخ سعید محمد وہاں پہنچ گیا اور ہجوم کو چیرتا ہوا

آگے آیا چیتھڑوں میں ملبوس بوڑھے شخص کو احترام سے سلام کیا اور اس سے حال احوال پوچھنے لگا۔ اس شخص نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنا سر ہلایا اور دوبارہ پانی کی صراحی کی طرف اشارہ کیا اور اشارے سے ہی کھانے کا مطالبہ کیا۔

جلد ہی اس کے لیے کھانا آگیا۔ وہ بار بار بے صبری سے غٹاغٹ پانی پی رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آس پاس کھڑے عربوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے ہاتھ سے اپنی بھنوؤں، اپنے لبوں اور سینے کو چھو کر مجھے سلام کیا اور ایک طرف چل پڑا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے ایک بھی لفظ نہیں بولا تھا۔ قبیلے کے کتے ایک دفعہ پھر بھونکنا شروع ہوگئے۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے اس شخص کو جاتا دیکھ رہے تھے جو جلد ہی صحرا کی اندھیری وسعتوں میں گم ہوگیا۔ جب سارے لوگ پلٹ کر اپنے خیموں میں جانے لگے تو شیخ سعید محمد نے میرا ہاتھ تھام لیا اور نہایت سیدھے اور متاثر کن الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا کہ میں نے اس کے اس اجنبی مہمان کی خاطر مدارت اور دیکھ بھال کی۔ یہ بدوی شیخ شیر کی طرح بہادر اور عورت کی طرح نرم دل تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔

اچانک ہمیں دور صحرا میں اس مجہول بوڑھے آدمی کے تعاقب میں بھاگنے والے کتوں کی غراہٹیں سنائی دیں اور پھر فوراً یہ غراہٹیں گیدڑوں کی چیخوں میں بدل گئیں۔ ایسی کرب ناک اور ہولناک چیخیں میں نے صحرا کی وحشتوں میں پہلے کبھی نہیں سنی تھیں پھر اچانک یہ آوازیں بھی تھم گئیں مگر وہ کتے واپس نہیں آئے۔ میں نے شیخ کو مخاطب کرنا چاہا۔ اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ شاید جا چکا تھا اس لیے میں بھی اس واقعے پر سوچتا اور حیران ہوتا ہوا واپس اپنے خیمے میں داخل ہوگیا۔ لیٹتے ہی نیند کے جھونکے آنے لگے مگر میرا ذہن اس پیلی آنکھوں والے آوارہ گرد سیلانی کے گرد گھوم رہا تھا پھر نجانے کب مجھے نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں کتنی دیر سویا کچھ اندازہ نہیں مگر جب آنکھ کھلی تو سحر کی ٹھنڈی انگلیاں صحرا کے سینے کو گدگدا رہی تھیں۔ جھٹپٹے کی روشنی خیمے میں پھیل چکی تھی اور کوئی چیز خیمے کے پردے کو کھرچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ اپنا ریوالور اٹھایا اور لپک کر خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھایا اور باہر جھانکا۔ ایک سایہ سا خیمے کے پیچھے کھسکتا محسوس ہوا۔ میں نے سمجھا یہ پڑاؤ کا کوئی کتا ہوگا جو کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں یہاں بھٹک رہا تھا۔ میں مطمئن ہو کر واپس مڑنے ہی والا تھا کہ اسی وقت صبح کے سناٹے میں ایک ہلکی سی آواز سنی۔ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو محسوس ہوا کہ صبح کے اس دھندلکے میں کچھ دور مشرق کی جانب ایک تنہا سایہ کھڑا تھا۔ ان دنوں جوانی کی طاقت کا نشہ تھا۔ بیس بائیس سال کی عمر میں سب ہی بہادر ہوا کرتے ہیں۔ اپنا لبادہ شانوں پر اوڑھتے ہوئے میں اس سائے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا جب اس سائے نے ایک ہاتھ سے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں فوراً پہچان گیا کہ یہ وہی پراسرار اجنبی تھا جو رات میرے خیمے کے سامنے گرا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا اس نے مجھے بیدار کیا ہے۔ اس نے کچھ بولنے کی بجائے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس کی خاموشی عجیب سی لگی مگر میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا تھا۔ اب اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور مڑ کر پڑاؤ سے دور ایک طرف چلنے لگا۔ میں بھی بنا سوچے سمجھے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اگرچہ معمول کے مطابق پڑاؤ کے گرد محافظوں کا پہرہ تھا مگر اس وقت حیرت انگیز طور پر کوئی محافظ ہمارے سامنے نہ آیا۔ پڑاؤ سے کچھ دور جا کر وہ بوڑھا رکا اور میری طرف مڑا۔ اس نے اپنی خمیدہ انگشت سے ایک دفعہ پڑاؤ اور پھر میری طرف اشارہ کیا اور اس کے بعد اُس شاہراہ کی طرف اشارہ کیا جو دریائے نیل کے کنارے تک جاتی تھی۔

اس کی اس حرکت سے میں نے اندازہ لگایا کہ

یا تو وہ گونگا ہے یا پھر خاموش رہنا پسند کرتا ہے اس لیے میں پوچھنے لگا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میں پڑاؤ کو چھوڑ کر اس طرف چلا جاؤں۔"

میری بات سن کر اس کی عجیب اور زرد آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"فوراً؟۔۔۔۔" میں نے پھر پوچھا۔ دوبارہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟۔۔۔" میں نے زچ سا ہو کر پوچھا۔

اس نے ایک بار پھر مجھے خاموشی کی زبان میں سمجھانے کی جو کوشش کی اس کا مطلب تھا کہ مجھے اس پڑاؤ میں جان کا خطرہ ہے اور مجھے سورج طلوع ہونے سے پہلے ان بدوؤں سے دور چلے جانا چاہیے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس اجنبی کی سنجیدگی کا کیا عالم تھا مگر میں نے اسے پاگل ہی سمجھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا اور ناگواری ہاتھ ہلاتے ہوئے مڑنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت میں نے اس کی عجیب آنکھوں میں عجیب سی افسردگی دیکھی جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا، مڑا اور صحرا کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں نے جو راستہ چنا تھا وہ آگ کی طرف جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی خیمے میں جا کر دوبارہ سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا دور پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج آگ برساتا طلوع ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ گونگے بوڑھے سے صبح سویرے ملاقات مجھے ایک خواب کی طرح محسوس ہو رہی تھی میں سوچنے لگا کہ شاید یہ خواب ہی تھا مگر مجھے اس پر زیادہ غور وفکر کرنے کی مہلت نہ ملی کیونکہ اچانک ہی خیمے کے باہر ایک عجیب اور پرشور سی ہلچل شروع ہو گئی تھی۔

میں نے فوراً باہر جا کر صورت حال جاننے کی کوشش کی۔ جو کچھ میں نے باہر دیکھا اسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں اپنی جگہ جم سا گیا اور ساکت اس کی طرف دیکھنے لگا کیا آپ جانتے ہیں سموم کیا ہے؟ صحرائی لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں اس روز یہ میرے سامنے تھا۔ اپنی صحرائی زندگی میں میں نے اس کے متعلق سنا بہت تھا مگر آج میرا واسطہ اس سے پڑ ہی گیا تھا۔ یہ طوفان اس قدر شدید تھا کہ ریت کی ایک بلند دیوار سی تن گئی تھی اتنی بلند کہ سورج اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ یہ دیوار اتنی دبیز تھی کہ سورج کی روشنی اس میں سے کوئی راہ نہ پا رہی تھی اور دن میں رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

ریت کے اس طوفان میں مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ چونکہ مجھے پہلے کبھی اس طوفان سے واسطہ نہ پڑا تھا اس لیے اس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر مجھے معلوم نہ تھیں میں یونہی ہونقوں کی طرح کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا مگر مجھے احساس ہوا کہ یہ عرب بدو اس صحرائی طوفان کے لیے پہلے سے تیار تھے کیونکہ ان کے گھوڑے، اونٹ اور گدھے ایک محفوظ جگہ پر مضبوط رسی سے باندھ دیے گئے تھے۔ خود انہوں نے سر اور منہ اپنے رومالوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور ادھر ادھر بھاگ کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔ اڑتی ریت میری آنکھوں کو اندھا کر رہی تھی۔ مجھے سانس لینا بھی دشوار تھا کیونکہ میں اپنے حلق میں ریت بھرتی محسوس کر رہا تھا۔ ان عرب بدوؤں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے سر اور منہ پر کپڑا لپیٹ لیا اور کھجور کے ایک درخت کے پیچھے دبک گیا۔ اس وقت میں سوچنے لگا کہ شاید یہی وہ خطرہ تھا جس سے مجھے اس گونگے بوڑھے نے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی اور میں اس کی بات مان کر اس سے بچ سکتا تھا۔ اگر میں اس کی بات مان کر سورج نکلنے سے پہلے یہ قبیلہ چھوڑ کر دریائے نیل کی طرف نکل جاتا تو اس وقت کسی گاؤں میں پناہ حاصل کر چکا ہوتا۔ مگر پھر میں سمجھ گیا کہ یہ طوفان ایک چھوٹا خطرہ تھا شاید اصلی خطرہ ابھی کہیں آگے تھا کیونکہ کچھ ہی دیر میں طوفان گزر گیا اور پڑاؤ میں موجود ہر شخص اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

طوفان گزر جانے کے بعد پڑاؤ کو دوبارہ ترتیب

دیا جانے لگا۔ ہر چیز کو واپس اپنی مقررہ جگہ لے جایا گیا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا، کپڑے جھاڑے، منہ سے رومال ہٹایا اور اپنے خیمے کی طرف دیکھنے لگا جو ہوا کے زور سے اکھڑ چکا تھا۔ شیخ کے آدمی اب اسے دوبارہ نصب کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے اسے دیکھا۔ وہ شیخ سعید محمد کے خیمے سے باہر آئی تھی اور ایک ریت آلود غالیچہ جھاڑنے لگی۔ اس کا لباس کچھ زیادہ قیمتی نہ تھا مگر اس کے گلے میں پڑا چاندی کا ہار سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا اور اس کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کررہی تھی۔ سر کے بال گندھے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں چاندی کی ہی پازیب تھی جو اس کے ہر حرکت پر چھنک چھنک جاتی۔ اگلفتہ دہن، اٹھتی ہوئی ناک، چمکتی ہوئی غزال آنکھیں، بھری بھری جوانی اور جوانی کا اٹھتا ہوا جوبن۔ میں کسی مسحور کی طرح بے خود کھڑا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سانس رک گیا ہو۔

اسی وقت دھوپ میں اس کی آنکھیں چمکیں اور مجھے یوں لگا جیسے پراسرار تاریکیوں کے دو تالاب ہیں جن میں مجھے اپنا آپ جھلملاتا نظر آرہا تھا۔ اس نے شاید میری نظروں کی بے باکی کو محسوس کرلیا تھا اور نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں بے خودی کے عالم میں اپنی طرف متوجہ پا کر اس عرب دوشیزہ کے چہرے پر حیا کی لالی نمودار ہوئی اور اس نے فوراً نقاب کا ایک سرا کھینچ کر اپنے چہرے کو ڈھک لیا پھر وہ مڑی اور بھاگ کر خیمے کے اندر گم ہوگئی۔

ایک نظر صرف ایک نظر اس نے میری طرف دیکھا تھا مگر محبت کے یونانی دیوتا کیوپڈ کا تیر بھی ان نظروں کے سامنے کند تھا۔ جب وہ چلی گئی تو مجھے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی اس لیے میں واپس اپنے خیمے میں آگیا جو اس وقت تک دوبارہ نصب کردیا گیا تھا اور اس کی تمام اشیاء بھی اپنی مقررہ جگہ پر رکھ دی گئی تھیں۔ میں باقی کا سارا دن وہاں لیٹا ان دو سیاہ آنکھوں کے متعلق سوچتا رہا مگر شام ڈھلنے کے بعد جب صحرا میں کتے بھونکنے لگے تو مجھے وہ بوڑھا گونگا ابھی یاد آگیا جس نے مجھے یہ جگہ چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر مجھے اپنے جسم کا انگ انگ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ میں دوبارہ لیٹ گیا اور پھر نجانے کب سو گیا مگر اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو میرا جسم تپ رہا تھا مجھے بخار ہوچکا تھا۔

شیخ سعید محمد خود میری خیریت دریافت کرنے آیا اور اس نے حکم دیا کہ میری تیمارداری اچھے طریقے سے کی جائے۔ میں صحرا میں سفر کرنے کے دوران اپنے ساتھ دوائیوں کا انتظام ضرور رکھتا تھا جو آج میرے کام آ رہا تھا۔ شیخ سعید محمد کے غلام اور کنیزیں تھوڑی دیر بعد میری خبرگیری کررہے تھے مگر اس کے باوجود بخار اترنے میں تین دن لگ گئے۔ میں اس دوران میں اپنے خیمے میں ہی آرام کرتا رہا۔ شیخ سعید محمد کی کنیزیں میرے لیے کھانا اور قہوہ وغیرہ لے کر آتیں۔ ان کے چہروں پر باریک ریشمی نقاب ہوتے مگر ہر ایک اپنے حسن اور جوانی سے علیحدہ علیحدہ پہچانی جاتی مگر وہ نہ آئی جس کا مجھے انتظار تھا اور جس کی غیر موجودگی مجھے واقعی بیمار بنارہی تھی۔ جس کی سیاہ غزال آنکھیں میرے خوابوں کا محور بن چکی تھیں۔ وہ سیاہ آنکھیں جو میرے خوابوں میں ستاروں کی طرح چمکتیں۔ میں اپنے خیمے کے دروازے پر اس کے چھوٹے چھوٹے برہنہ پاؤں کی آہٹ کا منتظر رہا مگر بے سود۔ چوتھے روز جھٹپٹے کا عالم تھا اور میں بستر پر لیٹا اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ آگئی۔ اس کے ہاتھوں میں یخنی کا ایک پیالہ تھا جو شیخ سعید محمد نے بطور خاص دنبے کے گوشت سے بنوا کر میرے لیے بھجوائی تھی۔ وہ خیمے کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس کے پیچھے ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کے دل کش اور مسحور کن سراپے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ سورج کی یہ کرنیں اس کے پاؤں تلک لبادے میں اس کے جسم کا ہر ایک زاویہ، ہر ایک خط نمایاں کررہی تھیں۔ میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا اور پھر اس قدر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ جیسے ابھی

بہترین دعا

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں کیں۔ ہم ان میں سے کوئی بھی یاد نہ رکھ سکے۔ ہم نے کہا: ’’حضور! آپ نے اتنی دعائیں کی ہیں کہ ہمیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔‘‘

آپؐ نے فرمایا۔ ’’میں کیا تمہیں وہ دعا نہ بتادوں جو تمام دعاؤں کی جامع ہو۔ تم یہ کہا کرو۔

’’اے اللہ! ہم تجھ سے وہ تمام اچھی چیزیں مانگتے ہیں جو تیرے نبی کریمؐ نے تجھ سے مانگیں اور ان تمام برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں جن سے تیرے نبی کریمؐ نے پناہ مانگی۔ تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور تو ہی مدد کرنے والا ہے۔ اور کوئی اور حرکت و طاقت تیری رضا کے بغیر نہیں ہوتی۔

(محمد ارمان ملک۔ٹنڈو آدم)

ہوا خوری کے لیے باہر نکلا تو میرے قدم مجھے اس چشمے تک لے گئے۔ زیادہ تر عورتیں پانی بھر کر جا چکی تھیں۔ چند ایک پانی سے بھرے گھڑے اپنے سر یا کولہے پر ٹکائے واپسی کا ارادہ کررہی تھیں ان میں سکینہ بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے قدم سست ہوگئے۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تو وہ پہلے تو جھجکی پھر رک گئی اور اپنا گھڑا اس نے چشمے کے کنارے پر رکھ دیا۔ دوسری عورتیں آگے نکل چکی تھیں انہوں نے سکینہ کے رکنے کی کوئی پرواہ نہ کی اور چلتی گئیں۔ یہ میرے لیے بہتر تھا۔ میں سکینہ کے قریب پہنچا تو وہ کھڑی مجھے دیکھتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔

’’تمہارا نام سکینہ ہے نا۔۔۔؟‘‘ میں نے جانتے بوجھتے اس کا نام پوچھا۔ جواب میں اس نے بجائے کچھ کہنے کے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’کیا تم گونگی ہو۔۔۔ بولتی نہیں ہو۔؟‘‘ میں پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ لہو کی گردش جسم کی حرارت کو بڑھانے لگی کیونکہ باریک نقاب کے پیچھے اس کی روشن آنکھیں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ وہ بدوی حور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور یخنی کا چوبی پیالہ میرے قریب رکھ دیا۔ میری بے باک نگاہیں اس کے نقاب زدہ چہرے کا طواف کررہی تھیں مگر اس کی لانبی سیاہ پلکیں اس کے رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں وہ مجھ سے نگاہیں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ کچھ بے تاب اور مضطرب سی تھی اور جلدی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید وہ میری موجودگی سے بے چین تھی۔ بنا کچھ بولے پل بھر بعد وہ اٹھی اور جانے کے لیے مڑی تو میں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور پھر ہاتھ چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ تو چلی گئی مگر میری روح بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ میں کافی دیر تک لیٹا اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ کھانے پینے کا ہوش بھی نہ تھا۔ صرف اس کی آنکھوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ جوانی کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جوانی ہوتی ہی بے اصول ہے جب درختوں پر پھل پکتے ہیں تو ان کو توڑنا گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ صحرائی بدوی لڑکیاں اس عمر میں جوان ہوجاتی ہیں جب شہروں میں رہنے والی لڑکیاں ابھی بچیاں ہی ہوتی ہیں اور سکینہ جس کی مخمور نگاہیں مردوں کی روح تک اتر جائیں وہ ابھی صرف سترہ برس کی تھی مگر صحرا کی کھلی فضاؤں نے اسے مکمل جوان بنادیا تھا۔ دوسری کنیزوں سے مجھے اس کا نام معلوم ہوگیا تھا اور یہ بھی کہ وہ شیخ سعید محمد کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

یہ عرب قبیلہ بہار کے آغاز سے یہاں اس نخلستان میں خیمہ زن تھا۔ یہاں کھجوروں کے اچھے خاصے درخت تھے اور ان درختوں کے بیچ ایک قدرتی چشمہ بھی تھا جہاں غروب آفتاب کے وقت قبیلے کی عورتیں نقاب اوڑھے اور اپنے سروں پر گھڑے اٹھائے پانی بھرنے آیا کرتی تھیں۔ اس روز شام کے وقت میں

نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا تو اس بار بھی اس کا سر نفی میں ہلا۔ اس کی اس حرکت پر میں کھلکھلا کر ہنس پڑا تو وہ بھی ہنسنے لگی۔ پھر جیسے اس چشمے کے کنارے جلترنگ بج اٹھے ہوں وہ ایک دم بولی۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو وہ کچھ پریشان سی ہوگئی کیونکہ میرے نام کا تلفظ ادا کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ میں نے اس کو اپنا نام بولنا سکھایا۔ کتنا میٹھا لگ رہا تھا اس کے شیریں لبوں سے میرا نام۔ یہیں سے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ چشمہ خیموں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن ہماری ملاقاتوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ سکینہ روز سب سے آخر میں پانی بھرنے آتی اسی وقت میں بھی ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچ جاتا۔ میں دھیرے دھیرے اس پر اپنے دل کا حال کھول رہا تھا مگر وہ ابھی تک خوف زدہ ہرنی کی مانند ایک فاصلہ رکھے ہوئے تھی۔ سکینہ کا بھائی اور شیخ سعید محمد کا بیٹا اس قبیلے کا بہترین شہسوار تھا۔ اس کے پاس سفید رنگ کی ایک شاندار گھوڑی تھی جس کا نام اس نے شب دیز رکھا تھا۔ وہ اس گھوڑی کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ یہ گھوڑی تھی بھی بہت خاص النسل، اس نے دوڑ کے کئی مقابلے جیتے تھے۔ اس صحرا میں اس کے مقابلے کا کوئی اور جانور نہیں تھا۔ میں نے ایک منصوبے کے تحت روزانہ سکینہ سے اس گھوڑی کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ یہ موضوع سکینہ کے لیے بھی دل پسند تھا وہ بھی اپنے بھائی ک اس گھوڑی پر بہت فخر کرتی تھی۔ اس موضوع کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ کھلنے لگی، اس کی جھجک ختم ہونے لگی اور وہ مجھ سے بے تکلف ہوگئی۔ اب وہ بے دریغ اپنے دل کی ہر بات مجھے بتاتی تھی۔ میرے اس منصوبے کو مکمل ہونے میں دو ہفتے لگ گئے۔

اس شام میں نے سکینہ کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم پریشان سی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے امید اور شبہات ایک ساتھ جھلکنے لگے اور وہ پوچھنے لگی۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟......"

"انسان کا ارادہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے اور اگر تم میرا ساتھ دو تو پھر یہ کچھ بھی ناممکن نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ کچھ مطمئن سی ہوگئی اور میرا بازو تھامتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پانی سے بھر گھڑا اٹھایا اسے اپنے کولہے پر رکھا اور مسکراتے ہوئے واپس چل دی۔

☆......☆......☆

اس رات پو پھٹنے سے ایک گھنٹہ قبل میں نے شب دیز نامی اس گھوڑی کی اونٹ کے بالوں سے بنی رسی کاٹ دی اور چپ چاپ اس کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔ اس کام میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ وہ پہرے دار جو اس رات پڑاؤ کے پہرے پر تھے مدہوش پڑے تھے۔ انہیں اپنی کوئی خبر نہ تھی۔ سکینہ نے اپنا کام بخوبی سرانجام دیا تھا۔ معمول کے مطابق اس رات پہرے داروں کے لیے شراب کے جو جام بھیجے گئے تھے ان میں سکینہ نے نہایت ہوشیاری سے اسے بے رنگ محلول کے چند قطرے ٹپکا دیے تھے جو میں نے اسے اپنی ادویات کی پوٹلی سے نکال کر دیا تھا۔ یہ چند قطرے انہیں صبح تک سلانے کے لیے کافی تھے۔ پہرے داروں کے علاوہ پڑاؤ کی نگرانی پر کتے بھی موجود تھے مگر اب وہ اس پڑاؤ میں میری موجودگی سے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ رات کو بھی مجھے دیکھ کر نہیں بھونکتے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اس سفید گھوڑی پر زین کسی، ضروری سامان خرجین میں رکھا اور پڑاؤ سے ایک ڈیڑھ میل دور نکل کر ایک ٹیلے کی اوٹ میں رک گیا۔ چاروں طرف خاموش ریت پھیلی ہوئی تھی۔ میں شب دیز کے پہلو میں کھڑا تھا اور میرے کان کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ میں پوری طرح چوکنا تھا اور میری توجہ چاروں طرف تھی۔ میں ان عرب بدوؤں کو اچھی طرح جانتا تھا جو اپنی خون آشامی اور کینہ پروری کے لیے دنیا بھر میں مشہور اور بے مثال تھے۔ ان سے بچ کر نکلنا بہت مہارت کا کام تھا۔ مجھے ابھی تک بہت آگے نکل جانا چاہیے تھے مگر مجھے کسی کا انتظار تھا جس نے میری خاطر اپنی زندگی داؤ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

پرلگادی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے چھوٹے قدموں کے ساتھ بے آواز بھاگتی ہوئی ایک ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور آتے ہی میری بانہوں میں سما گئی۔ جب صبح کے سورج کی پہلی کرن صحرا کی ریت پر چمکی اس وقت تک شب دیز ہمیں لے کر پڑاؤ سے کافی دور نکل چکی تھی مگر اب بھی وہ جگہ جہاں میں پناہ لینا چاہتا تھا ہم سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا اور وہ سفید گھوڑی اپنی پوری رفتار سے ابھی بھی بگٹٹ بھاگے چلی جارہی تھی۔ ریت اس کے سموں کے نیچے دھول کی مانند اڑ رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اونٹ ریگستان کا جہاز ہے اور وہ ریت میں زیادہ اچھے طریقے سے سفر کرسکتا ہے۔ یہ درست ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ گھوڑا ریت پر بھی اونٹ سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرسکتا ہے۔ اونٹ کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوتی ہاں وہ زیادہ لمبے عرصے تک سفر کرسکتا ہے اور اس وقت میرا مسئلہ فاصلے کا نہیں وقت کا تھا اس لیے یہ گھوڑی ہی ہمیں ہماری منزل تک پہنچا سکتی تھی۔ مجھے صحرائی راستوں کا بخوبی علم تھا اور ان راستوں پر مجھے کئی ایسی خفیہ جگہوں کا پتہ تھا جو ہمیں چھپا سکتی تھیں۔ ایک بار میں قاہرہ پہنچ جاتا تو پھر کوئی خطرہ نہ تھا۔

دور ریت کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی سیاہ رنگ کی چٹان نظر آرہی تھی جو ایک قدرتی دیوار کی مانند کھڑی تھی۔ اس چٹان میں جگہ جگہ غاروں کے دہانے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ قبل از تاریخ کے مقابر ہیں۔ یہ علاقہ بالکل بنجر تھا کہیں ہریالی نظر نہیں آرہی تھی۔ چاروں طرف ویرانی اور خوف پھیلا ہوا تھا اور ان کے ساتھ فنا کی وہ خوشبو جس کو مصر کی پہچان کہا جاتا ہے۔ سکینہ زین پر میرے آگے بیٹھی تھی۔ اس نے منہ موڑ کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ تھک چکی ہے اور اب اسے تھوڑا آرام درکار تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے اپنے تعاقب کے کوئی آثار نظر نہ آرہے تھے۔ میں اس وقت رکنا نہیں چاہتا تھا۔ وقت کا شمار میری انگلیوں پر تھا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ خطرہ کسی بھی وقت سر پر پہنچ سکتا تھا مگر سکینہ کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے گھوڑی کی رفتار آہستہ کردی اور اس سیاہ چٹان کے پاس پہنچ کر میں نے اسے روک دیا۔

ہم دونوں نیچے اتر آئے۔ میں نے ایک بڑے سے کالے پتھر کی اوٹ میں ایک قالیچہ بچھا دیا۔ میں نے سکینہ کو اس پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ چھاگل سے نکال کر پانی پلایا۔ روٹی اور کھجور ہمارا ناشتہ تھا مگر روٹی، کھجور اور پانی نے مل کر ایک عجیب نشہ کردیا اور جب اس نشے میں سکینہ کے شیریں لبوں کا لمس شامل ہوا تو یوں لگا ہم صحرا میں نہیں بلکہ مہکتے گلابوں کے باغیچے میں ہیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں سب کچھ بھول گئے مگر جلد ہی سورج کی تپش ہمیں حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی۔ میں نے ریشمی بازوؤں کا حصار دھیرے سے کھولا اور کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی کچھ نہ کچھ تو غیر معمولی ضرور تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے مڑ کر چٹان کی طرف دیکھا تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں آج بھی اس لمحے کو یاد کرکے خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ میں ایک مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا اور وہ چٹان کے بلند سرے پر کھڑا تھا۔ وہ جو مجھ سے خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتا تھا وہ ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر سکینہ کی طرف دیکھا وہ قالیچے پر لیٹی تھی اور اس نے اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔

پھر وہ گونگا بوڑھا نیچے اترنے لگا اگرچہ وہ بوڑھا آدمی تھا مگر اس سیدھی مشکل چٹان پر سے نیچے کسی پہاڑی بکرے کی طرح قلانچیں بھرتا چلا آرہا تھا۔ میں نے فوراً سکینہ کو متوجہ کیا تو وہ اٹھ کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔ اس دوران میں اس بوڑھے نے چٹان سے اتر کر ریت کی پٹی کو عبور کیا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ کیا آپ نے کبھی کسی وفادار کتے کی آنکھوں میں وہ ملامت بھری چمک دیکھی ہے جس کو اس کے مالک نے بلاوجہ مارا ہو۔ یہی چمک اس بوڑھے کی زرد آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ میں ان کی تاب نہ لا سکا

کچھ بول نہ پایا۔ بولنا مشکل ہورہا تھا۔

اچانک اس نے اپنی انگلی سے افق کی طرف اشارہ کیا جہاں صبح کی روشنی کے ساتھ کچھ سیاہ ہیولے برآمد ہورہے تھے۔ اس طرف دیکھتے ہی میں کانپ کررہ گیا اور گھٹنوں کے بل سکینہ کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں اپنے آپ کو لاچار اور بے بس محسوس کررہا تھا۔ میرے جوش کا پاگل پن مجھے چھوڑ گیا تھا۔ اس کالی چٹان کے سائے میں رک کر میں نے اتنا وقت ضائع کردیا تھا کہ تعاقب کرنے والے موت کا بگل بجاتے ہمارے سروں پر آن موجود ہوئے تھے۔ اب بھاگنے کا وقت باقی نہیں بچا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں سکینہ کو اس ہولناک جگہ پر مرنے کے لیے لے آیا تھا اور اب وہ آدمی جو غیر انسانی راستوں کا مسافر تھا پاگلوں کی طرح غوں غاں کرتے ہوئے اشاروں سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔

اس وقت میرا دماغ مکمل ماؤف ہوا جارہا تھا اور سکینہ کا جسم خوف سے بری طرح کپکپا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی میں اس کی آنکھوں میں پھیلتی وہ بے چارگی کبھی نہیں بھول سکتا جو میں نے اس وقت دیکھی۔

بے رنگ صحرائی چھپکلیاں اپنے بلوں سے نکل کر اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ اب وہ سیاہ ہیولے افق سے نکل کر سورج کی روشنی میں آگئے تھے اور ہر لمحہ میری وحشت بڑھتی چلی جارہی تھی۔ مجھے احساس ہورہا تھا کہ وہ لوگ جلد ہی ہم تک پہنچ جائیں گے۔ وہ گونگا بوڑھا عجیب انداز میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا اور سکینہ اس کو دیکھ کر خوف سے سکڑے جارہی تھی۔ بوڑھے نے پہلے آنے والے عربوں کی طرف اور پھر اپنے پیچھے چٹان کے عقب میں اشارہ کیا۔ اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی، بھاگنے کا وقت بھی گزر چکا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ سفید گھوڑی باوجود تیز رفتار ہونے کے شاید دو انسانوں کے بوجھ کے ساتھ ان عربوں کے گھوڑوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ اب آنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں اور ہمیں بھاگنے کی بجائے کسی چھپنے کی جگہ کی تلاش تھی جو یہاں مل نہیں سکتی تھی۔ میں اپنی سستی کو سے لگا جس کی وجہ سے وہ اور ہمارے سروں پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اب بھی اگر ہم نے جلدی چھپنے کی کوئی جگہ تلاش نہ کی تو پکڑا جانا یقینی تھا۔

تعاقب کرنے والے چار تھے جن کی سربراہی شیخ سعید محمد کررہا تھا۔ اب وہ تقریباً پانچ سو گز دور رہ گئے تھے۔ جب اس مجنون بوڑھے نے میرے بازو کو پکڑ کر جھنجھوڑا تو میرے حواس میرے قابو میں آئے۔ اس کی آنکھوں میں وحشی سی چمک تھی اور چہرے پر ملتجی اثرات تھے کہ جلدی کرو۔ اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے سکینہ کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ "جلدی چٹان کے اوپر چلو یہ آدمی ہمیں کہیں چھپادے گا۔"

وہ چلائی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں۔" اس کی بات سن کر میں نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور اس بوڑھے کے پیچھے لپکا۔ فاصلہ جو نظر آتا تھا وہ اس سے زیادہ تھا۔ چٹان پر چڑھائی بھی مشکل تھی۔ میرے راہ نما نے ہاتھ بڑھا کر میری مدد کی۔ میں اس پھسلن زدہ چٹان چڑھنے کی کوشش کررہا تھا اور سکینہ کو بھی سنبھال رہا تھا۔ اس کا خوف اس جگہ کی بیابانی اور تعاقب کرنے والوں کی وجہ سے بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ وہ اس صحرائی بوڑھے سے بھی بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی بلکہ خوف سے پاگل ہوئی جارہی تھی اور بری طرح رو رہی تھی۔ وہ بوڑھا تھوڑی دور اوپر چٹان میں موجود ایک چھوٹے سے غار کے سامنے رک گیا جو اونچائی میں پندرہ یا سولہ انچ سے زیادہ نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہوا میں اپنے ہاتھ چلانے لگا۔ اس کا لبادہ ہوا میں اڑ رہا تھا اور آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ہم اس غار کے اندر رینگ جائیں۔ خوف سے چیختی کسمساتی سکینہ میری گرفت سے نکلی اور چٹان پر تین چار قدم نیچے پھسل گئی۔ وہ یہ غار دیکھ کر ڈر گئی اور چلائی۔

"نہیں اس جگہ نہیں۔۔۔۔ یہ بوڑھا ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔۔۔۔ اس جگہ نہیں۔"

اس دوران میں گھڑسوار وہاں آن پہنچے تھے۔ چٹان کے دامن میں سعید محمد گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

اب ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی بندوق سیدھی کی شست باندھی نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ حالانکہ یہ عرصہ پہلے کی بات ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے آج ہی کی بات ہو اس نے میری دنیا بدل دی۔ ہمارے نیچے چٹانی بھول بھلیوں میں قسمت کی دیوی شیخ کی کہنی کے پاس کھڑی تھی۔ ٹریگر کھینچنے کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی اور پھر اس ریتلے سناٹے میں فائر کی آواز گونجی فوراً ہی ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ میں نے سکینہ کو نیچے بیٹھتے دیکھا وہ میرے قدموں کے پاس گر گئی اور اس کا لہو ان سیاہ چٹانوں پر بہنے لگا جن پر وہ کچھ دیر پہلے لیٹی ہوئی تھی۔

میری دنیا میری نگاہوں کے سامنے تاریک ہونے لگی یوں لگا جیسے میرا پورا جسم مفلوج ہو رہا ہو۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے سکینہ کے بے جان ہوتے جسم کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ کالی چٹانوں پر سرخ لہو اور سکینہ کی آنکھوں میں محبت کی کسک دیکھ کر میں خود بھی اس کے قریب ہی تقریباً ڈھے گیا۔ اس نے اپنی آخری ہچکی میرے سینے پر لی۔ اس وقت مجھے سورج کی گرمی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ پھر میں نے شیخ سعید محمد کی بندوق لوڈ ہونے کی آواز سنی مگر اب مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے صرف ایک اور گولی کا انتظار تھا مگر اس گونگے بوڑھے نے مجھے سکینہ کے مردہ جسم سے تقریباً نوچ کر علیحدہ کیا اور اس تاریک غار کے اندر کھینچ لیا۔

میرا سکتہ ٹوٹ گیا اور میں چیخ اٹھا۔ اب عرب بدو چٹان کی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ پچاس گز دور تھے۔ مجھے شیخ سعید محمد کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور بوڑھا مجھے اپنی پوری قوت کے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔ میں غار کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے سکینہ کے مردہ جسم کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے وہیں جما رہا اور بدوؤں کو اپنے قریب آتے دیکھتا رہا۔ اچانک اس گونگے بوڑھے کی مزاحمت رک گئی۔ اس نے مجھے بچانے کی اپنی پوری کوشش کی تھی مگر موت شیخ سعید محمد کی صورت میں اب میرے سر پر آن پہنچی تھی۔

اگر میں غلط نہیں تھا تو بوڑھا اب اپنی جان بچا رہا تھا۔

مصر کا ذکر بغیر جادو کے مکمل ہی نہیں ہوتا۔ یہ کہانی بھی مصر کے ریگ زاروں میں لکھی جا رہی تھی تو پھر اس میں جادو کہاں تھا شاید جادو یہی تھا کہ سکینہ نے اپنی جان دے کر میرے جبلی مطلبی اور جسمانی پیار کو سچے پیار میں بدل دیا تھا اور اب میں اس کے لیے جان بھی دینے کو تیار تھا مگر یہاں ایک اور جادو بھی تھا جو اس لمحے میرے اردگرد پنپ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ شیخ سعید محمد کی گولی مجھ تک پہنچتی میں نے ایک عجیب سی دردناک کراہ سنی۔ یہ آہ میرے عقب سے اٹھی تھی ایسی آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس غیر انسانی آواز نے میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے دیکھا تو چٹان کی چوٹی پر وہ بوڑھا اپنے بازو پرندے کے پر کی طرح پھیلائے کھڑا تھا۔ ایک بار پھر اس کے حلق سے وہ غیر انسانی کراہ بلند ہوئی یہ نہ تو کسی انسان سے نہ کسی جانور سے مشابہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں ایک عجیب سی شان پیدا ہو چکی تھی۔ وہ مکمل طور پر بدلا نظر آ رہا تھا۔

تیسری بار پھر اس نے وہ غیر انسانی چیخ بلند کی اور پھر چٹان میں بنے چھوٹے چھوٹے غاروں میں سے ایک میں سے ایک گیدڑ نے اپنا سر باہر نکالا۔ عموماً گیدڑ دن کی روشنی پسند نہیں کرتے وہ ایک شبینہ جانور ہے دوسرے جانداروں سے کنی کترانے والا مگر اس وقت دن کی روشنی میں جب سورج پوری طرح چمک رہا تھا ایک عجیب حیرت مجھے گھیر رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا گیدڑ، دوسرے کے بعد تیسرا، چوتھا، پانچوں پھر پتہ نہیں وہ پانچ سو، پانچ سو میں کتنی جلدی بدلا اور پھر شاید وہ پانچ ہزار بن گئے۔ چٹان میں بنے ہر سوراخ سے گیدڑ نکل رہا تھا اور وہ ایک غول کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ میری حیرت ایک طرف رہ گئی اور مجھے خوف نے آن گھیر لیا۔ میں اپنا غم اور دکھ بھول گیا۔

یہ صحرا اب ریت کا نہیں بلکہ گیدڑوں کا صحرا بن

گیا تھا۔ ان کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے ہر طرف گیدڑ متحرک تھے اور ان سب کا رخ عرب بدوؤں کی طرف تھا۔ وقفے وقفے سے وہ غیر انسانی کراہ صحرا کے سناٹے کا سینہ چیر رہی تھی۔ ہزاروں موٹے تازے گیدڑوں کا غول عرب بدوؤں کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا شیخ سعید محمد ایک بہادر اور جری شخص ہے مگر اس غول بیابانی کے سامنے اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔

میں نے چاروں گھڑسواروں کو خوف کے عالم میں واپس بھاگتے ہوئے دیکھا سفید گھوڑی بھی بغیر سوار کے ان کے ہمراہ بھاگ رہی تھی اور ان کے پیچھے زرد رنگ کے گیدڑوں کا غول ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

آخری دفعہ میں نے اس گونگے بوڑھے کی غیر انسانی چیخ سنی اور پھر گیدڑ پلٹنا شروع ہو گئے۔ میں بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھا میری مدد کرنے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر کے سامنے لے آیا تھا۔ جب تک میں اپنے حواسوں میں آتا اور میرا دماغ کام کرنا شروع کرتا وہ بوڑھا مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اب گیدڑ بھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں اس کالی چٹان پر تنہا اپنی محبت کی لاش کے پہلو میں گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ صحرا دوبارہ گونگا ہو چکا تھا ہر طرف سکوت مرگ طاری تھا۔

میں ہمت کر کے اٹھا اور اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کے لیے صحرا کی ریت میں لحد کھودی جس پر کوئی نشانی نہ تھی مگر میں نے اپنی جوانی اس کی قبر پر چھوڑ دی۔ اس دن سے میں ایک قسم کے گناہ کے حصار میں ہوں میں نے سعید محمد کا پیار بھرا اعتماد کھو دیا تھا۔

شام ڈھلے میں اٹھا اور بغیر کسی منزل کے ایک طرف چل پڑا۔ میں نہیں جانتا وہ گونگا بوڑھا کہاں چلا گیا تھا جس کی شکرگزاری نے موت سے مجھے بچا لیا تھا مگر اب میرا راہبر کوئی نہ تھا۔ میں اندازے سے ہی ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں میں کتنے دن چلتا رہا جو تھوڑا بہت سامان میں پڑاؤ سے ساتھ لے کر چلا تھا اور کالی چٹان کے پاس گھوڑی سے اتار کر رکھا تھا وہ شاید قدرت نے میرے لیے محفوظ رکھا تھا اسی پر گزارہ ہوتا رہا۔ پہلے کھجوریں ختم ہوئیں اور پھر پانی بھی نہ رہا۔ اب مجھے منزل سے زیادہ کسی کنوئیں کی تلاش تھی جہاں سے میں پانی حاصل کر سکتا اور کنوئیں کا مطلب ہی آبادی تھا۔

میری بے چین آوارہ گردی ایک رات مجھے ایک نخلستان کے قریب لے آئی۔ کھجوروں کے پیڑوں کے سائے میں ایک کنواں تھا جس کے آس پاس کی گیلی زمین اس بات کا اظہار تھا کہ یہ کنواں رواں ہے مگر شاید اس پر کم ہی لوگ آتے تھے۔ اس صحرا میں اگلا ممکنہ کنواں کئی میل دور ہو سکتا تھا اور میرے پاس پانی کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اس کو غنیمت جانا۔

جونہی میں اس کے قریب آیا تو میں نے بے شمار گدھ ہوا میں منڈلاتے دیکھے۔ مجھے شک گزرا کہ کوئی قریب المرگ جاندار کنوئیں کے قریب موجود ہے۔ میرے اور کنوئیں کے بیچ ایک ریتلا ٹیلہ تھا۔ جب ٹیلے کے اوپر سے میں نے بغور نیچے دیکھا تو ایک ہی نظر نے میرے ا دل میں خوف بھر دیا۔

چودھویں کے چاند کے گرد روشنی کا ہالا تھا اور وہ نیچے ٹیلے کی ڈھلان پر گہرے اور گھنے سائے بنا رہا تھا اور اس چاندنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ تقریباً بیس قدم دور ایک شخص لیٹا ہوا تھا پتہ نہیں وہ زندہ تھا یا مردہ۔ مجھے یوں لگا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ یوں لگا جیسے کوئی میرے دماغ کے اندر بولا ہو اور پھر میں اس کو پہچان گیا مگر وہاں اس کی شناخت کے دوسرے نشانات بھی تھے۔

جونہی میں نے ٹیلے کی ڈھلوان پر قدم رکھا ہزاروں شعلہ بار آنکھیں میری طرف مڑ گئیں۔ اوہ میرے خدا۔۔۔۔ وہاں ہر طرف گیدڑ ہی گیدڑ نمودار ہو رہے تھے کھجوروں کے درختوں کے عقب سے۔ وہ سب خاموش تھے اور حفاظت کر رہے تھے اس شخص کی جب وہ زندہ تھا تو ان کا مالک تھا۔



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سویلی کی چمگادڑیں

عمران قریشی۔کوئٹہ

اچانک آسمان پر خونی چمگادڑوں کا غول امڈ آیا، اور پھر ان آدم خور خونی چمگادڑوں نے پورے علاقے کو تہس نہس کرکے رکھ دیا اور جو بھی ان کے قابو میں آیا وہ نیست و نابود ہو کر رہ گیا۔

قسمت کا مارا اگر سات سمندر پار بھی چلا جائے تو سکون نہیں ملتا، ایک سبق آموز کہانی

جزیرہ سویلی نہایت خوبصورت اور سرسبز درختوں کے گھیرے میں واقع پراسرار اور پرخطر راستوں والا جزیرہ تھا۔ سمندر میں چھپی ہوئی خطرناک چٹانوں اور اردگرد واقع پہاڑی تودوں کے درمیان سے صحیح وسلامت نکل کر جزیرے کی حدود میں قدم رکھنا نہایت مشکل اور ناممکن مرحلہ تھا۔ لیکن اسٹیمر کا اسٹیرنگ سائی لیو کے تجربہ کار ہاتھوں میں تھا وہ متعدد بار سویلی کے جزیرے تک کا سفر کر چکا تھا۔ جزیرے پر مستقل رہنے کا ارادہ ناگزیدہ حالات پر مشتمل تھا۔ اس کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے تنویر کے چہرے پر افسردگی بھرے تاثرات تھے۔ وہ موبائل پر اپنے مختصر گھرانے سے بات چیت کر رہا تھا۔ بڑی عید کی آمد آمد تھی۔ اور وہ گھر سے بہت دور پراسرار جزیرے کی رہائش کا متمنی تھا۔

زندگی کے اپنوں کے اختتام پر اور موت کی وادی

کی شروعات پر اپنوں کی یاد تو ستاتی ہی ہے۔ اس کی زندگی کا اختتام ہونے والا تھا۔ اور موت سے قبل وہ جی بھر کر اپنوں سے بات چیت کر لینا چاہتا تھا۔ چند دنوں کے بعد بڑی عید تھی۔

قربانی کا دن...... وہ قربانی کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ جانور کی نہیں...... بلکہ اپنی قربانی...... ماں کی آنکھوں کا آپریشن...... چھوٹی بہن کی شادی اور اکلوتی بچی کو اچھے اسکول میں داخل کروانا تھا۔ وہ پردیس آنے کے بعد یہاں کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے مقصد کو یکسر بھلا چکا تھا۔ مقصد کی یاد تب آئی جب ڈاکٹرز نے اسے بتایا کہ اس کے جسم میں موجود خون کی مقدار تیزی کے ساتھ کم ہو رہی ہے۔ بیماری کا کوئی علاج نہیں تب اسے مقصد یاد آیا اس کی تمام جمع پونجی شراب نوشی اور عیاشیوں کی نذر ہو چکی تھی۔ زندگی کے دن کم تھے۔ اس لئے اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ اور سائی لیو کے ساتھ مل کر بہت بڑے صنعت کار کی اکلوتی لڑکی کو اغوا کیا۔ تاوان کے طور پر اچھی خاصی رقم ہاتھ آئی۔

لیکن بدقسمتی سے صنعت کار کی لڑکی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ تاوان لینے کے باوجود لڑکی کے نا ملنے کے بعد صنعت کار نے تمام شہر کی پولیس کو ان دونوں کے پیچھے لگا دیا۔ ان دونوں کے لئے شہر میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اور مجبوراً انہوں نے دور دراز کے جزیرے سویلی کا رخ کیا۔

تنویر جزیرے پر آنے سے قبل تاوان سے حاصل کردہ رقم اپنی ماں اور بہن کو بھجوا چکا تھا۔ یوں اس کی قربانی مکمل ہو گئی تھی۔ رقم تقریباً پچاس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اتنی رقم اس کے مختصر گھرانے کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔

سائی لیو نے اسٹیمر کو جزیرے کے ویران ساحل کے کنارے روک دیا۔ اور نیچے اتر کر لنگر کو ترتیب دینے لگا۔

تنویر نے تنقیدی نگاہوں سے جزیرے کا جائزہ لیا۔ ارد گرد دور دور تک سرسبز درختوں کا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ انسان کا نام ونشان نہیں تھا۔ لیکن درختوں کے درمیان چند کچے اور جدید گھروں کا سلسلہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں پکی سڑک بھی دکھائی دیتی تھی۔ آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بوندا باندی کا آغاز ہونے والا تھا۔ اسٹیمر کو لنگر انداز کرنے کے بعد سائی نے تنویر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جناب کیا آپ آسیب پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر نہیں رکھتے تو یقین کر لیجیے یہاں متعدد موجود ہیں۔"

تنویر چھلانگ لگا کر اسٹیمر سے نیچے اتر آیا۔ اور سائی کے پیچھے جزیرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"ان باتوں پر یقین کرنا بے وقوفی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ جسے میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ میرے خیال میں سب سے بڑا آسیب تو انسان خود ہے۔" سائی لیو مسکراتے ہوئے بولا۔

"کچھ دیر آپ کو آسیب دیکھنے کا اتفاق ہونے والا ہے۔ آپ حیرت زدہ ہونے کے لئے تیار ہو جایئے۔"

تنویر افسردہ لہجے میں ہمکلام ہوا۔

"میں موت کی صورت میں آسیب دیکھنے کے بعد بلاشبہ حیرت زدہ ہو چکا ہوں مزید گنجائش اب باقی نہیں ہے۔"

ساحل سمندر کی سفید ریت سے آگے درختوں کے گھنے سلسلے کے درمیان کچے راستے کا آغاز ہوا۔ ہوا میں خنکی طاری ہونے لگی تھی۔ سمندر کی طرف بجلی چمک رہی تھی حالانکہ دوپہر تین بجے کا عمل تھا۔ لیکن گھرے بادلوں کی وجہ سے رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں نے کچے راستے پر آگے بڑھنا شروع کر دیا سائی لیو دوبارہ بولا۔

"سویلی میں راتیں جاگتی ہیں۔ اور دن سوتے ہیں کچھ عرصہ قبل جب میرا یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ تب میں نے دن کے وقت جزیرے کے درمیان میں واقع سویلی جزیرے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ شہر زیادہ بڑا نہیں تھا...... مکان مضبوط لکڑیوں سے تیار کردہ تھے۔ صرف چرچ کی عمارت سیمنٹ سے بنی تھی۔ سویلی کی عوام اپنے گھروں میں خوابیدہ تھی۔ اور میں تمام شہر میں گھومنے پھرنے کے بعد واپس اپنے اسٹیمر کی طرف آ گیا۔" تنویر نے پوچھا۔

"کیا تمہارا رات کے وقت دوبارہ شہر میں جانے

کا اتفاق ہوا۔" سائی لیو انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کبھی بھی نہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہاں کے لوگ بہت خطرناک ہیں۔ انسانی گوشت کھانا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ خون پینے کے بھی عادی ہیں۔"

پھر اچانک چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ایک چمگادڑ تیزی کے ساتھ اڑتی ہوئی تنویر کے سر کے پاس سے گزر کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئی۔ سائی لیو مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس خون پینے والے جانور نما پرندے سے سخت نفرت ہے۔ جزیرے پر ان کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔" تنویر نے پوچھا۔

"کیا ہم ان آدم خوروں کے درمیان اطمینان کی زندگی بسر کرسکیں گے۔ ہمارا جزیرے پر رہنے کا ارادہ حماقت پر مبنی تو نہیں۔" سائی لیو بولا۔

"آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے چند دن قبل جزیرے کے سرکردہ افراد سے میری بات چیت ہوچکی ہے۔ انہوں نے ہر دن کے لئے ایک صحت مند انسان کی ضرورت کا اظہار کیا ہے جس کا وہ خون پی سکیں۔ سویلی جزیرے سے کچھ ہٹ کر وٹا آئیرلینڈ واقع ہے۔ وہاں انسانوں کی کثرت ہے۔ یہ آئرلینڈ ایسے خطرناک قیدیوں کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ جنہیں موذی بیماریاں لاحق ہیں۔ وہ وٹا آئیرلینڈ میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ان میں سے ایک دو کو یہاں لانا میرے لئے مشکل نہیں۔" سائی لیو خاموش ہوگیا۔

تنویر نے پوچھا۔" سویلی تک آنے کا راستہ نہایت دشوار گزار بھول بھلیوں پر مشتمل ہے۔ کیا تم روزانہ ان پیچیدگیوں کو عبور کرکے وٹا آئیرلینڈ پر جانے کے بعد واپس آپاؤ گے۔" سائی لیو نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

"وہاں تک جانے کے محفوظ ترین راستے سے میں آگاہوں۔ وٹا آئیرلینڈ درحقیقت ان پہاڑی پیچیدگیوں سے کافی پہلے واقع ہے۔ اس لئے مجھے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

درختوں کے وسیع و عریض سلسلے کا اختتام ہوا۔

اور وہ رہائشی علاقے میں داخل ہوگئے۔ وہاں متعدد دو کمروں پر مشتمل لکڑی کے مکان لائن در لائن دور تک چلے گئے تھے۔ ان کے دروازے بند تھے۔ سائی لیو کے کہنے کے مطابق سویلی جزیرے کے رہائشی اندر آرام فرماتے تھے کچھ آگے جاکر جزیرے کے اکلوتے چرچ کے آثار نمودار ہوئے۔ پکی دیواروں اور چھت سے ترتیب دیا ہوا چرچ ایک بہت بڑے ہال پر مشتمل تھا۔ جس کے اندر بہت بڑا فانوس نصب تھا۔ یہ فانوس موم بتیوں سے مزین تھا۔ کرسیاں اور بینچ مہنگی لکڑی سے تیار کردہ تھے۔ چرچ کے پاس سے گزرنے کے بعد راستے نے موڑ کاٹا اور نیچے کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ یہاں مکانوں کی تعداد کم تھی وہ ایک دوسرے سے کچھ ہٹ کر واقع تھے۔ ان مختصر مکانوں کے آگے لکڑی کا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اور برآمدے کے سامنے لان واقع تھا۔ ایک مکان کے سامنے پہنچ کر سائی لیو رک گیا اور تنویر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"ہماری اس رہائش کا بندوبست سویلی کے سب سے بڑے رکن زومیری میم کی طرف سے کیا گیا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان معاہدہ چرچ میں طے پایا۔"

گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش کا آغاز ہوگیا۔ دونوں نے ہڑبڑا کر مکان کے اندر کا رخ کیا برآمدے کے آگے بنے ہوئے کمرے میں دو کرسیاں رکھی تھیں ان کے سامنے میز پڑا تھا دروازے کے ساتھ کھڑکی تھی اور کھڑکی کے سامنے والی دیوار میں آتش دان بنا دکھائی دے رہا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد سائی لیو نے دروازہ بند کردیا۔ اور تنویر کو بیٹھنے کا اشارہ کرکے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر آیا تو اس نے ہاتھوں میں کیتلی پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے آتش دان میں آگ لگانے کے بعد کیتلی کو آگ پر رکھ دیا۔ اور لوہے کی سلاخ سے کوئلوں کو کریدتے ہوئے بولا۔

"جناب ہمارے لئے جزیرہ محفوظ ترین مقام ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی۔ کہ

ہم پوشیدگی کے لئے سویلی جزیرے کا انتخاب کرسکتے ہیں۔حالات معقول ہونے کے بعد ہم اپنی منزلوں کا رخ کریں گے۔"

تنویر کے چہرے پرایک دفعہ پھرافسردگی کی لہرابھرنے لگی اس کی کوئی منزل نہیں تھی وہ صرف انجام کا منتظر تھا۔اس لئے موضوع تبدیل کرنے کے لئے بولا۔

"جزیرے پرہماری خوراک کا کیا بندوبست ہے؟" سائی نے اسے بتایا۔

"اسٹیمر میں ایک مہینے کی خوراک اورآپ کی ادویات موجود ہیں۔بارش رکنے کے بعد میں انہیں یہاں منتقل کردوں گا۔اسٹیمر کے نچلے حصے میں انسانی لاش بھی رکھی ہوئی ہے وہ سویلی والوں کے لئے آج کا تحفہ ہے۔"

تنویر کو اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔وہ کھانے پینے کے سامان کی موجودگی سے آگاہ تھا۔لیکن اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اسٹیمر کے نچلے حصے میں ایک عدد لاش بھی ان کے ہمراہ محوسفر تھی۔اس کے استفسار پر سائی لیو نے اسے بتایا کہ "وہ لاش اس نے سفر سے قبل تگڑی رقم دے کر سردخانے سے حاصل کی تھی جتنا عرصہ سویلی میں قیام کے لئے درکار تھا اس کے لئے جزیرے والوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے انہیں خوش رکھنا ضروری تھا اوران کی خوشی کے لئے خون کی دستیابی لازمی تھی۔"

کچھ دیر بعد کافی تیار ہوگئی کافی پینے کے بعد سائی سامان لانے کے لئے اسٹیمر کی طرف چلا گیا۔تنویر کو کمزوری محسوس ہورہی تھی وہ اٹھ کر ملحقہ کمرے میں آ گیا کمرہ آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔وہاں دو پلنگوں کے علاوہ ایک مختصرسی الماری رکھی ہوئی تھی جس کے اندر کچھ برتن بھی دکھائی دے رہے تھے آرام گاہ کے سامنے والے حصے میں وسیع وعریض کھڑکی تھی اور کھڑکی کے ساتھ والی دیوار میں باتھ روم کا دروازہ بنا تھا تنویر پلنگ پر لیٹ گیا اس پر غنودگی طاری ہونے لگی دماغ لمبے اور کٹھن سفر کی بدولت بوجھل تھا پلنگ پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند سو گیا۔

تمام رات طوفانی بارش نے جزیرے کو جل تھل کئے رکھا۔صبح موسم کھل گیا اور خوشگوار دھوپ نے جزیرے کا محاصرہ کرلیا۔ناشتے میں ڈبل روٹی مکھن اور کافی کا اہتمام تھا سائی لیو ناشتہ کرنے کے بعد لاش کا انتظام کرنے کے لئے ویٹا جزیرے کی طرف چلا گیا گزشتہ رات کی بھرپور نیند کی وجہ سے تنویر اپنے آپ کو صحت مند اور خوشگوار محسوس کررہا تھا۔اس لئے سائی لیو کے جانے کے بعد جزیرے کی سیر کے لئے نکل کھڑا ہوا۔باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی آب وہوا خوشگوار تھی سرسبز دھلے ہوئے درختوں کا رنگ آنکھوں کو بہت بھلا محسوس ہورہا تھا جزیرہ حسب معمول سنسان پڑا تھا۔رہائشی گھروں میں پوشیدہ تھے تنویر کے دل میں انہیں دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا وہ جس راستے سے گزرر ہا تھا وہاں دوررویہ مکانوں کا سلسلہ دورتک جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ان مکانوں کے اردگرد درختوں کی کثرت تھی اس نے ایک گھر کا انتخاب کیا اور دروازے کی طرف چلا آیا یہاں برآمدہ نہیں تھا اور دروازہ اندر سے بند تھا۔دروازے کے ساتھ کھڑکی بنی ہوئی تھی کھڑکی کے پٹ بھڑے ہوئے تھے دھکا دینے پر چوپٹ کھل گئے اندر گھپ اندھیرا طاری تھا تنویر نے جیب میں سے موبائل باہر نکالا اور ٹارچ آن کرکے کمرے کے اندر کا جائزہ لینے لگا۔کمرہ آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔پلنگ کے پاس الماری رکھی تھی الماری کے اندر برتن تھے پلنگ کے اوپر چھت کے ساتھ ایک انسانی وجود الٹا لٹکا ہوا تھا اس کے گرد سیاہ جھلی کا محاصرہ تھا تنویر کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

دور سے دیکھنے پر وہ وجود ایک بڑی چمگادڑ سے مشابہت رکھتا ہوا دکھائی دیتا تھا...... لیکن درحقیقت وہ انسان تھا اس کے ماتھے سے نیچے دو آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن کے اندر سیاہ پتلیاں نہیں تھیں تنویر نے ہڑبڑا کر کھڑکی کے پٹ بند کئے اور کچی سڑک پر گھبراہٹ کے عالم میں آگے بڑھتے ہوئے سوچنے لگا کیا سویلی جزیرہ چمگادڑ نما انسانوں کا مسکن ہے خون اور گوشت چمگادڑوں کا من کھاجا ہوتا ہے جزیرے کو چھوڑ دینا بہتر تھا۔وہ دونوں ہزاروں کی تعداد میں رہائش پذیر چمگادڑوں سے مقابلہ

نہیں کر سکتے تھے۔ درختوں کے درمیان میں راستہ طویل و عریض پہاڑی کے اوپر کی طرف جاتا تھا۔ وہ اوپر کی طرف چل دیا۔ راستے کے دونوں کناروں پر دلفریب پھولوں کی جھاڑیاں تھیں سوچنے کی بات یہ تھی کیا اتنے خوب صورت جزیرے کے خالق وہاں کے حیوانی رہائشی ہو سکتے تھے پکی سڑکوں کا ایک جال تھا جو جزیرے کے اندر پھیلا ہوا تھا ہر قسم کی ضروریات سے مزین گھر تھے گرجا گھر کی پکی عمارت تھی یہ سب ان خوابیدہ مقامی باشندوں کے بس سے باہر تھا۔

پہاڑ کی چوٹی پر سرسبز ڈھلوان تھی۔ جہاں سے نیچے نیلا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ تنویر نے اپنا کوٹ اتار کر سرسبز گھاس پر پھیلایا۔ اور اس پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

اگلے دن بڑی عید تھی۔ اس کے گھر میں ہمسائیوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ قربانی کا گوشت تقسیم ہوگا بچے اور بڑے زرق برق کپڑے پہن کر عید ملنے کے لئے رشتہ داروں کے گھروں کا رخ کریں گے۔ لیکن وہ ان باتوں سے بہت دور نکل چکا تھا۔ سویلی میں صرف تنہائی اور بے بسی کا عالم تھا یہاں زندگی محفوظ تھی لیکن اپنوں کی یاد شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ تنہائی کی ٹھنڈی آبشار سلگتے ہوئے جسم پر برستی تھی۔ لیکن اس ٹھنڈک میں نامعلوم سی تشنگی پائی جاتی تھی۔ قدموں کی ہلکی چاپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

اس نے آہستگی آنکھیں کھول دیں۔ پہاڑی راستے پر کوئی ہلکے قدموں سے چلتا ہوا اوپر کی طرف آ رہا تھا۔ تنویر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ قدموں کی چاپ قریب آنے کے بعد یکلخت داہنی جانب مڑ گئی۔

تنویر نے پھرتی کے ساتھ کوٹ پہنا اور پکے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستہ سنسان پڑا تھا۔ داہنی طرف سرسبز جھاڑیوں سے بھرپور ڈھلوان تھی۔ ان جھاڑیوں کے پیچھے اسے سرخ اور سفید رنگ کے کپڑوں کی جھلک دکھائی دی۔ وہ تیزی کے ساتھ ڈھلوان سے نیچے کی طرف اترنے لگا۔ یہاں خاردار جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اسے آگے بڑھنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن پراسرار وجود جو یقیناً جزیرے کا رہائشی نہیں تھا کیونکہ وہ دن کے وقت باہر تھا خاردار جھاڑیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ پھر جھاڑیوں کا اختتام ہوا اور وسیع رقبہ زمین پر سرسبز گھاس کے خطے کے درمیان چند درخت دکھائی دینے لگے۔

تنویر نے جب سرسبز گھاس کے کھلے حصے میں قدم رکھا تب وہ وجود درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو کر نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ تنویر درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔ درختوں کے قریب پہنچنے پر اسے کسی لڑکی کی ہچکیاں لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔ عمر سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ لڑکی کی عمر پچیس سے تیس کے درمیان ہو سکتی تھی تنویر نے درختوں کے درمیان نگاہ دوڑائی۔

لڑکی گھنے درخت کے نیچے رکھے ہوئے بہت بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ تنویر نے اس کے سراپے کا جائزہ لیا عمر اس کے اندازے کے عین مطابق پچیس سے کچھ اوپر تھی۔ وہ سرخ نیکر اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی۔ بھورے اور لمبے بال کمر سے نیچے تک چلے گئے تھے۔ وہ ٹینس شوز پہنے ہوئے تھی اس کی آنکھوں کا رنگ بالوں سے مطابقت رکھتا ہوا براؤن تھا۔ ہونٹ سرخ اور رس بھرے تھے۔ تنویر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے چلا جا رہا تھا اس کی نگاہوں کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے لڑکی نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھلی ہوئی خوبصورت بھنورے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں چھوٹا سا ناک پونچھنے کی وجہ سے ٹماٹر کی طرح سرخ دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحے ٹکٹکی باندھے تنویر کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سریلی آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

تنویر آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور نرم لہجے میں بولا۔

"تمہاری طرح اس جزیرے کا رہائشی نہیں ہوں۔ قسمت کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔" لڑکی نے تعجب بھرے لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ کہ میں جزیرے کی رہائشی نہیں ہوں۔ اگر میں جزیرے پر ہوں تو پھر یہیں کے رہنے والی ہوں۔"

تنویر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "جزیرے کے رہائشی سو رہے ہیں۔ جو دن کے وقت جاگتے ہیں وہ جزیرے کے رہائشی نہیں ہو سکتے۔"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور اداس لہجے میں بولی۔

"تمہارا اندازہ درست ہے میں یہاں سے کافی دور لندن کے ایک شہر کی رہنے والی ہوں۔ سویلی جزیرے کے پاس ہمارا جہاز تباہ ہو گیا پندرہ کے قریب لوگ سویلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے چمگادڑوں نے انہیں یرغمال بنا لیا اور ایک مہینے کے دوران ان سب کا خون نچوڑ کر ان کے ڈھانچوں کو سمندر کے اندر پھینک دیا۔"

تنویر نے کہا۔ "لیکن تم زندہ سلامت ہو۔ ان چمگادڑوں سے تمہاری جان خلاصی کیسے ہوئی؟"

لڑکی بولی۔ "میری ستم ظریفی کہ سویلی جزیرے کی کرتا دھرتا زومیری میم کے اکلوتے لڑکے جوشوا کو میری خوبصورتی بھا گئی اس نے مجھے جزیرے والوں کے حوالے کرنے کے بجائے مجھ سے شادی کر لی۔ اب وہ رات کو میرا خون نچوڑتا ہے اور صبح میں تنہائی میں بیٹھ کر آنسو بہاتی ہوں۔"

تنویر کو اس معصوم لڑکی کی بے بسی پر افسوس ہوا اور وہ تسلی دینے کے لئے بولا۔

"میرے پاس موبائل ہے اگر تم اپنے گھر بات کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔"

لڑکی بولی۔ "مجھے سویلی پر رہتے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکی ہوں مجھے یاد نہیں کہ گھر کا نمبر کیا تھا۔"

تنویر نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے بتایا۔ "ربنی۔"

تنویر بولا۔ "ربنی ڈیئر تم فکر نہ کرو۔ یہاں سے فرار ہونا ہمارے لئے مشکل نہیں ہے میرے ساتھ سائی لیو کے پاس اسٹیمر ہے۔ وہ سویلی سے باہر نکلنے کے راستے سے بھی باخوبی آگاہ ہے۔ میں رات تمہارے متعلق اس سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً تمہاری مدد کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔"

ربنی نے کوئی جواب نہیں دیا اور چند لمحے ادھر ادھر کی بات چیت کرنے کے بعد تنویر واپس کیبن کی طرف آ گیا۔

سائی لیو کی واپسی دوپہر تین بجے کے بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ اسٹیمر میں ایک ہٹا کٹا ڈچ نوجوان بھی تھا۔ اسے جذام کا مرض لاحق تھا۔ جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ مرض حال ہی میں لاحق ہوا تھا اس لئے بیماری اب تک صحت پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی ڈچ نوجوان کے ہاتھ پاؤں کو رسیوں سے باندھ کر اسے اسٹیمر کے نچلے حصے میں لٹایا گیا تھا اسٹیمر کو لنگر انداز کرنے کے بعد سائی لیو تنویر کے ہمراہ خاموشی کے ساتھ کمرے میں چلا آیا اور کافی تیار کرنے لگا تنویر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا تم یہ سب ٹھیک کر رہے ہو؟" اپنی زندگی کو بچانے کے لئے کتنے گناہ مزید کرو گے۔ کیا اس نوجوان کو معلوم ہے کہ رات کو اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

سائی لیو سرد لہجے میں بولا۔ "اگر اسے معلوم ہوتا تب بھی کیا فرق پڑتا۔ اسے یہاں تک لانا میری مجبوری تھی۔ اگر نہیں لے کر آتا تو سویلی والے رات کو ہمارا خون چوس لیتے۔" اس نے پانی سے بھری ہوئی کیتلی کو آتش دان میں دہکتی ہوئی آگ پر رکھ دیا۔

تنویر اس دفعہ نرم لہجے میں بولا۔ "ہم سویلی سے دور کسی اور جزیرے میں بھی پناہ لے سکتے ہیں ضروری نہیں کہ ہم چمگادڑوں کے درمیان اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کریں۔"

سائی لیو نے جواب دیا۔ "اس جزیرے کے ارد گرد اور کوئی جزیرہ نہیں ہے اور دور دراز جو موجود ہیں وہ قانون کی بالادستی میں آتے ہیں۔ اس لئے قانون سے بچنے کے لئے یہ جزیرہ نہایت مناسب ہے۔"

تنویر بولا۔ "آج صبح جزیرے کی بالائی پہاڑی

پر میری ملاقات ایک مظلوم لڑکی سے ہوئی۔ وہ لڑکی سویلی کی رہائشی نہیں ہے۔ بلکہ لندن کی رہنے والی ہے۔ جزیرے کی زومیری میم کے لڑکے جوشوا نے اس سے زبردستی شادی کرلی وہ جزیرے سے فرار ہونا چاہتی ہے اس کے لئے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ تم اسے اسٹیمر کے ذریعے بحری جہازوں کی گزرگاہ کے قریب چھوڑ کر آسکتے ہو۔"

سائی لیو غصیلے لہجے میں بولا۔ "جناب میں سویلی والوں سے راہ ورسم استوار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوں اور آپ معاملے کو بگاڑنا چاہتے ہیں زومیری میم سے معاہدہ طے کرنے کے لئے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اگر ان کے متعلق آپ کو معلوم ہوجائے تو شاید آپ دوبارہ ایسی بات نہ کرتے۔"

تنویر بولا۔ "لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا کسی مظلوم کو قربانی کی بھینٹ چڑھا کر اپنی زندگی کا تحفظ کرنا مجھے اخلاقی طور پر منظور نہیں۔"

سائی لیو نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ "کیا صنعت کار کی لڑکی کو اغوا کرنا اخلاق کے دائرے میں آتا ہے۔ کیا اس کی لڑکی کو قتل کرکے ہم نے اخلاق کی حدود کو نہیں پھلانگا۔ صرف چند دنوں کی بات ہے جناب حالات کے بہتر ہوتے ہی ہم سویلی کو چھوڑ کر شہر منتقل ہوجائیں گے۔ اس وقت تک آپ مہربانی کرکے لڑکی کے چکر سے دور ہی رہیے۔ تو ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔"

تنویر خاموش ہوگیا۔ سائی لیو نے کافی پی اور سونے کی نیت سے بستر پر لیٹ گیا لمبے اور تکلیف دہ سفر کی وجہ سے اس کا جسم تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی اس نے خراٹے لینے شروع کردیئے۔

شام ہوتے ہی سویلی کے رہائشیوں نے گھروں سے باہر نکلنا شروع کیا وہ اس وقت عام حالات میں تھے ان کے جسم جھلی نما پروں سے مستثنیٰ تھے لیکن بغور دیکھنے پر ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے دو دانت صاف دکھائی دیتے تھے ان سب کا رخ چرچ کی عمارت کی طرف تھا۔ تنویر کھڑکی کے پاس کھڑا ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے اپنے پیچھے سائی لیو کی آواز سنائی دی۔

"جناب یہ سب رات کے طعام کے لئے چرچ سے منسلک میدان میں جمع ہورہے ہیں۔ ڈچ نوجوان کو اسٹیمر سے نکال کر میدان تک پہنچانے کے لئے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔" تنویر نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور دونوں مکان سے باہر نکل کر ساحل کی طرف چل دیئے سویلی کے رہائشی انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے لیکن ان کی موجودگی سے وہ خائف یا پریشان نہیں تھے آسمان پر چمگادڑوں کا غول بیانی گشت کررہا تھا۔ صبح کے وقت خوب صورت اور دلفریب دکھائی دینے والا جزیرہ اس وقت نہایت خوف ناک اور دل پر سکتہ طاری کردینے والا منظر پیش کررہا تھا۔

ساحل سنسان پڑا تھا۔ اسٹیمر کے پیندے میں ڈچ نوجوان رسیوں سے بندھا مجبور و بے بسی کی تصویر بنا دکھائی دیا۔ اس کی بے بسی کو دیکھ کر تنویر کو اپنا دل بوجھل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ سائی لیو کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ کچھ دیر کے لئے تنویر کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ وہ سائی لیو کی سنگدلی کا معترف ہونے لگا۔ سائی لیو اپنے مفاد کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوسکتا تھا کل کو اگر اس کی ذات پر بات آتی۔ تو وہ تنویر کے ساتھ دغا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایسا وقت آنے سے پہلے اسے اپنے مستقبل کے لئے کچھ سوچ لینا چاہیے تھا۔

سائی لیو نے ڈچ نوجوان کو کاندھے کے پاس سے تھاما۔ اور تنویر کو اس کی ٹانگیں پکڑنے کے لئے کہا۔ نوجوان نے ہلکی سی مزاحمت کی کوششیں کی لیکن مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کی وجہ سے صرف کسمسا کررہ گیا دونوں اسے اٹھائے اسٹیمر سے باہر سویلی کی طرف چل دیئے۔

چمگادڑوں کا مختصر شہر اب سنسان ہوگیا تھا۔ آسمان پر اڑتی ہوئی چمگادڑیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ لیکن چرچ کے پاس ماحول گرم تھا۔ وہ سب ملحقہ میدان میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ تنویر اور سائی لیو کے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے سیاہ پتلیوں کے بغیر

سفید آنکھوں سے انہیں گھور اپھر ان کے ہجوم میں ہلچل پیدا ہوئی۔ وہ ایک طرف کھسک کر ہجوم کے درمیان میں راستہ بنا رہے تھے۔ اس راستے میں سے اونچے لمبے قد کی عورت نمودار ہوئی۔ وہ نیلی جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی اس کا صحت مند جسم لباس میں بمشکل تمام سمایا ہوا تھا۔ سرمئی بال کاندھے کے پاس ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ خوبصورت اور دیدہ زیب تھا۔ لیکن اس کی تمام خوب صورتی کو حلقوں میں گھومتی ہوئی سفید حیوانی آنکھیں ماند کر رہی تھیں وہ چمگادڑوں پر حکمرانی کرنے والی زومیری میم تھی۔

تنویر اور سائی لیو کے پاس پہنچنے کے بعد اس نے بھیڑیئے کی طرح دانت نکوسے اور بھاری بھرکم ڈچ نوجوان کو پلاسٹک کے گڈے کی مانند اپنے کاندھوں پر منتقل کیا اور واپس ہجوم کی طرف چلی گئی۔ سائی لیو نے تنویر کا ہاتھ تھاما اور اسے رہائشی کمرے کی طرف کھینچنے لگا۔ تنویر کو اپنے پیچھے ہجوم میں چہ میگوئیوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے گردن کو موڑ کر پیچھے دیکھا۔ زومیری میم ہجوم کے درمیان میں کھڑی تھی ڈچ نوجوان کو اس نے زمین پر پٹخ دیا تھا پھر تمام چمگادڑوں کا ہجوم اس بے بس نوجوان پر ٹوٹ پڑا۔ اسے چیخنے چلانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اور اس کی زندگی تمام ہوگئی۔

تنویر کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ اور وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ سائی لیو نے اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن تنویر کی ٹانگوں نے جواب دے دیا تھا۔ اس لئے وہ پاؤں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ سائی لیو نے بے دردی کے ساتھ تنویر کو بغلوں کے پاس سے تھام کر کمرے کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا وہ اپنے تمام جسم کا زور بازوؤں میں منتقل کر کے اسے رہائشی کمرے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ سائی لیو طاقتور اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ لیکن ایسے جسم کو اٹھا کر کاندھے پر منتقل کرنا آسان نہیں تھا۔ جو جدوجہد اور کوشش کو مسترد کر چکا، لیکن انہیں کمرے تک پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ تنویر کو بستر پر لٹانے کے بعد سائی لیو نے پانی سے بھرے ہوئے گلاس کے ساتھ چند گولیاں اس کے حلق میں منتقل کیں اور اسے اطمینان کے ساتھ سو جانے کی تلقین کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ گولیوں نے جادوئی اثر کیا اس کے شل ہوتے ہوئے اعصاب بیدار ہونے لگے۔ سب سے پہلے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا اور وہ سوچنے لگا۔

سائی لیو نے جس بے دردی کے ساتھ اسے کمرے کی طرف گھسیٹا تھا۔ اس سے ہمدردی کی توقع رکھنا بے وقوفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اسے سائی لیو کے وجود پر انحصار نہیں کرنا چاہئے۔ وہ کسی بھی وقت اسے دھوکہ دے سکتا تھا۔ ایسے وقت سے پہلے اسے اپنے تحفظ کے لئے احتیاطی تدبیر کر لینی چاہئے تھی۔ اس نے سر جھٹک کر خیالات کو منتشر کیا اور دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ وہ دوسرے دن صبح رینی کے ہمراہ سویلی سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا اور اس فرار میں سائی لیو کا اسٹیمر معاون ثابت ہوسکتا تھا اس نے مطمئن انداز میں آنکھیں بند کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسرے دن سائی لیو کے چلے جانے کے بعد تنویر نے موبائل پر اپنے گھر والوں سے بات چیت کی۔ سویلی پر نیٹ ورک صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کے پاس بیلنس بھی کچھ کم تھا۔ بہرکیف عید کی مبارک باد دیتے ہوئے تنویر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اس کی ماں نے تڑپ کر پوچھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم لکھ پتی ہونے کے باوجود بھی دیار غیر میں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ وہ کون سی مجبوریاں ہیں جو تمہارے پاؤں کی زنجیریں بنی ہوئی ہیں۔ وطن واپس چلے آؤ۔ یہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔“

تنویر آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ”میرا انتظار کرنا چھوڑ دو۔ گھر کے باقی افراد کو میرا سلام دیجیے گا اور بچی کو بہت پیار کیجیے گا۔“ موبائل کا بیلنس ختم ہوگیا اور تنویر نے طویل سانس لیتے ہوئے موبائل کو بستر پر پھینک دیا پھر آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا باہر چمکدار

دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سویلی حسب معمول سنسان پڑا تھا۔ وہ مکانوں کی قطاروں کے درمیان سے ہوتا ہوا سویلی کے پہاڑی علاقے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے کسی انسان کی ضرورت تھی۔ پہاڑ پر چڑھ کر جب اس نے درختوں کے جھنڈ کا رخ کیا تب درخت کے نیچے رکھے ہوئے پتھر کو سنسان پایا۔ ریٹی وہاں نہیں تھی اس نے جھنڈ کے علاوہ اردگرد کے علاقے کو چھان مارا لیکن وہ نہیں تھی تنویر اس کے گھر سے آگاہ تھا گزشتہ روز سویلی کی طرف واپس جاتے ہوئے اس نے اسے گھر کے پاس چھوڑا تھا۔ اس کا گھر سویلی کا سب سے عالیشان اور خوب صورت گھر تھا۔ گھر میں متعدد کمرے تھے لیکن رہائشی صرف دو تھے۔ زومیری علیحدہ گھر میں رہتی تھی تنویر پہاڑی سے نیچے اتر کر سویلی میں واقع ریٹی کے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر کے دروازے اندر سے بند تھے۔ کھڑکیاں بھی لاک تھیں لیکن انہیں توڑنا مشکل نہیں تھا اس نے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے کھڑکی کے پٹ کو دوسری طرف گرادیا اور پیدا ہونے والے خلاء کے ذریعے مکان میں داخل ہوگیا اندر اندھیرا طاری تھا کمرہ خالی پڑا تھا وہ دوسرے کمرے کی طرف چل دیا اس کمرے میں پلنگ بچھا ہوا تھا پلنگ کے اوپر انسانی چمگادڑ الٹی لٹکی ہوئی تھی اس چمگادڑ کے نیچے کوئی انسانی وجود چادر اوڑھے لیٹا تھا تنویر کو یہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ریٹی تھی کمرے میں قدم رکھتے پر اسے ہچکیوں کی آواز سنائی دی تنویر نے دھیمے لہجے میں اسے پکارا۔ جواب میں پلنگ پر چادر اوڑھے ہوئے وجود میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اور اس نے چہرہ باہر نکال کر تنویر کی طرف دیکھا رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ تنویر کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اتر آئی۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے سے باہر کی طرف کھینچنے لگی۔

تنویر نے احتجاج نہیں کیا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں آ گیا۔

ریٹی دبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ یہاں کیوں آئے ہیں اگر اسے آپ کی موجودگی کے متعلق بھنک بھی پڑ گئی تو سویلی میں زلزلہ آ جائے گا۔"

تنویر سخت لہجے میں بولا۔ "میرا ساتھی کچھ دیر میں اسٹیمر کے ہمراہ سویلی میں آنے والا ہے ہم جزیرے سے فرار ہو جائیں گے شہر میں چمگادڑوں کا اعتبار نہیں ہم دونوں وہاں محفوظ ہوں گے۔"

ریٹی بولی۔ "آپ پاگل ہو گئے ہیں...... چمگادڑوں کے لئے شہر تک کا سفر کرنا مشکل نہیں ان کی پرواز میں اتنی طاقت پائی جاتی ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے کونے تک ہمارا تعاقب کر سکیں۔ اور میرا شوہر سویلی کی طاقتور چمگادڑ ہے۔ اس کے اختیار میں وہ کچھ ہے جو دوسری چمگادڑوں کے نہیں ہے۔"

تنویر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تب ہی سویلی میں رہنے والی تمام چمگادڑیں دن کے وقت گھروں سے باہر نکلنے سے گریز کرتی ہیں درحقیقت وہ سورج کی روشنی کا سامنا کرنے سے ہچکچاتی ہیں۔"

ریٹی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "بے شک سورج کی روشنی ان کے سیاہ جسموں پر ایسے اثر انداز ہوتی ہے جیسے ان پر آگ کے گولوں کی بارش کر دی گئی ہو لیکن وہ ان گولوں سے اپنے آپ کو بچانے کی صلاحیت رکھتی ہیں ورنہ اب تک میں سویلی کے گھروں کو نذر آتش کر کے ان سب کے منحوس جسموں کو بھسم کر چکی ہوتی۔"

تنویر نے پوچھا۔ "ان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ایسی ضرور ہو گی جس کے ذریعے انہیں ختم کیا جا سکے۔"

ریٹی بولی۔ "اپنی کمزوری کے متعلق کون بے وقوف کسی کو بتاتا ہے۔ سویلی چرچ میں ایک کتاب جزیرے کی بابت موجود ہے مجھے اسے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا شاید اس میں کوئی ایسی تدبیر بیان کی گئی ہو جس کے ذریعے اس جانور نما پرندے سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے۔ تم اس کا مطالعہ کر سکتے ہو۔ وہ چرچ کے تہہ خانے میں رکھی ہوئی ہے۔"

تنویر بولا۔ "سائی لیو چند گھنٹوں میں اسٹیمر

پر چگادڑوں کے لئے انسانی شکار لے کر آنے والا ہے اگر ہم اسٹیمر کے تہہ خانے میں چھپ کر فرار ہونے کی کوشش کریں تو چگادڑ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

ربینی بولی۔"آپ نے ان کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔وہ ہزاروں کی تعداد میں پرواز کرتی ہوئی اسٹیمر کا تعاقب کریں گی پھر اس پر اترنے کے بعد انسانی روپ دھارن کر کے ہمیں ختم کر دیں گی۔"

تنویر نے اثبات میں سر ہلایا اور ربینی کو دلاسہ دینے کے بعد گھر سے باہر نکل کر سویلی چرچ کی طرف آ گیا چرچ کا دروازہ مقفل نہیں تھا ہال کمرے سے ملحقہ کمرے میں لکڑی کا سامان اور اوزار پڑے تھے تنویر بہترین ترکھان تھا لکڑی کا فرنیچر بنانے میں اسے اتھارٹی حاصل تھی لیکن اسے اپنے اس ہنر سے سخت نفرت تھی۔اس لئے ملک کو چھوڑ کر دیار غیر چلا آیا تھا لکڑی کا سامان دیکھنے کے بعد اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں مرنے والوں کی تدفین کے لئے تابوت تیار کئے جاتے تھے تاہم کافی عرصے سے کام بند تھا۔لیکن سامان کمرے میں ہی رکھا ہوا تھا ساتھ والا کمرہ باتھ روم تھا۔ یہاں باتھ ٹب کے علاوہ شاور اور بالٹیاں رکھی ہوئیں تھیں پانی کی ٹنکی چھت پر تھی سیڑھیوں کے پاس تہہ خانے کا دروازہ تھا۔جس پر تالا لگا ہوا تھا۔

تنویر نے پندرہ منٹ کے دوران تمام چرچ کو کھنگال ڈالا لیکن تہہ خانے کی چابی وہاں نہیں تھی مجبوراً اسے تالا توڑنا پڑا۔دروازے سے نیچے سیڑھیوں پر گھپ اندھیرا طاری تھا۔ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا۔اس نے جیب میں سے لائٹر باہر نکالا اور روشن کرنے کے بعد تہہ خانے کے اندر اترنے لگا سیڑھیوں کے لامتناہی سلسلے کو عبور کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو تہہ خانے کے پکے فرش پر کھڑے ہوئے پایا۔فرش پر پرانا اور بوسیدہ فرنیچر بکھرا ہوا تھا۔اس فرنیچر کے درمیان میں سیاہ رنگ کا صندوق پڑا دکھائی دیا۔وہ تہہ خانے کے دروازے کی طرح مقفل نہیں تھا تنویر نے اسے کھول دیا اندر سیاہ رنگ کی چمڑے کی تھیلی کے اندر سویلی کی تاریخی کتاب پوشیدہ تھی

تنویر نے کتاب کو ہاتھوں میں اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھ کر تہہ خانے سے باہر چلا آیا رہائشی کمرہ خالی پڑا تھا سائی لیو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اس کے آنے سے قبل وہ کتاب کا مطالعہ کر سکتا تھا چمڑے کی تھیلی کے اوپر چمڑے کی ہی رسی لپٹی ہوئی تھی جسے گرہ دے کر بند کیا گیا تھا تنویر نے گرہ کو کھول کر کتاب کو باہر نکالا وہ مختصر اور ہاتھ سے لکھی ہوئی سیاہ جلد پر مشتمل کتاب تھی۔پہلے ورق پر سویلی کا حدود اربعہ تھا اور دوسرے صفحے پر سویلی کے رہائشیوں کی تفصیل بمع رہن سہن،طور طریقے اور رسم و رواج کے متعلق تحریر تھا۔وہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔

ایک صدی قبل جزیرہ سویلی کوئی غیر معمولی جزیرہ نہیں تھا یہاں کے رہائشی نہایت شریف النفس اور دین دار واقع ہوئے تھے۔غیر معمولی حدود اربعے کی وجہ سے باہر سے آنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جو کچھ تھے وہ سفری جہازوں کی تباہی کے مرہون منت تھے ایسے وقت میں جزیرے کو پراسرار بیماری نے آ گھیرا سویلی والوں کے جسموں میں خون کی کمی پیدا ہونے لگی اموات کے سلسلے میں روانی آ گئی سویلی کے رہائشی پریشان دکھائی دینے لگے انہوں نے جزیرے کے واحد وچ ڈاکٹر سے رجوع کیا وچ ڈاکٹر خود بھی بیماری کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس کے پاس بیماری کا سدباب نہیں تھا لیکن اس کے محدود دماغ کے مطابق خون کی کمی کو خون کی فراوانی سے دور کیا جا سکتا تھا اس لئے اس نے جزیرے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ مرنے والے رہائشیوں کے جسموں میں بچ جانے والے خون سے استفادہ حاصل کر کے تیزی کے ساتھ پھیلتی ہوئی بیماری کو روک سکتے ہیں یہ ایک کراہیت آمیز طریقہ کار تھا۔لیکن ان کے پاس مزید چارہ کار نہیں تھا اس لئے انہوں نے مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

تب انہیں حیرت انگیز طور پر اپنے جسموں میں فائدہ مند قوتیں انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ خون پینے کے عادت میں بری طرح مبتلا ہونے لگے میں ان دنوں سویلی کا پادری ہونے کی بدولت جزیرے کے پراسرار حدود اربعے اور رسم رواج پر کتاب تحریر کرنے کی

کوششوں میں مصروف تھا۔

سویلی والوں کو غلط عادت میں مبتلا ہوتا دیکھ کر میں نے کتاب کو مکمل کرنے کا ارادہ ترک کیا اور ان کو سمجھانے بجھانے لگا۔ حیرت انگیز طور پر وہ میری باتوں کو سن کر مشتعل دکھائی دینے لگے چند رہائشیوں کے علاوہ جو موذی مرض کی تباہ کاریوں سے اب تک محفوظ تھے۔ باقی تمام سویلی والوں نے میرے خلاف بائیکاٹ کر دیا وہ مجھے ختم کر دینے کے لئے بے چین دکھائی دینے لگے۔

مجھے یہ جان کر دل میں خوف محسوس ہونے لگا کہ میرا جسم صحت مند خون سے لبریز تھا...... اور ان سب کو خون کی اشد ضرورت تھی ان کے خطرناک ارادوں کو بھانپنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو چرچ کی عمارت میں قید کر لیا اور تیزی کے ساتھ کتاب کی تکمیل میں مصروف ہو گیا میں نے جزیرے میں پھیلنے والی بیماری کے متعلق تفصیل کے ساتھ تحریر کیا اب چند تفصیلات کے متعلق نچلی سطور پر تحریر کرتا ہوں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے خونی چمگادڑوں کی شرپسند فطرت سے بچنے کی تدبیر کی جاسکتی ہے۔

سویلی کی مخلوق عام چمگادڑوں کی طرح روشنی سے خائف ہے اس لئے رات کے اندھیرے میں باہر نکلتی ہے شیشے کی چمک یا پھر شبیہ ان کے سیاہ جسموں پر بارودی گولے کی طرح اثر انداز ہوتی ہے پانی کی بوچھاڑ بھی ان کے حملے کے خلاف مفید ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے ان کی تعداد میں کمی غیر معمولی طور پر اس بیماری کا باعث ہے خون کی عدم دستیابی کی وجہ سے انہیں کافی کافی عرصے بھوکا رہنا پڑتا ہے یقیناً یہ بھوک ہی نسل کی کمی کا باعث ہے میری یہ چند سطریں آخری تحریر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

"چرچ کے باہر خونخوار چمگادڑوں کا ہجوم میرے خون سے پیاس بجھانے کا منتظر ہے چند لمحے پہلے انہوں نے دروازے کو توڑنے کا آغاز کر دیا ہے میرے پاس حفاظتی اقدام کے طور پر موم بتیوں کے علاوہ ٹارچ بھی ہے پانی کی چرچ میں کمی ہے لیکن میں ان چند ہتھیاروں کے ساتھ انہیں کچھ عرصے کے لئے مغموم ارادوں میں کامیاب ہونے سے روک سکتا ہوں۔ میرے خیال میں دروازہ ٹوٹ گیا ہے میں مدافعتی کارروائیوں کا آغاز کرتا ہوں۔"

تحریر اچانک ہی ختم ہو گئی۔ میں نے کتاب کو بند کیا اور بستر کے کنارے پر رکھ دیا اس مختصر جدوجہد کے بعد اسے اپنے جسم میں چستی اور پھرتی کا فقدان محسوس ہونے لگا تھا۔ اس لئے کافی کے ساتھ ڈبل روٹی کے چند ٹکڑے کھانے کے بعد وہ بستر پر بے سدھ ہو کر گر گیا۔

رات کے قریب اسے ہوش آیا کمرے میں تاریکی کا راج تھا۔ سویلی کی چمگادڑیں چرچ کا رخ کر آئی تھیں سائی لیو کمرے میں نہیں تھا اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے تنویر پریشان ہو گیا وہ گزشتہ رات اس وقت تک جزیرے پر آ گیا تھا۔

تنویر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چمگادڑ نما انسان غول کی صورت میں چرچ کی طرف رخ کر رہے تھے۔ وہ ان کی مخالف طرف سے نکلتے ہوئے ساحل سمندر پر آ گیا سمندر سنسان پڑا تھا۔ لہروں میں طوفان کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی ۔ ہواؤں کی شدت میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا تھا ایسے عالم میں سمندر میں پوشیدہ چٹانیں خونی ہتھیار کا کام کرتیں تھیں یقیناً سائی لیو ایسے ہی حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی موت تنویر کی موت کے مترادف تھی جزیرے والوں کو اگر خون دستیاب نہ ہوتا تو وہ تنویر کے خون کے پیاسے ہو سکتے تھے۔ لیکن جزیرے سے اسٹیمر کے بغیر فرار ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرتے رہنے کے بعد تنویر واپس اپنے رہائشی کمرے میں چلا آیا چرچ کی عمارت کے پاس واقع میدان میں سویلی کے رہائشیوں کا ہجوم جمع تھا۔ ان کے تیور خطرناک تھے میدان کا ماحول غیر انسانی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

تنویر کو اپنے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تاہم انہوں نے تنویر کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور تنویر کنی کترا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے بستر پر پڑے ہوئے موبائل کو اٹھایا اور اس کی ٹارچ کو روشن کر دیا چارجنگ کم ہونے کی بدولت روشنی میں شدت نہیں تھی لیکن کسی نہ کسی حد تک وہ

تنویر کے کم آ سکتا تھا۔ اس نے کمبل اوڑھا اور بستر پر لیٹ گیا بارہ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی وہ لپک کر بستر سے نیچے اترا۔

سائی لیو واپس آ گیا تھا۔ لیکن دروازے کے قریب پہنچنے پر اسے غیرانسانی آوازوں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا کمرے کے باہر سویلی کے رہائشی جمع ہو رہے تھے۔ تنویر بوکھلاہٹ کے عالم میں کمرے میں کھڑکی کی طرف آ گیا اس نے باآہستگی کھڑکی کے پٹ کو کھولا اور باہر جھانکا۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیا تاہم متعدد انسانی سایوں کو اس نے کمرے کے گرد گھومتے ہوئے پایا۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کو بند کر کے چٹخنی اوپر چڑھادی۔ اور بستر پر پڑے ہوئے موبائل کو اٹھا کر ٹارچ روشن کر دی۔ پھر کمبل سر تک اوڑھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

دروازے کو اب دھکے دیئے جانے لگے تھے چمگادڑوں کے غیرانسانی وجود جب دروازے کے ساتھ ٹکراتے تب دروازے کی چولیں ہل کر رہ جاتیں تھیں تنویر کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ دروازہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ پائے گا۔ وہ سوچنے لگا تہہ خانے میں رکھی ہوئی کتاب میں اور کیا حفاظتی تدبیر لکھی گئی تھی۔ جس پر عمل کر کے وقتی طور پر ہی سہی چمگادڑوں کے خطرناک ارادوں سے بچا جا سکتا تھا۔

سورج کی روشنی رات کے وقت مفقود تھی شیشے کی چمک اور شبیہ بھی کمرے میں نہیں تھی پانی کی بوچھاڑ والی تدبیر قابل عمل تھی اس کی سوچوں کا سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا دور کہیں تڑاخ کی آواز کے ساتھ بجلی گری اس کے ساتھ ہی طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا کمرے سے باہر دروازے کو دھکا مارتے ہوئے غیرانسانی وجودوں میں کھلبلی مچی اور دروازے کو دھکا مارنے کے سلسلے میں کمی واقع ہونے لگی۔ پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ تنویر نے طویل سانس لیتے ہوئے کمبل کو ایک طرف پھینکا اور بستر سے اتر کر کھڑکی کی طرف چلا آیا۔ اس نے کھڑکی کو کھولنے کے بعد باہر جھانکا۔

طوفانی ہواؤں نے کھڑکی کے راستے کمرے میں گھسنے کی کوشش کی سردی کی بدولت اسے اپنے جسم میں پھریری اٹھتی محسوس ہوئی غیرانسانی سایوں کا مجموعہ اپنے کمروں کا رخ کر رہا تھا پانی کی بوچھاڑ نے تنویر کے چہرے کو بھگو دیا اس نے کھڑکی کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا اور بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا سائی لیو کی بے وقوفی کی وجہ سے وہ سویلی میں پھنس کر رہ گیا تھا اگر وہ واپس نہیں آتا تو بارش رکنے کے بعد تنویر کو سویلی جزیرے والوں کی خوراک بننے سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا تھا۔ جزیرے سے فرار ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ حالانکہ وہ بہترین تیراک تھا اور سمندر میں تیر کر قریبی آبادی تک باآسانی رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن بیماری نے اس کے جسم کو کمزور کر کے رکھ دیا تھا۔ زیادہ مشقت وجدوجہد کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا رات کے کسی پہر اس کی آنکھ لگ گئی وہ گہری نیند سو گیا۔

دروازے پر ہلکی دستک نے اسے بیدار کیا تنویر ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اتر آیا بارش اب بھی طوفانی انداز میں برس رہی تھی ایسے حالات میں چمگادڑوں کا کمروں سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا یقیناً سائی لیو واپس آ گیا تھا دستک دوبارہ ہوئی اس کے بعد ریٹی کی متوحش آواز سنائی دی۔

”تنویر دروازہ کھولو...... جلدی کرو...... میں مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی ہوں۔“ تنویر نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی گرادی۔ اور دروازہ کھول دیا وہ پانی سے شرابور سامنے کھڑی تھی دروازہ کھلتے ہی اندر چلی آئی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔

”تمہارا دوست انہیں وعدے کے مطابق انسانی لاش مہیا نہیں کر سکا۔ سویلی کی چمگادڑیں بہت مشتعل ہیں وہ تمہارے خون کی پیاسی تھیں لیکن بارش نے ان کے عزائم کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اپنی رہائش گاہوں کا رخ کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات میرے خون سے پیاس بجھائی جائے میں نے قبل از وقت چھپ کر ان کے ارادوں سے آگاہی حاصل کر لی

اور خاموشی کے ساتھ فرار ہو کر یہاں چلی آئی۔"

تنویر ہونقوں کی مانند اس کی بات چیت سننے میں مگن تھا۔ بات ختم کرنے کے بعد ریٹی نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے بھاگ چلو...... ورنہ وہ ہم دونوں کو کبھی بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

تنویر ہڑبڑا کر بولا۔"سائی لیو جزیرے پر نہیں آیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کا اسٹیمر حادثے کا شکار ہوگیا ہے اور اسٹیمر کے بغیر جزیرے سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔"

ریٹی چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولی۔" چمگادڑیں شیشے اور پانی سے خائف ہیں روشنی ان پر زہریلی شعاعوں کی طرح اثر کرتی ہے ہمارے پاس شیشہ اور روشنی نہیں ہے لیکن سمندر کا پانی وافر مقدار میں ہے ہم اسے استعمال میں لاکر چمگادڑوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔"

تنویر نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔"میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

ریٹی بولی۔"بات سامنے کی ہے۔ اگر ہم سمندر کی لہروں کے درمیان میں اپنی رہائش گاہ بنائیں تو وقتی طور پر چمگادڑوں کے شر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ وہ پانی میں داخل ہوکر ہم تک پہنچنے سے قاصر ہوں گی۔"

تنویر بولا۔"لیکن ان کے پر انہیں ہم تک پہنچانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ تمہارے کہنے کے مطابق وہ اڑ کر سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔"

ریٹی نے جواب دیا۔" ہماری رہائش گاہ مکمل طور پر کیموفلاج ہوگی۔ اور رہائش گاہ کے پیندے میں پانی کی وافر مقدار موجود ہونی چاہئے ہم پانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے۔"

تنویر بولا۔"میرے خیال میں رہائش سے مراد کشتی ہے تمہاری تدبیر قابل عمل ہے۔ جزیرے میں کشتی بنانے کا سامان دستیاب ہے چرچ کی تلاش کے دوران میں نے وہاں پر ضرورت کی تمام اشیاء کو وافر مقدار میں موجود پایا تھا اگر ہم ابھی سے کام کا آغاز کردیں تو دو تین دنوں کے دوران ایسی کشتی بنا سکتے ہیں جس کی چھت کیپسول کی مانند بند ہو۔"

ریٹی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔"یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب تین دنوں تک چمگادڑوں کی طرف سے یلغار نہ ہو۔ بارش کے رکتے ہی وہ حملے کا آغاز کردیں گی۔"

تنویر بولا۔"چرچ کی چھت پر میں نے پانی کی وسیع ٹنکی دیکھی تھی۔ ہم آج کی رات اسے پانی سے بھردیں گے تاکہ حسب ضرورت اسے استعمال کرکے چمگادڑوں سے بچا جاسکے۔" ریٹی نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں کمرے سے باہر نکلنے کے بعد چرچ کی طرف چل دیئے۔ بارش طوفانی انداز میں برس رہی تھی۔ سردی کی شدت میں کافی حد تک اضافہ ہوگیا تھا لیکن انہیں کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔

سویلی جزیرہ سنسان پڑا تھا۔ چرچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر داخل ہوگئے ہال کمرے میں آتش دان کے پاس لکڑیوں کا ڈھیر پڑا تھا تنویر نے لائٹر کی مدد سے آتش دان کو روشن کیا اور جسم کو کسی حد تک گرم کرنے کے بعد دونوں نے پلاسٹک کی بالٹیاں اٹھائیں اور سمندر کے پانی کو ٹنکی میں بھرنے کا آغاز کردیا۔ یہ ایک دشوار ترین اور تکلیف دہ کام تھا لیکن ان دونوں کے پاس مزید چارہ کار نہیں تھا تنویر کے جسم میں طاقت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن گرتے پڑتے آخر کار ان دونوں نے وسیع وعریض ٹنکی کو آدھے سے زیادہ بھر لیا لیکن بارش میں بھیگنے کی وجہ سے صبح کے قریب تنویر کو بخار نے آ گھیرا۔ جزیرے پر بیماری کے افاقے کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ دہکتے ہوئے آتش دان کے قریب ادھ موا ہو کر لیٹ گیا ریٹی اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی اس کے لبوں پر بارش نہ رکنے کی دعا تھی صبح سات بجے کے قریب بارش کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

سمندر کی طوفانی موجوں نے جزیرے کو گھیرے میں لینے کے بعد تباہ کاریوں کا آغاز کردیا سویلی کی گلیوں اور میدانوں میں پانی بھرنے لگا دوپہر کے ڈیڑھ بجے کے قریب تنویر کو افاقہ محسوس ہوا اور بخار کی شدت میں کمی واقع

ہونے لگی۔ تاہم جسم میں کمزوری بہت تھی۔ ربیٔ کی اپنی طبیعت ناساز تھی تمام رات بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے جسم میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن صحت مند جسم کی وجہ سے مشقت طلب کام کرنے کے باوجود بھی کسی حد تک تازہ دم تھی۔ تنویر کے بیدار ہونے کے بعد اس نے طوفانی بارش کے درمیان دوبارہ رہائشی کمرے کا رخ کیا۔ اور کھانے پینے کا تمام سامان چرچ کی عمارت میں منتقل کردیا اس سامان میں سوکھے گوشت کی کثرت تھی دونوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور دوبارہ کشتی بنانے کا آغاز کرنے سے قبل تنویر نے باتھ روم میں لگے ہوئے شاور کو باہر نکال کر اسے چرچ کے دروازے کے اوپر نصب کرنے کے بعد اسے پانی کے کنکشن سے منسلک کردیا قدرت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

آسمان سے پانی چھاجوں برس رہا تھا اور سویلی کا جزیرہ پانی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ چرچ کی عمارت اونچی جگہ پر قائم ہونے کی وجہ سے پانی کے ریلے سے محفوظ تھی تاہم سویلی کے رہائشی مکان نیچے بنے ہونے کی وجہ سے پانی میں ڈوبنے لگے تھے یہ پانی چمگادڑوں کے لئے مہلک تھا لیکن ربیٔ کے کہنے کے مطابق چونکہ چمگادڑیں مکان کی چھتوں کے ساتھ الٹی لٹکی ہوئی تھیں اس لئے جب تک سمندر کا پانی مکان میں لبالب بھر جاتا اس وقت سے پہلے چمگادڑوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا کشتی تکمیلی مراحل میں تھی کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا چرچ میں تابوت بنانے کے لئے متعدد تختے پڑے تھے۔ تاہم کشتی کی چھت بنانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔

شام تک کچھ بھی کھائے پیے بغیر وہ دونوں کام میں مگن رہے اس دوران مختصر وقت کے لئے بارش کی شدت میں کمی واقع ہوئی پھر دوبارہ سلسلے کا آغاز ہوگیا ربیٔ وقتاً فوقتاً چرچ سے باہر نکل کر حالات کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے کر آتی رہی تھی۔ سمندر کا پانی مکانوں میں کافی حد تک بھر گیا تھا اور مختصر مقدار نے اب چرچ کا رخ کرنا شروع کردیا تھا ربیٔ نے دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد دروازے کے خلاء میں کپڑے ٹھونس دیئے لیکن پانی کی روانی میں کمی واقع نہ ہوسکی۔ رات کو تنویر کو دوبارہ بخار چڑھ گیا اس نے بے دلی کے ساتھ کھانا کھایا اور چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد دوبارہ کام میں جت گیا۔

صبح کے قریب کشتی کا آدھا ڈھانچا تیار ہوگیا اسے مکمل کرنے کے لئے تنویر کو مزید ایک دن درکار تھا صبح دس بجے کے قریب بارش اچانک ہی رک گئی اور بادلوں نے سورج کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ دھوپ کی تمازت میں زیادہ حدت نہیں تھی لیکن چمکدار ضرور تھی اگر بارش کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہوتا تو تنویر اور ربیٔ کو سورج غروب ہونے سے قبل کشتی کو تیار کر کے سمندر میں اتارنا تھا بصورت دیگر انہیں آج کی رات چمگادڑوں کا مقابلہ کرنا تھا۔

دونوں تندہی کے ساتھ کام میں جت گئے اب انہیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ ناساز طبیعت کی وجہ سے تنویر کے رویئے میں چڑچڑا پن پیدا ہوگیا تھا وہ بات بے بات ربیٔ کو جھڑک رہا تھا ربیٔ کو اس کی کیفیت کا احساس تھا اس لئے خاموشی کے ساتھ سر جھکائے نہایت تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کام میں مصروف تھی۔

دوپہر تک کشتی کا نچلا تمام حصہ مکمل ہوگیا اب صرف اس کے اوپری حصے کو تختوں کی مدد سے بند کر کے مکمل کرنا باقی رہ گیا تھا تنویر کو شدت کے ساتھ بھوک کا احساس ہو رہا تھا اس نے صبح سے ناشتے کے بعد کچھ بھی نہیں کھایا تھا ربیٔ نے چند گوشت کے ٹکڑے آگ پر بھون کر آلو کے قتلوں کے ساتھ اس کے سامنے رکھ دیئے تنویر نے بے صبری کے ساتھ ان پر ہاتھ صاف کیا اسے جسم میں کچھ توانائی محسوس ہوئی لیکن کھڑے ہوتے ہی چکرا گیا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر گیا ربیٔ نے پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر قریب پڑی ہوئی بالٹی سے پانی نکال کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ لیکن تنویر کی بے ہوشی میں فرق نہیں پڑا۔

پھر ربیٔ نے ہر طرح کے جتن کر لئے لیکن تنویر کو ہوش نہیں آیا۔ رات سر پر آ گئی۔ اور چمگادڑوں کے نکلنے کا وقت قریب آ گیا۔ اگر تنویر ہوش میں نہ آتا

تھے آج کی رات چمگادڑوں سے اکیلے مقابلہ کرنا تھا۔ وہ ایسا باخوبی کرسکتی تھی پانی کا شاور چرچ کے ماتھے پر نصب تھا۔ صرف وال کھولنے کی دیر تھی چرچ کے دروازے پر مصنوعی بارش کا آغاز ہوجاتا تھا۔

رات ہونے سے قبل رینی نے چرچ کے داخلی دروازے کو اچھی طرح بند کرکے کنڈی لگادی چھت کا دروازہ پہلے سے ہی بند تھا۔ وال کھول کر اس نے پانی کے اخراج کا جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہوکر لکڑی کے بینچ پر بیٹھ کر چمگادڑوں کا انتظار کرنے لگی۔ وقت نہایت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ چرچ کی عمارت کے باہر گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ ہال کمرے کے گھڑیال نے آٹھ بجنے کا اعلان کیا اس وقت تک عموماً چمگادڑیں اپنے آشیانوں سے باہر آجاتی تھیں لیکن خلاف معمول آج ایسا نہیں تھا چرچ کے باہر بنے ہوئے میدان میں آج الو بول رہے تھے نو بجے تنویر کے جسم میں نحیف حرکت پیدا ہوئی اور اس نے چند لمحے کسمسانے کے بعد آنکھیں کھول دیں کچھ دیر لاشعوری کے عالم میں رینی کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر رہ گیا۔ اس کا دماغ کچے انڈے کی زردی کی طرح ہل رہا تھا آنکھوں کے آگے اندھیرا طاری ہونے لگا تھا۔ وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔ رینی نے اس کی خیریت دریافت کی۔

تنویر بوجھل لہجے میں بولا۔" میری طبیعت بہت خراب ہے۔ کشتی کو مکمل کرنا اب میرے لئے ممکن نہیں ہے میرے خیال میں آج کی رات چرچ میں بسر کرنے کے بعد کل صبح یہاں سے قریبی آبادی کی طرف روانہ ہوجائیں گے۔"

رینی بولی۔" وہ آج چرچ والے میدان میں نہیں آئے۔ اگر رات کو فرار ہونے کی کوشش کریں تو میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوگا۔" تنویر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں کشتی کا اوپری حصہ کھلا ہوا ہے۔ اگر انہوں نے رات کے وقت حملہ کیا۔ تو ہمارے پاس چھپنے کی جگہ نہیں ہوگی۔ اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ چرچ کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی رینی اور تنویر نے ہڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ رینی بولی۔

" مجھے سویلی والوں سے تمیز واحترام کی توقع نہیں ہے وہ دروازے پر دستک دینے کے بجائے اسے توڑنے کو مناسب خیال کرتے ہیں یہ ضرور سویلی سے باہر کا کوئی بھٹکا ہوا مسافر ہوسکتا ہے۔"

تنویر نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔" بھلا کون......؟" پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

" ہاں یقیناً گزشتہ رات کے طوفان کے بعد کوئی بھٹکا ہوا مسافر سویلی کی طرف آسکتا ہے تم دروازے کے پاس جاکر دریافت کرو۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس دفعہ شدت زیادہ تھی۔ رینی اٹھ کر دروازے کے پاس چلی آئی۔ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

" باہر کون ہے......؟"

جواب میں خاموشی طاری رہی۔ پھر دوبارہ دستک ہوئی۔ رینی متزلزل لہجے میں باآواز بلند کرتے ہوئے کہا۔" اگر اپنی شخصیت اور آمد کے متعلق نہیں بتاؤ گے تو دروازہ نہیں کھلے گا۔ جواب میں پھر دستک ہوئی پھر کسی کے ہانپنے کی آواز سنائی دی لیکن جواب اس دفعہ بھی موصول نہیں ہوا۔ رینی تنویر کے پاس آگئی۔ اور پریشان لہجے میں بولی۔

" وہ جواب نہیں دے رہا۔" حالات کی تشنگی کو مدنظر رکھتے ہوئے بغیر جانکاری کے دروازہ کھولنا سراسر بے وقوفی کے زمرے میں آسکتا ہے میرے خیال میں ہمیں صبح تک انتظار کرلینا چاہئے۔

تنویر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا۔ کہ ایک دفعہ پھر دستک ہوئی اس کے فوراً بعد کی آدمی کی نڈھال آواز سنائی دی۔ تنویر اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ سائی لیو کی آواز تھی۔ اور تنویر کو دروازہ کھولنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ تنویر نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

لیکن پھر سر کو تھام کر رہ گیا۔
ریٹی نے دریافت کیا۔ "کون ہے؟ کیا تمہارا کیا کوئی جاننے والا ہے۔"
تنویر نے جواب دیا۔ "میرا ساتھی لیو ہے...... وہ جزیرے پر واپس آ گیا ہے۔ تم دروازہ کھول دو۔" ریٹی اٹھ کو دروازے کی طرف چل دی۔ اس نے کنڈی گرائی اور دروازے کو کھول دیا سائی لیو نے نہایت خستہ حالت میں سامنے کھڑا تھا اس کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ اور جسم کمزوری کی بدولت تشنج کے عالم میں کانپ رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر آ گیا اور تنویر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
"جناب مجھے معاف کر دیجیے گا۔ لیکن راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے میں کل رات سویلی نہ آ سکا آج تمام دن طوفانی لہروں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب میں نے جزیرے پر قدم رکھا تو چرچ میں آنے کے بجائے سیدھا زومیری میم کے مکان کی طرف چلا گیا۔ میں نے اسے دلگرفتہ حالات سے آگاہ کیا اور لاش کا انتظام نہ کرنے پر پشیمانی کا اظہار کیا۔ تمام چمگادڑیں گزشتہ دن سے بھوکی ہونے کی وجہ سے نہایت مشتعل تھیں لاش کو نہ پا کر وہ سب آپے سے باہر ہو گئیں لیکن زومیری میم نے انہیں قابو کیا۔ اور میرے جسم کے ساتھ لپٹ گئی اس نے مجھے اپنے آپ سے اس وقت تک علیحدہ نہیں کیا جب تک خون سے اس کی پیاس نہ بجھ گئی۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔
"اگر کل لاش کا بندوبست نہ ہوا۔ تو کچھ ایسا ہی دوسرے دن بھی ہوگا۔ وہاں سے جان خلاصی کے بعد میں گرتا پڑتا آپ کے پاس چلا آیا میری آپ سے درخواست ہے کہ میرے کام کا بیڑہ اب آپ کو سنبھالنا ہوگا اسٹیمر ساحل پر لنگر انداز ہے۔ کل صبح آپ کو ویٹا آئرلینڈ کے راستے کے متعلق تفصیل کے ساتھ آگاہ کروں گا۔ انہیں ہر روز ایک لاش دستیاب ہے ورنہ جو حال میرا ہوا ہے وہی کل آپ کا بھی ہو سکتا ہے۔"
تنویر نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا۔
"خون کی کمی کی بدولت مجھے ہلنا جلنا بھی دشوار محسوس ہو رہا ہے اور تم تکلیف دہ سفر کی بات کر رہے ہو؟ یہ ناممکن ہے۔"
سائی لیو بولا۔
"خون کی کمی کو خون کی دستیابی سے دور کیا جا سکتا ہے آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔" تنویر نے انکار میں سر ہلایا...... سائی لیو نے معنی خیز انداز میں ریٹی کے صحت مند جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اگر ایک انسان کی قربانی سے دو کی جانیں بچ سکتی ہیں تو میرے خیال میں مضائقہ نہیں ہے۔" ریٹی نے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن سائی لیو نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں قید کر لیا اور دانت اس کی گردن میں گاڑ دیئے۔

☆......☆......☆

اگلی بڑی عید پر تنویر گھر والوں کو خط لکھ رہا تھا۔
"میں جزیرہ سویلی پر خیریت سے ہوں۔ میری طبیعت اب پہلے سے کچھ بہتر ہے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق جسم میں خون پیدا کرنے والے جرثوموں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اس لئے خون کی مقدار کم ہوتی چلی جا رہی ہے آپ سب کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں نے خطرناک بیماری کا علاج دریافت کر لیا ہے میں اب سویلی کا مستقل رہائشی ہوں جزیرے کے لوگ اپنے کام سے غرض رکھنے والے بے خود انسان ہیں مجھے ان سے کچھ خاص توقع وابستہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ میری بیماری میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں جزیرے پر ڈاک کا انتظام نہیں ہے اس لئے خط کو ارسال کرنے کے لئے مجھے ویٹا جزیرے پر جانا ہوگا میں وہاں روانہ ہو جاتا ہوں یہ سب میرے کام کا ایک حصہ ہے گھر کے تمام افراد کو میرا اسلام دیجیے گا جلد از جلد واپس وطن آنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا تنویر



خونی درندہ

رابعہ عباس۔بستی فتے والی

جرم و سزا کی ایک انمٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی اور پڑھنے والا خود کو ایک انجان حیرتناک اور خوفناک دنیا میں محسوس کرے گا، حقیقت کا پردہ چاک کرتی انوکھی کہانی

جسم وجاں پر سکتہ طاری کرتی عجیب وغریب دل دہلاتی اوراچنبھے میں ڈالتی کہانی

میں کسی کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی گیا تھا۔واپسی پراچھی خاصی دیر ہوگئی اگر کوئی جان پہچان والا ہوتا توشاید رات وہی گزار دیتا۔لیکن خدا کوتو کچھ اور ہی منظور تھا۔میں واپسی پر نکلا بادل اکٹھے ہوکر برسنے کا ارادہ بنا رہے تھے۔راتیں بھی اچھی خاصی اندھیری تھی۔ابھی 5سے6 کلومیٹر ہی سفر کیا ہوگیا۔ہوا شروع ہوگئی جو آہستہ آہستہ طوفان کی شکل اختیار کرنے لگی۔اور میری پریشانی بڑھنے لگی۔اگر یہاں بارش شروع ہوگئی۔تو کیا کروں گا۔رات کہاں سر کروں گا اپنے خیالوں میں گم بائیک چلا رہا تھا اچانک بائیک کسی پتھر سے ٹکرائی اور گرتی چلی گئی۔جس کی وجہ سے میری ٹانگ شدید زخمی ہوگئی اور تیزی سے خون بہنے لگا۔جلدی سے اپنی شرٹ اتار کر ٹانگ پر باندھ لی۔اور اپنا سفر دوبارہ شروع کردیا۔میں جلد از جلد کسی آبادی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔اور پھر ایسا کرنے میں کامیاب ہوگیا کیونکہ

تھوڑی دور آبادی کے آثار نظر آنے لگے جس کو دیکھ کر مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ لیکن قریب پہنچ کر ایسا محسوس ہوا ۔شاید یہ گاؤں صدیوں سے یوں ہی سنسان پڑا ہے یہاں سے کوئی انسان گزر کر بھی نہ گیا ہو۔ لیکن کچھ مکان ابھی بھی اپنی اصلی حالت میں تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے مجھے پتہ تب چلا جب تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ بہت زیادہ سوچ بوجھ کے بعد میں نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بار، دوبار، تین بار، آخر مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا کہ اندر سے آواز آئی۔

مہربانی کر کے راکھشش ہمیں بخش دو، ہماری جان چھوڑ دو روتا بلکتا بزرگ پتہ نہیں کس کی منتیں کر رہا تھا۔ میں نے پھر دروازہ ٹوک کیا تو بزرگ آدمی کے رونے میں روانی آ گئی۔

”اللہ کی قسم راکھشش چلے جاؤ۔ میرا ایک بیٹا میرے پاس رہنے دو چلے جاؤ“ مجھے یہ راز سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس گاؤں کے لوگ کسی بڑی مشکل میں گھرے ہوئے ہیں۔ ٹانگ کی درد کی وجہ سے میں زیادہ دیر رک نہیں سکتا تھا میں نے آواز دی۔ انکل میں ایک مسافر ہوں اور طوفانی بارش والی رات آپ کے گھر گزارنا چاہتا ہوں خدا کے نام پر یقین کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر میں رات گزارنے دیں۔ میں آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا“

اندر سے آواز آئی۔ ”تمہارا نام کیا ہے“

”میرا نام محسن عزیز ہے“ تقریباً دو تین منٹ کے بعد دروازہ کھولا گیا۔ میں بائیک لے کر اس مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ بزرگ نے مجھے ایک علیحدہ چھوٹے سے کمرے میں رات بسر کرنے کے لئے کہا۔ میں ایسی چیز کو غنیمت جانتے ہوئے اس کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ساری رات اس گاؤں کے بارے میں سوچتا رہا ۔ پتہ نہیں کب آنکھ لگی اور جب آنکھ کھلی تو دن اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا اور پورے گاؤں میں رونق بحال تھی۔ اس رونق کو دیکھ کر یقین ہوتا کہ یہ گاؤں آباد ہے۔ تب میرے ذہن میں وہ رات والا منظر گھومنے لگا جہاں چاروں طرف خاموشی کا راج تھا۔ کسی بھی گھر سے روشنی نہیں نکل رہی تھی۔ لیکن زیادہ دیر میں اپنے خیالوں میں نہ رہا۔ اور واپسی کی تیاری کرنے لگا میں نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کا راستہ ناپا اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ میں ان گاؤں والوں کی مدد ضرور کروں گا۔ کیونکہ اب میں جلدی میں تھا۔ اور گھر والوں کو بھی نہیں بتایا تھا سب لوگ دیکھنے میں تو خوش تھے لیکن چہرے پر خوف کے سائے برقرار تھے۔ سارے راستے میں سوچتا آیا جب گھر پہنچا تو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”کہاں گئے تھے اور رات کہاں بسر کی۔“ تو میں نے سارا واقعہ گھر والوں کی گوش گزار کر دیا۔ جس کو سن کر سب پریشان ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ میرا دوست اعتزاز عرف جج میری اس کام میں مدد کر سکتا ہے جب میں نے یہ بات جج کو بتائی تو وہ میرے ساتھ اس گاؤں والوں کی مدد کرنے پر رضامند ہو گیا اور پھر ہم نے گھر والوں سے اجازت لی اور ایک نیک مشن پر روانہ ہو گئے۔

آج جتنی خوشی مجھے ہو رہی تھی شاید زندگی میں اتنی بڑی خوشی نہ ملی ہو۔ تقریباً عصر کے ٹائم ہم اس گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہ بزرگ بڑی خوش دلی سے ہمیں ملیں اور ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ اور پہلے والے واقعہ پر اچھا خاصا شرمندہ ہوئے لیکن میں نے کہا۔

”انکل کوئی بات نہیں آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہم دونوں دوست آپ لوگوں کی مدد کے لئے آئے ہیں۔“

بزرگ بولے۔” بیٹا ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

”انکل آپ کا نام کیا ہے۔“

”بیٹا میرا نام اسحاق ہے اور میرے بیٹے کا نام محمد فیضان احمد فیاضی ہے۔“

”بابا میرا نام محسن عزیز ہے اور یہ میرے دوست ہیں اس کا نام اعتزاز عرف جج ہے۔ انکل میں وہ لڑکا ہوں جو طوفانی بارش میں آپ کے گھر رات گزارنے آیا تھا۔ تب میں آپ لوگوں کے حالات دیکھ کر گیا تھا تو میں نے اپنے گھر والوں کو بتایا تو میرے دوست نے کہا کہ ہم آپ لوگوں

لی مدد کریں گے سو ہم دونوں آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی باباجی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بیٹا جہاں پورے کا پورا گاؤں ہار گیا ہے وہاں تم دونوں کیا کرلوگے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ جو سچ ہو جیت اس کی ہوتی ہے۔ سو دن چور کا ایک دن سادھ کا ہوتا ہے۔"

"جو بات ہمت بہادری سے لڑی جائے جیت اسی کی ہوتی ہے۔"

"ہمیں اس پاک کتاب پر پورا یقین ہے جس کی بدولت ہم ہاری ہوئی بازی بھی جیت سکتے ہیں۔"

باباجی جلدی سے اٹھے اور باہر کا دروازہ بند کرکے اچھی طرح چیک کیا اور پھر ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے۔ آنکھوں سے آنسو صاف کرکے اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"بیٹا میں تو یہ دعا ہی کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات آپ دونوں کو اس نیک کام میں کامیابی عطاء کرے اور تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔" اور ہم دونوں نے کھلے دل سے (آمین) کہا۔

"بیٹا یہ کوئی آج سے 5 سال قبل کی بات ہے کہ ہمارے اس ہنستے کھیلتے گاؤں کو کسی کی بدنظر لگ گئی 11 ستمبر کی رات میں ایک انہونی آئی جس میں ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی اغوا ہوئی جس پر گاؤں والوں نے مختلف قسم کی باتیں کیں۔ جس کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کی ماں اس دنیا سے چل بسی۔ تیسرے روز اس لڑکی کی لاش آبادی سے تھوڑی دور پہاڑیوں سے ملی۔ جس کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ زیادتی کے بعد جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو اس کا جسم لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ جس کو دیکھ کر سارے گاؤں والے دنگ رہ گئے۔ جس کو گاؤں والوں نے چپ چاپ آبائی قبرستان میں دفنا دیا۔ اور پھر تیسرے دن میرا بیٹا لاپتہ ہو گیا اگلے دن اس کی لاش بھی وہیں سے ملی جس کی حالت اس لڑکی سے مختلف نہ تھی ،جتنے منہ اتنی باتیں ہوتی رہیں۔"

"کوئی کہتا اس نے اس لڑکی کے ساتھ ظلم کیا ہوگا جس کے کارن اس لڑکی کی روح نے اس کا یہ حال کر دیا لیکن میرا دل یہ بات ماننے سے انکاری تھا کہ میرا بیٹا ایسی حرکت نہیں کرسکتا مگر میری بات پر کسی نے یقین نہ کیا اور مجھے یوں روتا بلکتا چھوڑ کر سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ اور پھر میں نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنے بیٹے کو ان بدنصیب ہاتھوں سے کفن دے کر منوں مٹی تلے دبا دیا۔"

باباجی کے رونے میں روانی آگئی۔ ہم نے بھی باباجی کو رونے کا موقع دیا اور پھر وہیں سے سلسلہ شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

"پھر ایسے واقعات کا ہونا معمول بن گیا کسی کی بیٹی تو کسی کا بیٹا روز اغوا ہوتا تو اس کی لاش بری حالت میں گاؤں سے باہر ملتی جسم سے سارا خون نچوڑنے کی وجہ سے موت ہوتی۔ اور جسم پر مختلف قسم کے نشانات پائے جاتے۔ جس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ کسی درندے کے دانتوں کے نشان ہیں۔ جو جسم کے مختلف حصوں کو ادھیڑ کر سارا خون چوس جاتا ہے۔"

جج بولا۔" ایک منٹ بابا۔ (تسی بریک تے پیر رکھو) مجھے ایک بات ہضم نہیں ہوئی لڑکی کی ہر لاش سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ زیادتی کے بعد جسم سے سارا خون نچوڑا گیا ہے اور پھر جسم پر درندے کے نشان یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ کسی انسان کا کام ہے۔" جس پر میں نے بھرپور اتفاق کیا۔

میں نے کہا۔"ہوسکتا ہے انکل اس درندے کو کسی نے پال رکھا ہو اور اس کی خوراک انسانی خون ہو۔ وہ درندہ خون پیتا ہو اور انسان ہر عورت کو اپنی دلی تسکین کے لئے استعمال کرتا ہو۔"

لیکن انکل نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔

"نہیں بیٹا میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ راکھشش کی طرح لمبا چوڑا تقریباً 8 فٹ اس کا قد ہوگا میں نے اسے خود اپنی بیٹی کو اٹھا کر جاتے دیکھا ہے لیکن یہ بدنصیب باپ اپنی بیٹی کے لئے کچھ نہ کرسکا۔ کچھ نہ کرسکا۔" اور دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر رونے لگا۔

اور پھر ہم دونوں اٹھ کر باہر آ گئے پھر ہم نے پلان

بتایا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم دونوں پھر پورے پلان کے ساتھ رات دس بجے گاؤں سے باہر ایک اونچے درخت پر چڑھ گئے اور ایک جگہ بہت زیادہ ٹہنیاں اکٹھی کی ہوئی تھی اس کے اوپر گھاس وغیرہ ڈال کر بیٹھ گئے جس کے اوپر کھڑا ہونے سے پورے کا پورا گاؤں نظر آتا تھا۔ جو کہ اتنا بڑا نہ تھا بیٹھے بیٹھے ہم تھکنے لگے تقریباً صبح کی اذان کا ٹائم قریب تھا کہ ایک طرف سے شور سنائی دیا جب ہم نے سرچ لائٹ ماری آگے والا منا ظر دیکھ کر جج کے ہاتھ سے ٹارچ گرتے گرتے بچی۔ سامنے کی طرف ایک گلی تھی جس کے اندر یہ واقع پیش آیا تقریباً دس فٹ لمبا، ناخن اس کے لمبے لمبے اور منہ سے آگ برس رہی تھی دیکھنے والا اسے دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا اور پھر وہ راکھشش اسے اٹھا کر کندھوں پر ڈالتا اور چلتا بنا جب وہ ہمارے قریب سے گزرا۔ ممکن تھا اگر وہ ہاتھ اوپر کرتا تو ہم دونوں کو پکڑ لیتا جب وہ درخت کے نیچے سے گزر گیا تو تب ہم دونوں بھی اترے اور اس راکھشش کے تعاقب میں نکل پڑے میں سارے راستے جج کو بکتا گیا۔

”یار آہستہ دن چڑھنے والا ہے کہیں اس کو ہماری موجودگی کا پتہ نہ چل جائے۔“ جج غصے سے بولا۔

(یار مساں مساں تا لگے تورن ڈائیاں اتوں تو) میں نے جلدی سے جج کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور وہ خاموش ہو گیا تھوڑی آگے جا کر وہ یکدم گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ بہت زیادہ تلاش کرنے کے باوجود بھی نہ ملا۔ ہمیں اپنی ذرا سی لاپرواہی پر سخت طیش آیا۔

ابھی ہم واپس جانے کے لئے مڑے ہی تھے کہ ہمیں کسی کے چلانے کی آواز سنائی دی جس کے ساتھ ہنسنے کی بھی۔ ہمارا شک بالکل سچ ہوتا دکھائی دیا اور پھر میں اور جج اس کے دوازے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ دو آدمی تھے جو اس لڑکی پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہے تھے ہمارے دومنٹ اور رکنا کسی بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

جج جلدی سے بولا۔ ”محسن تم پولیس کو فون کرو کیونکہ چوکی نزدیک ہے میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دومنٹ میں پولیس وہاں پہنچ چکی تھی ایک آفیسر نے جب دروازہ کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر سب دنگ رہ گئے کہ ایک درندہ نما مشین اس لڑکی کے اوپر حرکت کر رہی ہے۔ جس کے ذریعے بڑی بے دردی سے اس لڑکی کے جسم سے خون نکالا جا رہا تھا جج کے ہاتھ میں جو آیا اس نے مار مار کر مشین کو توڑ دیا مشین میں جمع شدہ خون نیچے بہنے لگا اور وہ دونوں شخص جلدی سے خون چاٹنے لگے اس منظر کو دیکھ کر مجھے تو قے آنی شروع ہو گئی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اتنے میں افسران دونوں آدمیوں کو ہتھکڑی لگا چکا تھا اور اس مکان کے اندر سے ہزاروں بوتلیں خون کی برآمد ہوئیں اور ایسے کئی راکھشش ملے جن کو کمپیوٹر کے ذریعے چلاتے تھے اور خونی مشین جن کے ذریعے خون نکالتے تھے پولیس والوں نے سب سامان اپنی گاڑی میں رکھ لیا دیکھنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی کہ اس طرح کے شیطان بھی اس دنیا میں ہیں جو کہ دوسرے انسانوں کا خون چوستے ہیں۔ اتنے میں گاؤں والوں نے اعتزاز عرف جج اور محسن عزیز کو کندھوں پر اٹھا لیا اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میڈیا بھی پہنچ گئی سر یہ گینگ کس نے پکڑوائی۔

افسر نے میرے اور جج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں نوجوانوں نے۔“ اور ہمیں اس بات پر خوشی تھی کہ ہم نے انسانیت کے دشمن کو ان کے انجام تک پہنچایا۔

اگلے دن اخبار ٹیلی ویژن پر ہم دونوں کے چرچے عام تھے۔ میں جج کے گلے ملتے ہوئے بولا۔

”یار تم جیسے بہادر انسان کی ہمارے ملک کو ضرورت ہے جج کوئی امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھنے والا نہیں تھا بلکہ ایک بستی فتے والی سے تعلق رکھنے والا اور لاہور فیکٹری میں کام کرنے والا بہادر لڑکا ہے۔ اور محسن عزیز کوٹھا کلاں سے تعلق رکھنے والا بہادر لڑکا ہے ان دونوں کی زبانی یہ واقع میں نے آپ سب کے گوش گزار کر دیا اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے (آمین)



خون آشام

صفدر علی۔ فیصل آباد

خونی مخلوق کی دیدہ دلیری رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ایسا لگتا کہ موت نے ہر طرف اپنے نوکیلے پنجے گاڑ دیئے ہیں ہر طرف خوف و ہراس پھیل جاتا اور پھر......

خوف کے افق پر چنگھاڑتی ہوئی......عجیب الخلقت مخلوق کی ناقابل یقین......کہانی

ڈون ولیج نامی یہ چھوٹا سا قصبہ تقریباً ستر گھروں پر مشتمل ہوگا۔ یہ قصبہ بجلی اور گیس جیسی سہولتوں سے محروم تھا۔ لیکن یہاں پر رہنے والے امن پسند لوگوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ قصبہ چاروں طرف سے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر حکومت کوئی خاص توجہ نہیں دیتی تھی۔ یہاں کے لوگ نہایت سادگی سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لوگ سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی دو مہینوں کی خوراک گھروں میں ذخیرہ کر لیتے کیونکہ شدید برفباری کی وجہ سے پورا گاؤں ٹھٹھر جاتا۔ اور پھر اس عرصے کے دوران سورج بھی نہیں نکلتا تھا۔

رات کے تقریباً بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ اچانک ہی ایک سایہ حرکت میں آیا جو برف پر چلتا ہوا فرڈ کے گھر کے آگے رکا۔ فرڈ کا گھر گاؤں کے سرے پر تھا۔ دروازہ بجایا گیا۔ فرڈ اور اس کی بیوی جاگ اٹھے۔ فرڈ دروازے

کے پاس گیا اور پوچھا "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "میں میگ ہوں باہر آؤ۔"

"میگ!" فرڈ اور اس کی بیوی دونوں حیران ہو گئے کیونکہ میگ پچھلے ایک مہینے سے لاپتہ تھا۔ اس کے بیوی اور بچے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ گاؤں میں پولیس تو تھی نہیں اس لئے گاؤں والوں نے بھی ان کی مدد کی مگر نتیجہ صفر رہا۔

دروازہ پھر بجایا گیا۔ فرڈ جلدی سے لونگ کوٹ پہن کر باہر نکل گیا اور اس کی بیوی واپس کمرے میں چلی گئی۔

جب صبح ہوئی تو اپنے ہزبینڈ کو بستر پر نا پا کر وہ پریشان ہوگئی اور پورا گھر چھان مارا جب فرڈ نہ ملا تو اس نے ہمسائیوں سے مدد مانگی پھر کیا تھا بات پورے گاؤں میں پھیل گئی اور سب اسے تلاش کرنے نکل پڑے۔

گاؤں کا سردار جو کہ چالیس کے قریب کا شخص تھا۔ جس کا نام مارٹن تھا۔ مارٹن نے فرڈ کی بیوی سے رات کا احوال سنا تو پریشان ہوگیا مارٹن نے فرڈ کی بیوی کو خاموش رہنے کا کہا اور اس بات کا ذکر صرف پاسٹر جوزف سے کیا۔

اس قصبے میں صرف ایک ہی چرچ تھا اور ایک ہی پاسٹر تھا۔ جو بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ پاسٹر بھی مارٹن کی بات سن کر پریشان ہوگیا۔ فرڈ کو بہت تلاش کیا گیا آس پاس کے جنگلات بھی دیکھے گئے مگر وہ نہ ملا۔

رات کو ہونے والی برفباری نے پیروں کے نشان بھی مٹا دیے۔

شام ہوگئی تو سردار نے کہا۔ "اب اپنے اپنے گھروں کو جایا جائے۔ کل فرڈ کو جنگل کے اندر جا کر تلاش کیا جائے گا۔"

صبح کا اجالا پھیلا تو ایک اور بری خبر سامنے تھی کہ رات کو ڈائس بھی غائب ہوگیا ہے۔ اس کے گھر میں صرف ڈائس اور اس کا بیٹا رہتا تھا بقول اس کے بیٹے کے رات کو فرڈ نے اس کے باپ کو گھر سے باہر بلایا تھا۔ جسے خود اس کے بیٹے نے موم بتی کی روشنی میں دیکھا تھا اور اسے کوئی مغالطہ نہیں تھا۔

اب بات پورے گاؤں میں پھیل گئی اور انہوں نے دو لوگوں کی تلاش شروع کردی جنگل بے حد گھنا تھا، اس لیے جنگل میں نیم تاریکی کا راج تھا۔ سب لوگ دس دس کی ٹولیوں میں تقسیم ہوکر جنگل کی مختلف سمتوں کو چل دیے۔

آخر ایک ٹولی کو جنگل کے بیچ و بیچ فرڈ کی لاش مل گئی۔ جس کا سر اس کے تن سے جدا تھا سب لوگ واپس آ گئے لاش لے کر اور سردار اور پاسٹر کے پاس پہنچ گئے۔ پاسٹر نے جب لاش کو دیکھا تو پریشان ہوگیا۔ اور لوگوں کے لیے یہ سوال پیدا ہوگیا کہ اگر فرڈ مر چکا ہے تو کیا ڈائس بھی مگر اس کی لاش تو کہیں نہیں ملی۔

سردار نے پاسٹر کی پریشانی بھانپ لی اور ان سے پریشانی کا سبب پوچھنے لگا۔ پاسٹر نے سب لوگوں کی نظروں سے بچ کر سردار کی توجہ فرڈ کے دھڑ کی رگوں کی طرف کروائی جس پر ایک قطرہ بھی خون موجود نہ تھا۔ سردار کی آنکھیں پھیل گئی، مگر اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ "لگتا ہے اس پر شیر نے حملہ کیا ہے۔" سب لوگ سردار کی بات سے مطمئن ہو گئے اور گھروں کو چلے گئے۔

لاش کو کل دفنایا جانا تھا۔ لوگوں کے جانے کے بعد سردار نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو پاسٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ سردار کا خیال تھا کہ فرڈ کسی خون آشام کا شکار ہوا ہے۔ پاسٹر نے کہا۔ "ابھی ثابت ہو جائے گا۔" پاسٹر چرچ سے اپنے کمرے میں گیا جو کہ چرچ میں ہی تھا۔ جب واپس آیا تو پاسٹر کے ہاتھ میں ہتھوڑی اور ایک لکڑی کی صلیب تھی۔ پاسٹر نے صلیب فرڈ کے دل کے مقام پر رکھی اور ہتھوڑی کی ضرب سے اس کے دل میں اتار دی۔

فرڈ کے مردہ جسم نے جھرجھری لی اور ساکت ہو گیا۔ سردار کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں چھا گئی۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر لاش کو صندوق میں بند کیا۔ اور صبح دفنا دیا گیا۔

اگلی صبح ایک اور شخص غائب تھا۔ اسے دو دن

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تک لگاتار ڈھونڈا گیا مگر وہ نہ ملا۔ یہ شخص گھر میں اکیلا رہتا تھا اس کا کوئی نہ تھا ایک بیوی تھی جو تین سال قبل انتقال پا چکی تھی۔

ادھر سردار پاسٹر سے ملا اور دونوں نے فیصلہ کر کے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو خون آشام والی بات بتا دی گئی۔ پھر کیا تھا سب گاؤں والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ سردار نے کہا۔

''ابھی ان کی تعداد کم ہے صرف تین، ہمیں انہیں ڈھونڈ کر ختم کرنا چاہیے۔ لوگ ایسا کریں کے اپنے گھروں سے رات کے وقت نکلنے سے گریز کریں اگر بہت مجبوری کے ساتھ نکلنا بھی پڑے تو ساتھ دو تین فرد ہونے چاہیے اس کے علاوہ آپ سب کو ایسی سیٹیاں دی جائیں گی جن کی آواز خاصی بلند ہوگی۔ یہ سیٹی ایمر جنسی ہوگی اور اس کے علاوہ اپنے پاس حفاظت کے لئے کوئی ہتھیار رکھا جائے۔''

یہاں کے لوگ ویسے بھی روحوں کو بہت مانتے تھے اب تو شام ہوتے ہی گاؤں میں ہولناک سناٹا چھا جاتا گویا لوگ اپنی آواز نکالنے سے بھی ڈرنے لگے ہوں۔ پھر ہر رات لوگوں کے دروازے بجائے جانے لگے۔ ساری ساری رات سیٹیاں بجنے لگیں۔ یوں اس گاؤں کی راتیں بھی حرام ہو گئیں۔ صرف چرچ کا دروازہ نہ بجایا جاتا۔

ایک بار پھر سب لوگ جمع ہو گئے اور سردار سے اس مسئلے کا حل پوچھنے لگے۔ اس بار پاسٹر نے تجویز پیش کی کہ گاؤں کے نوجوان ٹولیاں بنا کر باری باری پہرہ دیں گے۔ اور اپنے پاس ہتھیار اور مشعل وغیرہ بھی رکھیں گے۔

اسی رات نوجوان پہرہ دینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے انہوں نے رات کو ایک سایہ جنگل سے آتے دیکھا تو اس پر گولیاں چلا دیں۔ وہ سایہ چیختا ہوا جنگل میں گھس گیا۔ اس کے بعد ساری رات کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ رات نہایت پرسکون گزری۔ اور صبح ہوتے ہی ایک ٹولی جن میں پاسٹر اور سردار بھی شامل تھے خون آشاموں

رشتے داروں کے حقوق

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب رشتے داروں کی معاشی بحالی پر زور دینے کے ساتھ کم زور اقرباء کے حقوق کی ادائی کی بھی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام افراد پر صدقہ کرنے کے بجائے، رشتے داروں پر خرچ کو بھی ثواب کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مفہوم: ''عام مسکین پر صدقہ سے تو ایک گناہ ہی ثواب پائے گا، لیکن اگر کوئی شخص غریب رشتے دار کو صدقہ دیتا ہے تو اس کو دگنا ثواب و اجر ملے گا، ایک اجر تو صدقے کا دوسرا صلہ رحمی کا۔'' (نسائی)

وقت کو غنیمت جانو

حضرت حاجی محمد شریف ؒ فرماتے ہیں: ''زندگی کا ایک ایک سانس بے بہا گوہر ہے۔ انسان اس زندگی مین اگر ایک دفعہ بھی سبحان اللہ کہہ لے، تو جنت میں درخت لگ جاتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد اگر ہزار دفعہ بھی ''سبحان اللہ' کہتا رہے تو کوئی درجہ نہیں ملے گا۔ جنت میں درجات کی ترقی، اس دنیا میں ہی ہوتی ہے۔

دنیا دار العمل ہے، یہاں پر اعمال کی قیمت پڑتی ہے اور آخرت دار الجزاء ہے، وہاں انسان کو عملوں کی جزا دی جاتی ہے۔

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

کی تلاش میں جنگل روانہ ہوئے، مگر ان کا کوئی نشان تک نہ ملا۔ تین دنوں میں پورا جنگل چھان مارا۔ اس دوران ایک ٹولہ جو رات کو پہرہ دے رہا تھا اس کا ایک آدمی ٹولے سے الگ ہوگیا اور پھر وہ بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگیا۔

اب ان کی تعداد میں ایک اضافہ اور ہوگیا تھا۔ پھر تو جیسے ہر طرف موت نے اپنے پنجے گاڑ دیے۔ اس بار پاسٹر نے کہا کہ۔ "ایسی جگہ خون آشاموں کو تلاش کرنا چاہیے جہاں کوئی نہ آتا جاتا ہو۔"

تب سردار نے کہا۔ "ایسی جگہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے پرانا قبرستان جسے آبادی بڑھنے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا۔ اس قبرستان میں ایک چرچ بھی تھا جو کہ اب کھنڈر میں تبدیل ہوچکا ہے۔"

سردار نے دس بارہ لوگوں کو لیا جنہوں نے ہاتھ میں ہتھوڑی اور نوک دار لکڑی کی صلیب پکڑ رکھی تھی۔

جب یہ لوگ قبرستان پہنچے تو قبریں نہایت بوسیدہ ہوچکی تھیں۔ یہ لوگ چرچ کی طرف بڑھے ماحول میں عجیب سی وحشت برپا تھی۔

چرچ کے پاس پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ چرچ کی ایک دیوار گرچکی ہے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو انہیں وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ پاسٹر سب سے آگے تھا۔ پاسٹر تہہ خانے کی طرف بڑھنے لگا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے جا گرا۔ پاسٹر کو اپنی گردن پر چبھن کا احساس ہوا لیکن پاسٹر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بائبل پڑھنا شروع کردی۔

سامنے چاروں خون آشام کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگے۔ پھر اچانک خون آشاموں نے ان پر حملہ کردیا، جس سے پچھلے لوگ اوپر کی طرف بھاگے مگر پاسٹر نے پھرتی کے ساتھ ہتھوڑی پھینک کر تہہ خانے کی کھڑکی کا کانچ توڑ دیا۔ خوش قسمتی سے اس دن سورج نکلا تھا جس سے دھوپ اندر آنے لگی۔

دھوپ کا اندر آنا تھا کہ خون آشام چیختے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے اور کونے میں جا گرے۔ پاسٹر نے چیختے ہوئے نوجوانوں کو آواز دے کر باقی کھڑکیاں توڑنے کا کہا۔ پھر پاسٹر نے آئینے لانے کہا تو فوراً ہی آئینے منگوائے گئے۔ تو دھوپ آئینوں کے ذریعے سے خون آشاموں پر ڈالی گئی، تو ان کی چیخوں سے ماحول لرز اٹھا اور ساتھ ہی انہیں آگ لگ گئی۔

وہ رات گاؤں والوں کے لئے سکون کی رات ثابت ہوئی۔

جیک کو جیسے ہی جنگل کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا گیا، تو لوگوں نے اسے پکڑ کر باندھ دیا اور پاسٹر کو بلوایا، جب پاسٹر آیا تو لوگوں نے کہا۔ "یہ کل کا غائب ہے اور آج لوٹا ہے اور اس کی گردن پر دو نشان بھی ہیں۔"

پاسٹر نے کہا۔ "رکو میں دیکھتا ہوں کہ یہ خون آشام ہے کہ نہیں۔"

بائبل پڑھی گئی لیکن جیک پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پاسٹر نے کہا۔ "مزید تسلی کے لئے میں اسے چرچ لے جاتا ہوں۔"

پاسٹر جیک کے ساتھ چرچ میں داخل ہوا اور چرچ کا دروازہ بند کردیا۔ جیک کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جہاں پہلے ہی چار لوگ بیٹھے تھے جو کہ اینڈرسن خاندان کے تھے۔ یہ لوگ گاؤں کے آخر میں رہتے تھے پاسٹر نے جیک کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی بے وقوف لڑکے ابھی رک جاؤ ہم اپنی تعداد بڑھالیں تو پھر ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا، ورنہ پہلے کی طرح ہم مارے جائیں گے۔" سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی جس سے ان کے دو نوکیلے دانت نظر آنے لگے۔

پاسٹر کی وجہ سے ایسے خون آشام پیدا ہوئے جو بائبل سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔

جی ہاں اب پاسٹر بھی ایک خون آشام بن گیا تھا۔ جب اسے تہہ خانے میں اپنی گردن پر چبھن کا احساس ہوا تھا، اسی وقت ایک چمگادڑ نے اسے کاٹ لیا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM



پراسرار کہانی

رضوان قیوم۔راولپنڈی

پورے قبرستان میں ویرانی کا تسلط تھا اور ایک نوجوان ایک پرانی قبر میں بیٹھا چلا کاٹ رہا تھا کہ اچانک ایک کان پھاڑ دینے والی حیرت ناک اور ہیبت ناک آواز گونجی تو......

حرص ولالچ کی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش......دل گرفتہ اور دل شکستہ کہانی

یہ مافوق الفطرت سچی کہانی مجھے ایک ایسے ریٹائرڈ فوجی نے سنائی ہے جو کہ 1967ء میں جب مشرقی پاکستان قائم تھا وہ اس زمانہ میں محکمہ فوج میں جیسور کے مقام پر پارک آرمی کی ایک مشہور کور EME میں بحیثیت سپاہی تعینات تھا۔ اس ناقابل یقین مافوق الفطرت واقعہ کی شروعات اس نے اس طرح کی۔

میرا نام عبدالقدوس ہے اور میرا تعلق چھتر پانی جو کہ مری کے قریب علاقہ ہے وہاں سے ہے۔ GHQ راولپنڈی سے مخصوص فوجی جہاز C130 کے ذریعے 1967ء میں ڈھاکہ EME ہیڈ آفس پہنچا۔ وہاں سے آگے ہمارا تبادلہ جیسور کر دیا گیا۔ پہلی نظر میں مجھے وہاں کی کوئی چیز پسند نہ آئی۔ وہاں کے موسم میں چپ چپاہٹ، مچھروں، کھٹملوں اور جونکوں کی بہتات، مغربی پاکستان سے نئے آنے والوں کے لئے

اکتاہٹ بے چینی کا باعث بنتی تھی۔ جس فوجی بیرک میں ہماری رہائش تھی، وہاں پچانوے فیصد نفری مقامی بنگالیوں کی تھی۔ مجھے ان کے حلیہ اور لباس سے کوفت ہوتی تھی۔ ان کی تنگ نظری کی وجہ سے ہم چند مغربی پاکستان کے فوجی اہلکاروں نے اپنا علیحدہ گروپ بنایا ہوا تھا۔ نیز ہم مغربی پاکستان والوں کی تعداد بہ مشکل 8,7 ساتھیوں پر مشتمل تھی۔

اگرچہ اس بیرک میں میری تمام ساتھیوں سے علیک سلیک تھی لیکن وحید قریشی نامی سپاہی جس کا تعلق مندرا ضلع راولپنڈی سے تھا اس سے میری دوستی بہت ہی زیادہ حد تک بڑھ چکی تھی۔ یہاں تک کہ میری اور اس کی دوستی پورے بیرک میں بہت مشہور ہوگئی تھی۔ وحید قریشی درحقیقت میری فطرت اور پسند کے عین مطابق تھا۔ وہ بے حد کم گو سنجیدہ اور کتاب دوست ہونے کے علاوہ کام سے کام رکھنے والے کے علاوہ دل کا بہت سخی تھا۔ وہ اکثر اتوار یا جمعہ کے روز مجھے بازار لے جاکر میری بہت خاطر تواضع کرتا تھا۔

ہم اس روز خاص طور پر جیسور کے اکلوتے بازار میں جاکر ناریل، اناس وغیرہ اور کٹھل کا حلوہ لازماً کھاتے تھے۔ ڈیوٹی کے بعد ہم زیادہ تر وقت اکٹھے گزارتے۔ یعنی کھانا پینا ہم نہ صرف ساتھ ہی کرتے ہم دونوں ایک دوسرے کے نہ صرف گہرے دوست تھے بلکہ ہمراز بھی تھے۔

وحید قریشی کے زیر مطالعہ کتب میں جہاں دیگر موضوعات کا ذخیرہ تھا۔ وہاں چند کتب بڑی پراسرار اور جادوئی موضوعات پر بھی مشتمل تھیں۔ جن کو میں نے اس سے مانگ کر پڑھنے کی کوشش بھی کی تو اس نے دینے سے انکار کردیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ”یار تو یہ کتب مجھے کیوں نہیں پڑھنے دیتا۔“

میرے اس سوال پر وہ اکثر ٹال دیتا تھا۔ اس کی یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعہ کے روز ہم نے اکٹھے جیسور کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی اس کے بعد اس نے مجھے کہا۔

”میں تمہیں جامع مسجد سے سید حالالہ کے مشہور ہوٹل پر لے کر جاؤں گا۔ وہاں پہلے سے مکمل سبزی کھائیں گے۔ مجھے بھی لالچ آگیا۔ کیونکہ جمعہ کے روز ہمیں فوجی لنگر سے چنے کی پتلی دال ملا کرتی تھی۔

بہرحال، میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اس نے سب سے پہلے سائیکل رکشہ کو مسجد کے قریب روکا پھر مجھے رکشہ میں لے کر بیٹھا تو میں نے پوچھا یار کدھر جارہا ہے تو وہ بولا چند منٹ کی بات ہے۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ وہ ذرا کرلوں پھر لالہ کے ہوٹل جاکر پیٹ پوجا کریں گے۔ میں بھی اس کی بات سن کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے رکشہ کو ایک ویرانے میں رکنے کو کہا تو رکشہ والے نے بھی حیرانگی کے عالم میں کہا۔ ”جی ادھر روک دوں۔ لیکن یہ جگہ بہت ویران ہے آپ یہاں رکیں گے۔“

”بس ادھر روک دے۔“ اس نے رکشہ والے سے کہا۔ ”اچھا جی جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے رکشہ روک دیا۔ میں بھی حیرت کے عالم میں وحید کو دیکھ رہا تھا کہ اس ویرانے میں اسے کیا کام پڑگیا۔

بہرحال میں خاموشی سے سوچنے لگا کہ آگے دیکھوں ہوتا ہے کیا۔ وحید نے مجھے کہا۔ ”یار تو چند منٹ ذرا اس درخت کے نیچے انتظار کر، میں ابھی آتا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، وہ میرے بولنے سے پہلے ہی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

وہاں آدم نہ آدم کی ذات رکشہ والا بھی اس عجیب ڈراؤنے ماحول سے جان چھڑا کر بھاگ گیا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں بھی تیزی سے وحید کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت آگے چل رہا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ میں اس کے پیچھے آہستہ آہستہ آرہا ہوں اس ویرانے میں ایسا مقام آیا جہاں ویرانے کے بالکل عین سامنے بڑی سی دیوار تھی جو کہ غالباً کسی اسکول یا کسی سرکاری عمارت کی ہوگی۔ وہ اس دیوار کے سامنے بڑے عجیب انداز سے خاموشی سے ساکت کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کیں جیسے کسی قدیم

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

تصویر یا بدھ مذہب میں گوتم بدھ اس کے مخصوص انداز میں تپسیا کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کرکے نہ جانے کس زبان میں کوئی عبارت پڑھنا شروع کردی اور پھر یکدم خاموشی اختیار کرلی۔ وہ اس عمل میں تقریباً چار پانچ منٹ تک ساکت رہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھٹکے سے کھول دیں۔ وہ پسینہ سے شرابور تھا۔ میں بھی حیرانگی اور پریشانی کے عالم میں اس کی اس ناقابل یقین پراسرار حالت کا مشاہدہ کرتے ہوئے خود بھی خوف سے لرزنے لگا۔ اس نے خلاف توقع مجھے اپنے قریب دیکھا تو شدید غصے کے عالم میں مجھے ڈانٹتے اور چلاتے ہوئے کہا۔ ”تو میرے پیچھے کیوں آیا؟ میں نے تجھے کہا تھا اس درخت کے نیچے ذرا رک کر میرا انتظار کر لیکن تو نے میرا کہا نہیں مانا۔“

”وحید بھائی میں دراصل اس ویرانے میں ڈر گیا تھا اور دوسرے میں کچھ بولتا کہ آپ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔“ پہلے تو اس نے مجھے غصیلی نظروں سے دیکھا لیکن بعد میں شانت ہوکر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار مجھے معاف کردے میں نے خواہ مخواہ تجھ کو ڈانٹ پلادی، اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”یہ کیا ماجرا ہے؟“ وحید سے میں نے سوالیہ انداز میں استفسار کیا تو اس نے ایک لحہ کو توقف اختیار کیا اور کچھ سوچنے کے بعد گہرا سانس کھینچتے ہوئے بولا۔ ”جبکہ تو نے سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ لیا ہے تو مجھ سے وعدہ کر کہ یہ بات کسی اور سے کہے گا نہیں۔ یہ میرا ایک راز ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اس نے جب محسوس کیا کہ میں اس کے اعتماد کا آدمی ہوں تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”پہلے تو میں تجھے اپنے وعدے کے مطابق لالہ کے ہوٹل سے بہترین لنچ کرواتا ہوں بعد میں تجھے اپنا ایک خفیہ اور اہم راز بتاؤں گا۔“

میری آتش اشتیاق بھڑک اٹھی میں نے اس سے کہا۔ ”پہلے تو مجھے بتلا اصل معاملہ کیا ہے؟“

”میں تجھے یہ بات آرام اور سکون سے بتاؤں گا لیکن پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ اس وقت میرے پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے دوڑ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

وہ مجھے لالہ کے ہوٹل لے گیا۔ وہاں ہم نے خوب سیر ہوکر لنچ کیا۔ پھر اس نے مجھے بتلایا کہ ”میں تجھے زندگی کا ایک ایسا راز بتارہا ہوں جس کی اصلیت کا سن کر تجھے یقین نہیں آئے گا لیکن میں تجھے تیری آنکھوں سے ایک بڑی عجیب چیز دکھلاؤں گا۔“

میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”وہ کیا چیز ہے؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔ ”اگر تجھ میں ہمت ہے تو تجھے تیرے سوال کا جواب سامنے آجائے گا۔ لیکن تو نے اپنے دل کو تھام کر رکھنا ہے۔“ اس کے بعد ہم دونوں سیدھا اس مقام پر سائیکل رکشہ کے ذریعے پہنچے۔ اس نے مجھے ایک مخصوص جگہ کھڑے ہوکر کہا۔ ”اس دیوار کو غور سے دیکھ اور جو میں پڑھوں اسے تو بھی دہراتا اور پھر جو چیز بھی تجھے نظر آئے تو گھبرانا نہیں میں تیرے پیچھے ہوں۔“

بہرحال میں نے ہمت کو یکجا کیا اور خوف و تجسس کی آمیزش کے جذبہ کے ساتھ اس دیوار کی جانب بغور دیکھتا رہا۔ وہ اپنے منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا میں کافی دیر تک دیوار کی جانب دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے بیوقوف بنا رہا ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس نے فوراً اپنا عمل بند کیا اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”ابھی جو چیز میں تجھے دکھلانا چاہتا تھا۔ وہ تجھے دیوار میں نظر آنے والی تھی۔ لیکن تو نے درمیان میں بول دیا۔ اب مجھے یہ عمل پھر سے دہرانا پڑے گا تو آرام اور صبر سے صرف دیوار کی طرف دیکھ...... اور اگر اب تو نے مجھے ڈسٹرب کیا تو میں تجھے تھپڑ ماردوں گا۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ میں دوبارہ غور سے دیوار کی جانب دیکھنے لگا۔ سات آٹھ منٹ مسلسل دیوار کی طرف دیکھنے پر واقعی ایک نسوانی صورت نمایاں طور پر نظر آئی۔

بال کھلے لہراتے ہوئے نقش دلکش اور انتہائی سحر انگیز تھے۔ لیکن یکدم ایک جھماکے سے میری نظروں سے وہ غائب ہوگئی۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر واقعی میری گھگھی بندھ گئی تھی۔ یہ تو کوئی بہت خوب صورت پراسرار مخلوق کی لڑکی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے کہا۔

''ہاں تم نے صحیح پہچانا لیکن یہ کیسے ہوا؟ میں نے اس سے پوچھا۔

''یار چل اب دیر ہورہی ہے۔ بیرک میں رات کے وقت میرے پاس آنا۔'' رات ہوئی تو میں اس کے پاس خصوصی طور پر پہنچ گیا اور اس سے پرتجسس انداز میں دیوار کے قریب نظر آنے والی ماورائی حسینہ کے متعلق پوچھا۔ وہ ایک لمحہ کو مسکرایا اور مجھے شدید نیند کے غلبہ کا بہانہ کرکے ٹال دیا۔ دوسری صبح پورے بیرک میں خبر مشہور ہوگئی کہ وحید قریشی کی آؤٹ آف ٹرن ترقی ہوگئی اور اسے ایک سال کی بنیادی تنخواہ کے برابر بقیہ بھی مل گیا ہے۔ مجھ سمیت بیرک کے تمام فوجی اہلکار وحید کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ اس نے دراصل اپنی پروموشن کے لئے ہیڈ آفس میں اپیل کی ہوئی تھی۔ وہ خلاف توقع منظور ہوگئی۔ اس کا رکا ہوا اور مشکل ترین کام ہوگیا تھا۔ یہ راز میں ہی جانتا تھا کہ وحید قریشی جادو ٹونا اور عمل کرنے والا شخص ہے لیکن کیونکہ میں نے اسے زبان دی ہوئی تھی اس لئے میں اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے خاموش تھا۔

اس دوران جونیئر کمشنر کے لئے ڈھاکہ میں چند پوسٹیں آئیں۔ ہماری کور کے تقریباً 200 لوگوں نے اپلائی کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وحید قریشی اس اسکیم میں سلیکٹ ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر قسمت کا دھنی رہا۔ یعنی وہ سپاہی رینک سے نکل کر براہ راست سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گیا۔ ہم سب پے در پے اس کی کامیابیاں دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ کئی بار لوگوں نے اس کا راز اس سے جاننے کی کوشش کی۔

لیکن وہ بہت چالاکی سے بات ٹال جاتا تھا۔ وہ تھا تو میرا گہرا دوست مگر افسر بننے کے بعد بھی وہ بالکل نہ بدلا۔ مجھ سے اس کا رویہ پہلے جیسا ہی تھا جیسا کہ سپاہی دور میں تھا۔ ذرا بھی مغرور نہ ہوا تھا۔ وہ بدستور مجھے ہر اتوار اور جمعہ کے دن لالہ کے ہوٹل میں کھانا کھلاتا۔ لیکن حسب معمول ان دنوں بھی اس دیوار کے پاس جاکر اپنی محبوبہ سے ضرور ملتا تھا۔

میں ایک روز اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''عبدالقدوس میں جس میں پڑا ہوا ہوں وہ تو نہیں کرسکتا۔''

''نہیں میں کرسکتا ہوں بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی ترقی کرنی ہے اور اس کے لئے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ اچھا اس وقت تو چاہتا کیا ہے؟''

''تیرا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟''

اس نے مجھ سے پوچھا میرے یوں تو بہت سارے مسائل ہیں لیکن سردست بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پیچھے گاؤں میں میرے گھر کے مالی حالات بہت خراب ہیں اور یہ بھی وہ ہے کہ مجھ سے چھوٹے دو بھائیوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے مجھ سے یعنی دوسرے نمبر والا بھائی آج کل بے روزگار ہے۔ کاش اسے کوئی نوکری مل جائے۔ ہمارے گھر کے معاشی حالات درست ہوجائیں۔'' میں نے اسے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''ایک کام کرے گا اگر کرسکے تو تیری تقدیر بدل جائے گی۔ جیسے میری بدل رہی ہے۔''

''ہاں میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو میری ترقی کے لئے بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے جوش دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک جن کو قابو کیا ہوا ہے جو کہ ابھی میرے مکمل قابو میں نہیں ہے۔ مجھے جس عامل نے جن کو قابو کرنے کا طریقہ یعنی چلہ کاٹنا بتلایا ہے وہ تین مرحلوں میں ہے ہر مرحلہ کا علیحدہ اور بڑا صبر انگیز سخت چلہ ہے۔''

''کتنا سخت ہوگا؟''

''ابے اتنا سخت ہوگا کہ تو دیکھے گا تو تیرے

اوسان خطا ہو جائیں گے اور چلہ کو شروع کرنے سے پہلے اس کے تقاضے بھی بہت سخت ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تو کر نہیں سکتا۔"

"یار تیری ترقی اور شان و شوکت کو دیکھ کر میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی تیری طرح محنت کروں۔"

"اچھا اگر تو بضد ہے تو سن ہمارے اس کام کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے یعنی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"لیکن کرنا کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کرنا یہ ہے کہ ہمیں سب سے پہلے کسی نئی قبر میں سے کسی مردے کا تھوڑا سا گوشت کا ٹکڑا درکار ہوگا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"تیری ہوا نکل گئی نا...... کیسے ہوگا؟...... ارے بیوقوف یہ کام اتنا آسان نہیں، اب جن کو قابو کرنا کوئی اماں جی کا کھیل نہیں ہے۔ ویسے تو پرواہ نہ کر میرے پاس اس کا بندوبست ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نے قریبی قبرستان کے لالچی گورکن کو پھنسا رکھا ہے۔ جب بھی میں نے اپنا مخصوص چلہ کاٹنا ہوتا ہے۔ اس کی ہتھیلی پر 200 روپے رکھ دیکھ دیتا ہوں۔ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح لاش کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لا دیتا ہے۔"

"اس ٹکڑے کو تو کیا کرتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا کرتا ہوں؟" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اسے اس کا قیمہ بنا کر کھاتا ہوں۔"

"تو اسے کھاتا ہے۔"

"اور کیا یہ چلہ کی پہلی شرط ہے۔" وحید مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا ہے کہ تجھ میں یہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"نہیں میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں وہ ہر عمل کرنے کو تیار ہوں جو میرے مسائل کو حل اور مجھے ترقی میں مدد دے۔"

"تو پھر ہمت کر اور مجھ سے دن طے کر۔" میں نے بھی اپنے دوسرے مرحلہ کا چلہ کاٹنا ہے۔ لیکن تیرا

وارننگ

ایک آدمی کا قد بہت چھوٹا تھا جب کہ اس کی بیوی بہت زیادہ لمبی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شوہر صاحب اکثر بیوی سے مار کھا کر باہر بھاگ جاتے تھے۔

ایک دفعہ حسب معمول بیوی نے شوہر سے جھگڑے کے بعد اس کی پٹائی کر دی تو وہ اپنی عادت کے مطابق محاذ چھوڑ کر گلی میں بھاگ آیا۔ راستے میں اسے بیوی کا بھائی مل گیا۔ اسے مخاطب کر کے وہ غصے سے بولا۔

"جی صاحب۔ اپنی بہن کو منع کر لیں روزانہ میری پٹائی کر دیتی ہے۔ یہ میری آخری وارننگ ہے جس روز مجھے غصہ آ گیا ناں تو پھر سیڑھی پر چڑھ کر اتنا ماروں گا کہ یاد رکھے گی۔ پھر آپ بہن کی حمایت میں مجھ سے کچھ نہ کہیے گا۔"

(کاکڑ خان۔ پشاور)

پاگل دیوانہ

پاگل خانے میں ایک پاگل اپنے سامنے دیگچی میں پانی بھر کر اس میں مچھلی کا کانٹا لگائے بیٹھا تھا۔ اسی وقت وارڈن کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے پاگل کو دیکھا تو پوچھا۔ "کیا کر رہے ہو بھئی؟"

"مچھلیاں پکڑ رہا ہوں؟" پاگل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"خواب! کتنی پکڑ لیں صبح سے؟" وارڈن نے مسکرا کر پوچھا۔

پاگل نے حیران ہو کر کہا۔ "دیوانے ہوئے ہو کیا کہیں دیگچی میں بھی مچھلیاں ہوتی ہیں۔"

(عمران حمید۔ دیپالپور)

ابھی معاملہ شروع اور پہلے مرحلہ میں ہے۔ میں تجھے اس کے لئے چند ابتدائی شرائط اور طریقہ بتلا دوں گا۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلی شرط یہ ہے کہ تو نے میرے ساتھ قبرستان جانا ہوگا اور پھر وہاں ہمیں گورکن ایک تازہ لاش کے گوشت کا ٹکڑا دے گا پھر اسے ہم قیمہ بنا کر آدھا آدھا کھائیں گے۔"

"کچا گوشت اور وہ بھی کسی مردے کا؟" یہ بات میرے دل میں آئی لیکن میں نے اس کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا۔ اس نے پھر مجھ سے کہا۔ "ہفتہ کی رات آٹھ بجے کا وقت طے ہوا۔" اس نے کہا۔ "میں ٹھیک وقت پر قبرستان آجاؤں گا۔"

"تو دل و دماغ سے تیار ہو کر سیدھا شکور خان گورکن کی جھونپڑی میں آجانا۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات جیسور کی آب وہوا میں سخت سردی تھی لیکن خوش قسمتی سے بارش نہ تھی، میں وعدے کے مطابق پورے آٹھ بجے مذکورہ قبرستان پہنچا۔ ایک طرف سخت سردی اور قبرستان میں کیڑے مکوڑوں کا رنگ برنگی آوازیں دل کو دہلا رہی تھیں۔ میں خوفزدہ قدموں سے چلتا ہوا جب شکور کی جھونپڑی میں پہنچا تو وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ صرف وہاں ایک دیا جل رہا تھا۔ میں وہاں ایک طرف سہا ہوا اکیلا کھڑا ہوگیا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس شہر خموشاں کے مردوں کے درمیان صرف میں ہی زندہ انسان ہوں۔ پتا نہیں وحید آتا ہے کہ نہیں۔

میرے دل و دماغ میں مختلف اندیشے منڈلانے لگے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھی مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "وہ جی آپ ہی عبدالقدوس ہیں؟" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک کھردری شکل کا ایک بوڑھا شخص اپنے ہاتھوں میں کسی کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پکڑے ہوئے تھا۔ "میں شکور خان گورکن ہوں۔ یقیناً آپ وحید قریشی کے دوست ہیں جنہوں نے آج آنا ہے۔"

"ہاں میں عبدالقدوس ہوں۔"

"آپ بیٹھ جائیں۔" وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "آج بہت سردی ہے۔" میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "ہاں آج واقعی کچھ زیادہ ہی سردی ہے۔ گورکن نے جواب دیا۔" میں لکڑیاں جلا کر آگ جلاتا۔ لیکن اس لئے جلا نہیں رہا کیونکہ آج رات فجر تک آپ دونوں نے ایک قبر میں ننگے بدن سے جن کو قابو کرنے کے لئے عمل کرنا ہے؟ آپ ابھی سے اپنے آپ کو ذہنی وجسمانی طور پر تیار کرلیں اور ہاں میں تمہارے لئے جن کو قابو کرنے کے لئے پہلی شرط کے مطابق لاش کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لایا ہوں۔ پتا نہیں وحید قریشی آئے گا کہ نہیں۔" میں نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

"وہ ضرور آئے گا۔ اس نے مجھے 200 روپے ایڈوانس دیئے ہیں۔ تم بھی کوئی جادو وغیرہ یا جنوں کو قابو کرنے کا کوئی عمل کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں۔ ہم تو اس قبرستان کی مٹی کے ڈھیر میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں مرجائیں گے۔ تم نے سنا ہوگا کہ ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے۔ بس ہم نے اس مٹی میں مٹی ہوجانا ہے۔ باؤ جی آپ لوگوں کی طرح ہماری کوئی بڑی خواہش یا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا ہر انسان کی فطرت کے اندر کوئی نہ کوئی مسئلہ یا آگے بڑھنے کا لالچ تو ضرور ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے کہا۔

"ہوتا ہوگا۔"

"لیکن میں یہ کام نہیں کرسکتا جو آپ لوگ کرنے جارہے ہیں۔ مجھے تو صرف اپنی مزدوری سے غرض ہے۔ مجھے تو ویسے بھی اس دور میں 200 روپے بھاری معاوضہ مل جائے گا اور مجھے کیا چاہئے۔" اس نے کہا۔ "لگتا ہے صاحب جی آگئے۔" اس نے دروازہ کھولا تو وحید قریشی ہمارے سامنے باریک ململ کی قمیض اور کاٹن کی مختصر بنگالی دھوتی پہنے ہوئے کھڑا تھا۔ "دیکھو میں نے کہا تھا ناں کہ وحید صاحب وعدے کے پکے

ہیں۔ ضرور آئیں گے۔" وحید نے شکور خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "گوشت تیار ہے۔"

"ہاں جی۔" اور شکور نے اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز وحید کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ "ویری گڈ۔ یہ تو بڑا اچھا کام کر دیا لیکن یہ بڑا ٹکڑا ہے اسے آدھا کر کے اس کو قیمہ بنا دو تا کہ عمل پڑھتے وقت اسے آسانی سے نگلا جا سکے۔" مجھے اسے دیکھ کر ابکائی اور کراہیت محسوس ہونے لگی لیکن میں نے بالکل بھی اس کا احساس اس کے سامنے نہ کیا۔

میرے لرزتے پاؤں اور سخت سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کو دیکھتے ہوئے وحید نے مجھے کہا۔

"دیکھو عبدالقدوس تم میرے دوست اور ہم راز ہو۔ اب بھی وقت ہے تم یہاں سے جا سکتے ہو۔ دیکھو جو کام میں اور تم کرنے جا رہے ہیں وہ بہت کٹھن ہے، تکلیف دہ اور خطرے والا ہے۔ اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی تخت یا تختہ، سیدھا ہو گیا تو وارے کے نیارے اور اگر الٹا ہو گیا تو تختہ ہو جائے گا یعنی اگر جن قابو نہ آیا اور وہ بگڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔" میں نے وحید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت اتنے مسائل کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں کہ میں ذہنی طور پر تمہاری ہر بات ماننے اور اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

یہ سن کر وحید نے گہرا سانس لیا اور مجھے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے تو تمہاری مرضی، میں تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں جن قابو کرنے کے لئے پہلے مرحلے کا عمل کرواتا ہوں۔ اس مرحلے میں سب سے پہلے تمہیں یہ مردہ انسان کا قیمہ کھانا پڑے گا اور ساری رات ایک خالی قبر میں میرے پیچھے بیٹھ کر وہ پڑھنا پڑے گا جو میں پڑھوں گا پھر آخر میں تمہیں ایک بدشکل جن نظر آئے گا اسے دیکھ کر ڈرنا نہیں بس اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا لیکن ہاں اس عمل میں تمہیں قمیض اتارنی ہوگی اور یہ عمل فجر کی نماز سے پہلے تک جاری رہے گا اور ایک بات تمہیں میں بتلانا بھول گیا تم نے عمل کرنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کوئی چھوٹا بڑا پیشاب نہیں کرنا جو کرنا ہے پہلے کر لو لیکن استنجے کے ساتھ۔"

"آپ کا تو غالباً دوسرا مرحلہ ہے۔" شکور خان نے وحید کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں میرا دوسرا مرحلہ عبدالقدوس کا پہلا مرحلہ ہے اس کا مطلب ہے کہ آپ کا آج کے بعد آخری اور تیسرا مرحلہ رہ جائے گا۔ اس کے بعد مطلوبہ جن آپ کے مکمل قابو میں آ جائے گا۔" شکور خان نے کہا۔ "ہاں میں پھر اپنی زندگی کی ہر خواہش اس کے ذریعے پوری کر پاؤں گا۔" وحید نے فخریہ انداز میں کہا۔

"چلیں صاحب۔ اس گوشت کا قیمہ بنا کر اسے دو حصوں میں لاتا ہوں۔" شکور خان نے کہا۔

وحید پہلے قبر کے اندر کودا اور پھر مجھے خالی قبر میں اترنے کے لئے کہا۔ میری روح و جسم پر لرزہ طاری ہو گیا لیکن میں ہمت کے سہارے قبر میں اتر گیا۔ بہت بھیانک سڑاند کی بدبو آ رہی تھی تقریباً قیمہ دو حصوں میں اخباری کاغذ کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اسے دو حصوں میں کھانا پڑے گا۔ ایک حصہ عمل شروع کرتے وقت جب اس کی نیت کی جائے گی اور دوسرا جب تمہیں کچھ نظر آئے گا تو پھر اور جیسے میں پڑھتا رہوں گا تم بھی زیر لب پڑھتے رہنا اور اپنی آنکھیں بند کر کے اور جب تمہیں کچھ نظر آئے تو پھر اس سے اپنے دل کا مدعا بیان کر دینا لیکن تم نے ننگے بدن پر سردی کے جھونکوں اور کیڑے مکوڑے کے کاٹنے کے باوجود بھی ذرا بھی اپنی آنکھ نہیں کھولنی اگر کھول دی تو سوچ لو کوئی نقصان ہوا تو مجھ سے شکوہ نہ کرنا۔" وحید نے کہا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے انسانی مردہ گوشت کا قیمہ کھا لیا، قیمہ منہ میں رکھتے ہی ایسی کراہیت، بد ذائقہ اور کوفت ہوئی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وحید نے بھی میری طرح قیمہ کھایا وہ جو بھی عمل پڑھتا رہا میں اسے دہراتا رہا۔

ہم دونوں کی پیٹھ قمیضوں سے محروم تھی اوپر سے شدید سردی کی اذیت اور قبرستان کی خون خشک کرنے والی کیفیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن بہتر

مستقبل اور مسائل کے حل کے جوش و جذبہ کے تحت یہ کام کررہے تھے۔

رات تقریباً ایک بجے اس نے خاموشی اختیار کرلی اور میں نے اپنی آنکھیں مسلسل بند کی ہوئی تھیں کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ اپنی آنکھیں اس وقت تک نہیں کھولنی جب تک میں نہ کہوں۔ میں آنکھیں بند کئے بے سدھ رہا۔ سخت سردی اور انسانی مردار کچا قیمہ کھانے سے میرے پیٹ میں شدید ناقابل برداشت ابکائیاں آرہی تھیں۔ لیکن میں نے اپنے دانتوں کو بری طرح بھینچا ہوا تھا۔

اس دوران رات کے تقریباً دو بجے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے آگے کوئی شبیہ بن رہی ہے وہ لمحاتی طور پر کچھ بنتی پھر غائب ہوجاتی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے کچھ سیکنڈوں کے لئے اپنی مکمل شکل اختیار کرلی وہ بہت خوفناک اور بدصورت بچے کی طرح تھی جس کے بڑے سے چہرے پر ماتھے کے درمیان ایک سرخ آنکھ تھی۔ اس کو جب میں نے دیکھا، شکر ہے میرا شعور قائم تھا میں نے فوراً دل میں کہا۔ ''خدا کے لئے میرے معاشی مسائل حل کردو۔ بھائیوں کو کہیں نوکری دلوادو۔'' پھر وہ فوراً جھٹ پٹ غائب ہوگیا۔ اگرچہ میں بے سدھ آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔ میرا پورا جسم کپکپارہا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اب شاید مرنے والا ہوں۔ میرے دل میں آیا کہ آنکھیں کھول دوں لیکن میں وحید کی آواز پر قائم تھا۔

چند لمحوں بعد وحید کی آواز سنائی دی۔

''عبدالقدوس اپنی آنکھیں کھول دو۔'' میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

وحید نے اپنی قمیض پہنی اور مجھ سے کہا کہ تم بھی قمیض پہن لو۔ پوری رات خالی قبر میں نہ گفتہ حالت میں بیٹھ کر ایسا لگا جیسے پورا سن ہوگیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد عبدالشکور گورکن دو پرانے کمبل لے کر آیا۔ ایک اس نے میرے اوپر اور دوسرا وحید پر ڈالا۔ وہ سہارا دے کر پہلے وحید کو اور پھر مجھے اپنی جھونپڑی میں لے کر گیا۔ وحید اور میں سردی اور پیٹ کے درد سے تڑپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گرم دیسی مچھلی کے سوپ کے پیالے کے ساتھ ایک کالی سی گولی ہمیں دی تو میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''باؤجی مچھلی کا سوپ آپ کو گرمی اور درد کو راحت دے گا اور یہ کالی گولی آپ کا معدہ نہ صرف صاف کرے گی بلکہ آپ کے پیٹ کے اندر انسانی قیمہ کی گندگی اور اثرات زائل کرے گی۔''

واقعی اس کا دیا ہوا سوپ اور گولی نے بڑا موثر کردار ادا کیا۔ ہم دونوں کے ہوش اور ذہن ٹھکانے آئے تو وحید نے مجھ سے پوچھا۔ ''اور بھئی سناؤ رات کیسی گزری۔''

میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے تو تارے نظر آگئے لیکن مجھے جن بچہ بھی نظر آگیا۔''

''تو تم نے اپنا مدعا بیان کیا کہ نہیں؟''

''ہاں کیا تھا۔''

''چلو بہتر ہوگا۔''

میں صبح ہوتے ہی سیدھا اسپتال گیا کیونکہ میرے پیٹ کا درد اور ناک سے بہتا نزلہ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک دوا کھاتا رہا۔ جس سے میرے بہتے نزلہ اور درد کو آرام ملا لیکن میرے پیٹ میں مستقل مروڑ اور موشن کا مرض گھر کرگیا تھا۔ چند روز بعد مجھے مغربی پاکستان اپنے گھر سے خط ملا کہ مجھ سے چھوٹے بھائی کو دفتر خارجہ میں نوکری مل گئی ہے۔ میری تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔ اب یہ بات مجھ پر عیاں ہوگئی کہ واقعی جن کو قابو کرنے کا میرا پہلا مرحلہ صحیح طور پر مکمل ہوگیا۔ دل کو تسلی ہوئی کہ بچہ جن نے میرا کام کردیا۔

چند روز بعد مجھے وحید نے بلایا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ مزید ترقی کرگیا ہے۔ اور اب اسے علیحدہ چھوٹا سا بنگلہ مل گیا ہے اور دوسری طرف گاؤں سے خبر آئی ہے کہ مجھے خدا نے اولاد نرینہ سے نوازا ہے۔ میں نے بھی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اسے اپنے بھائی کی اچھی جاب کے بارے میں بتلایا۔
یہ سن کر وہ خوش ہوا لیکن اس نے مجھ سے کہا۔ ''اگر تم اپنی زندگی میں مزید ترقی وخوشحالی چاہتے ہو تو تمہیں اب جن کو قابو کرنے کے لئے دوسرا مرحلہ طے کرنا ہے۔'' اور نیز اس نے یہ بھی بتلایا کہ ''وہ اب جن کو قابو کرنے کے لئے آخری مرحلہ طے کرے گا جس سے وہ اس کے مکمل قابو میں آجائے گا وہ پھر اپنے قابو شدہ جن کے ذریعے کئی کام کرائے گا۔''

میرا یقین تو پختہ ہو چکا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے دوسرا مرحلہ طے کرکے جن کو مزید قابو کرکے اس سے مزید افادیت حاصل کرنی چاہئے۔
وحید نے پھر ماضی کی طرح تاکید اور تنبیہ کی۔ ''اس بار بھی یہ کام بڑی راز داری اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔''

میں مان گیا اس بار ہمارا خالی قبر میں عمل کرنے کا دن اتوار کے روز طے پایا کیونکہ دوسرے دن یعنی سوموار کے دن کوئی قومی دن کی وجہ سے چھٹی تھی۔

وحید نے مجھ سے کہا کہ ''تم اس قبرستان میں شکور خان گورکن کے پاس آٹھ بجے آجانا۔'' اور اس نے یہ بھی بتایا اس دفعہ ذرا عمل سخت ہوگا لیکن اگر یہ ہوگیا تو پھر میرے اور تمہارے وارے کے نیارے ہوں گے۔ اب تمہارا دوسرا اور میرا تیسرا مرحلہ رہ گیا ہے اور ہاں یہ چلہ پہلے سے ذرا سخت اور طویل نوعیت کا ہوگا۔ تم ہر قیمت پر وہاں آجانا میں تمہارا انتظار کروں گا۔

نیز وحید نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے 300 روپے گورکن کو ایڈوانس دے دیئے ہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔ میں نے بادل نخواستہ حامی بھرلی۔

اتوار کے دن صبح ہی سے بہت سرد ہوائیں جیسور کی فضاؤں کو ٹھٹھرائے دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ رات کو قبرستان کی سخت سردی میں ننگے بدن خالی قبر میں چلہ کشی کرنی ہے لہٰذا کیوں نہ میں مچھلی کی یخنی پی لوں لہٰذا میں وہاں کی بام مخصوص بنگالی مچھلی خرید کر لایا۔ میں نے بیرک کی کینٹین کے ایک ویٹر کو کہا۔ ''ذرا اس کا سوپ بنادے۔'' میرا خیال تھا کہ میں سوپ کے ایک دو پیالہ پی کر قبرستان جاؤں گا۔ تاکہ جسم کسی حد تک گرم رہے۔ ویٹر کے لائے ہوئے سوپ کے دو پیالے پینے کے بعد میرے پیٹ میں ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بارود پی لیا ہے۔ اور وہ پھٹنے کو بے تاب ہے۔ ناقابل برداشت مروڑ کے ساتھ مجھے ہیضہ ہوگیا۔ میری بگڑتی حالت کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر میرے بیرک کے سپاہی مجھے اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے ابتدائی طور پر مجھے درد کش ٹیکہ اور مکسچر وغیرہ دیئے۔ لیکن مجھے آرام نہ آیا۔ درد تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

دوسرے دن میں نے چلہ کاٹنے کے لئے لازماً جانا تھا۔ میں نے اسپتال میں جھوٹا بہانہ کیا کہ ''میں نے بہت ضروری کسی عزیز کی شادی میں جانا ہے لیکن وہاں کے ڈاکٹرز میرے ساتھیوں اور عملے نے مجھے سختی سے روکا کہ تمہاری حالت بہت خراب ہے۔''

بہر حال جب میرا درد شکم شدید بڑھنے لگا اور مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگے تو فوری طور پر ڈاکٹروں نے مجھے بے ہوشی کا ٹیکہ لگادیا صبح غنودگی کے عالم میں میری آنکھ کھلی تو میرا درد شکم ختم ہو چکا تھا۔ البتہ گلوکوز کی بوتل کی پتلی ٹیوب میرے بازو میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے ہونقوں کی طرح اپنے گرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو وہاں ایک نرس میرے چند بیرک کے ساتھیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک میرا دوست بولا۔ ''تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔ اور دوسری منحوس خبر ہے۔'' میں نے اچنبھے اور حیرت سے پوچھا۔

''کیا خبر ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے کہ بڑی جدوجہد اور مشکل کے بعد تمہاری جان بچ گئی لیکن تمہارے لئے یہ بری بلکہ منحوس خبر ہے کہ آفیسرز کالونی سے یہ خبر آئی ہے کہ تمہارے جگری دوست وحید قریشی قریبی قبرستان کے ایک خالی قبر میں ننگے بدن کوئی چلہ کررہے تھے کہ وہ مر گئے۔''

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

پلکوں پہ آنسوؤں سے چراغاں کریں گے ہم
اس طرح کہکشاں کو پریشاں کریں گے ہم
واقف ہیں ہم بھی گردش دوراں سے دوستو!
اس بات پہ نہ چاک گریباں کریں گے ہم
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

موسم کو موسم کی بہاروں نے لوٹا
کشتی کو سمندر کے ٹھہری کناروں نے لوٹا
ارے تم تو ایک قسم سے ڈر گئے
تیری قسم دے کر مجھے ہزاروں نے لوٹا
(خضر حیات......روڈہ تھل)

کبھی راتوں کی کروٹیں کبھی دن کی بے چینیاں
اے محبت خدا کے واسطے ذرا محبت سے پیش آ
(محمد ندیم جوئیہ......روڈہ تھل)

واہ میرے محبوب بڑی جلدی خیال آیا
بس کرو چومنا اب اٹھانے دو جنازہ
(محمد دانیال جوئیہ......روڈہ تھل)

تم صاف رہو یا نہ رہو اے مہ تاباں
ہم وہ ہیں کہ دل بھی کبھی میلا نہیں ہوتا
کیوں عشق میں ڈوبے نہ رہیں چاہنے والے
دریائے محبت میں کنارہ نہیں ہوتا
(مہر پرویز احمد دولو......میاں چنوں)

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمار چمن
قالب گل میں ڈھلی ہے خشت دیوار چمن
وقت ہے، گر بلبل مسکیں زلیخائی کرے
یوسفِ گل جلوہ فرما ہے، یہ بازار چمن
(الیس حبیب خان......کراچی)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

اپنے خیالوں میں آنے کی اجازت دو ہم کو
ہم تمہارے ہیں بتانے کی اجازت دو ہم کو
یہ نہ ہو ٹوٹ جائے امید وفا ہماری
بس کچھ پل جینے کی اجازت دو ہم کو
(شاہد علی خان......لورالائی)

تمہارا نام لکھ کر مٹانا بھول جاتا ہوں
تمہیں جب یاد کرتا ہوں بھلانا بھول جاتا ہوں
بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میرے دل میں رہتی ہیں
مگر جب تم سے ملتا ہوں تو بتانا بھول جاتا ہوں
(جہانزیب......کراچی)

گرنے سے پہلے میں بھی قابل پرواز تھا
بے وفائی اس نے کی جس کی وفا پہ بڑا ناز تھا
(ڈاکٹر رانا عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

ابھی تو مدفن بھی نہ ہوئے تھے خاک قبرستان میں ہم
کہ شہنائیوں کے ساتھ رقص کرتے جانم ہمارے نکلے
(ذکاءاللہ بھٹی......کراچی)

تم خواب میں آئے پاس میرے
ہم دل کی تمنا کہہ نہ سکے
ہم خواب میں بھی ڈرتے رہے
رسوا تو نہیں کردو گے مجھے
(رشک نور......فیصل آباد)

ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ، لکھا اس کا بھی نام
پھر لکھا یہ بھی کہ 'صبح' دوپہر، شام
(محمد آصف شہزادالہ آبادی......ٹھینگ موڑ قصور)

تجھ سے ملنے کی دعا لب پہ نہ آجائے کہیں
چاند کو دیکھ کر یوں آنکھ بچالی ہم نے اے دوست
(دلبر خان......کوئٹہ)

حد تکمیل کو پہنچی تیری رعنائی حسن
جو کسر تھی وہ مٹادی تیری انگڑائی نے
(عبدالحمید آرائیں......گجرات)

☆☆

غزل

پڑھ کے صلی علی سرور ملا
دیدہ و دل کو کیسا نور ملا
طٰہٰ، یٰس آپ کا سہرا
آپ کی شان میں کلام خدا
رحمت دو جہاں آپ ہوئے
رب کے اک ترجماں آپ ہوئے
دینِ اسلام آپ سے پھیلا
شرک کا داغ آپ نے دھویا
آپ کی کیا ثنا قمر سے ہو
قلب خوش آپ کی نظر سے ہو
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

کیئے جو ہم سے وعدے تو انہیں وفا کرنا
مانگ لینا جان ہم سے پر نہ جفا کرنا
ہنس کر کردیں گے سب کچھ قربان ہم
معصوم سا دل توڑنے کی نہ خطا کرنا
میں عشق کی انتہا کو چھوجاؤں جو کہو
میرے عشق کو ہی میری نہ سزا کرنا
زمانے کی تلخیاں سہہ کر تم کو پایا ہے
ہو کر قریب وہ تلخیاں بھلایا کرنا
قدم قدم پہ دکھاتا ہے زمانہ دل
گر ہوسکے تو ہر دکھ کا تم مداوا کرنا
جب فرصتوں میں ہو کمی محسوس تو
آنا میرے پاس اور پیار سے جایا کرنا
میری فرصتوں کی محتاج محبت کی قسم
ہے نینا کی فطرت تو تجھ سے وفا کرنا!!!
(ایڈووکیٹ نینا خان......کراچی)

تیری چاہت میں تیرے دیوانے ہوگئے
اب تو ہم اپنوں سے بیگانے ہوگئے
تیری پھول سی صورت کے ہم طلبگار تھے
پھر آنکھوں میں کیسے خواب سہانے ہوگئے
جو تیری یاد میں کھوئے رہتے تھے اکثر
وہ جان تمنا تیرے جیسے مستانے ہوگئے
تیری شوخ نگاہوں نے کردیا زخمی ہم کو
کارگر تیری آنکھوں کے نشانے ہوگئے
تیرے ساتھ گزارے تھے پیار بھرے لمحات
جیسے اب وہ ماضی کے فسانے ہوگئے
اپنی جان سے زیادہ تجھے چاہا ہے جاوید
پھر کیوں غیروں سے تیرے یارانے ہوگئے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

دل کی بربادی کا قصہ ہم نے سن لیا
اک دیوانی کو ہمارے دل نے چن لیا
آئی صبا تو پوچھا مزاج یار کا
ایک ایک پہلو ادا صبا نے گن دیا
پتا چلا کہ دیوانی تنہائیوں میں رہتی ہے
خوش رہنے کا ہم نے اسے فن دیا
اب اشک نہیں بہانہ مسکراتا ہے سدا
چلو من بھی دیا اور تمہیں تن بھی دیا
اب نہ کہنا تنہا ہوں تمہارے ساتھ ہوں میں
اے صبا اسے کہنا کیا اس نے سن لیا
(محمد اسحاق انجم......کنگن پور)

لہرائے سدا آنکھ میں پیارے تیرا آنچل
جھومر ہے تیرا چاند، ستارے تیرا آنچل
آنچل میں چھپے رنگ نکھاریں تیری زلفیں
الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے تیرا آنچل
اس وقت ہے تتلی کی طرح ہوا دوش پر
اس وقت کہاں بس میں ہمارے تیرا آنچل
اب تک میری یادوں میں ہے رنگوں کا تلاطم
دکھتا تھا کبھی جھیل کنارے تیرا آنچل
لپٹے کبھی شاخوں سے کبھی زلف سے الجھے
کیوں ڈھونڈتا رہتا ہے سہارے تیرا آنچل

کاجل بہہ بہہ کے رلائے مجھے اب بھی
رہ رہ کے مجھے اب بھی پکارے تیرا آنچل
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

یہ شاہکار وطن تار تار پیراہن
یہ جھلسے جھلسے سے چہرے پہ زرد زرد بدن
یہ وہ ہیں جن کی سیاست سے آشنائی نہیں
نہ راس آسکا ان کو نہ ان کا علم نہ فن
وفا و صدق و صفا ہیں صفات اعلیٰ درست
مگر نتیجہ فقط تلخی ہائے کام و دہن
شجر شجر ہے ستم آلود ہر کلی پر خون
نہ پوچھ ہم نفسو حسن و آب رنگ چمن
ہزار زخم ہیں دل میں تو اشک آنکھوں میں
نہ آرزوئے بہاراں، نہ پرکشش ساون
عجب سکوت ہے اب اطہر زندگانی میں
نہ ان کو تاب سخن ہے نہ مجھ کو شوق سخن
تمام عقل زیاں کار کے کرشمے ہیں واجد
کہ قحط و جنگ ہیں اب نصیب ہر دامن
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

سنو
تم سے ملتے بھی تو کیسے ملتے
گو کہ منزل دور نہ تھی
مگر
کبھی راستوں نے بھٹکا دیا
کبھی موسموں کی نظر لگ گئی
کبھی کسی مجبوری کی زد میں آ گئے
اور کبھی
اور کبھی محبت ہی نہ رہی
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

چھیڑ دیتا ہے یہ دل پھر سے پرانی کوئی بات
کوئی دکھ کوئی گلہ کوئی کہانی کوئی بات
ایک چپ تھی جو کہ خوشبو کی طرح پھیلی تھی
صبح دم کہہ نہ سکی رات کی رانی کوئی بات
اہل گلشن کا تو شیوہ ہے کہ بدنام کریں
گل بھی سنتا کبھی بلبل کی زبانی کوئی بات
وہ تیرا عہد وفا تھا کہ وفائے وعدہ
میں کہہ کر پھر بھول گیا یاد دلانی کوئی بات
جانے کیوں اب کے پریشان ہیں تیرے خانہ بدوش
ورنہ ایسی بھی نہ تھی نقل مکانی کوئی بات
جس طرح ساری غزل میں کوئی عمدہ مصرع
جس طرح یاد میں رہ جائے نشانی کوئی بات
اہل دستار و قبا ترش جبیں کیوں ہیں شہزاد
کہہ گئی کیا میری آشفتہ بیانی کوئی بات
(ڈاکٹر رانا عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

دل سے دور وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
دونوں انسان ہیں خدا وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
وہ مجھے اور میں اسے الزام دیتا ہوں
مگر غلط اپنی جگہ وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
محبت تو ہم دونوں کرتے ہیں دل سے
محبت کا گناہگار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
عمر بھر ساتھ اگر ہم جی لیں تو کیا ہوگا
پر ہاتھوں کی لکیروں میں وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
اس کے علاوہ میں کیا مانگوں اس خدا سے
اور کسی چیز کا طلبگار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
(خضر حیات......روڈہ تھل)

شام سہانی اور شاہراہ قائد کی نمی نمی چھاؤں
ایسے لگے ہم تم رہتے ہیں کسی اجنبی گاؤں
تنہا جا رہے ہو دل کہہ رہا ہے
آؤ ساتھ میرے تم بھی کوئی نغمہ گاؤ
شاخسار ہیں سجے شمعوں سے
دل میں کوئی نہیں آؤ سم جاؤں
ہر ایک حسینہ پہ حسن کی چھاؤں
سب سے بے نیاز ہے تمنا ہے تم ہی کو پاؤں
پہلے ہی دل پر ہیں بہت زخم

اس بنگلے سے دل پر تم ستم اور نہ ڈھاؤں
اگر آج تم مجھے مل گئی تو
تجھے لے کے کہیں دور بھاگ جاؤں
شام سہانی اور شاہراہ قائد کی نمی نمی چھاؤں
ایسے لگے ہم تم رہتے ہیں کسی اجنبی گاؤں
(غلام مصطفیٰ بادل......قصور)

یہ کیا ستم مرے پروردگار ہوتا ہے
غم عدو میں کوئی سوگوار ہوتا ہے
کسی کا شام و سحر انتظار ہوتا ہے
اب آگے کیا میرے پروردگار ہوتا ہے
وہ گھر ہمارے لئے قابل زیارت ہے
ترا ظہور جہاں بار بار ہوتا ہے
تمام اہل جہاں جب خاموش ہوتے ہیں
تو ساز عشق مرا نغمہ بار ہوتا ہے
یکایک اپنے نشیمن کا رقص میں آنا
یہ چمن میں ایسے نشان بہار ہوتا ہے
کسی کی یاد ستاتی ہے کیوں یہاں مجھ کو
یہ آج کیا ہے کہ دل بے قرار ہوتا ہے
کسی کی یاد سے باتیں کروں نہ کیوں عامر
اسی سے دل کو مرے کچھ قرار ہوتا ہے
(ایس حبیب خان......کراچی)

تیری آنکھوں کا نور ہوں میں
تجھ سے پھر اتنی دور ہوں میں
اپنی راہوں سے بھٹکا ہے تو
دیکھ بیٹھی ہوں رنجور میں
تو ہے مغرب کے نشے میں گم
تیرے نشے میں ہوں چور میں
تیری یادوں میں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں میں شرابور میں
میں پڑی ہوں بدلیع المال
گھڑی لے کر سندور میں
تو ہے گاؤں کا گھبرو جوان

تیری ملیار بھرپور میں
تو کچھ مجھے میں اسے بھی گل
جسے برف اب انگور میں
تیری منزل کا راستہ ہوں میں
تو ہے موسیٰ تو ہوں طور میں
(رشک نور......فیصل آباد)

میرے مزدور
میرے دوست
میں بھی تو اک
مزدور ہی ہوں
جو اپنے قلم کی
سیاہی سے
عرصہ دراز سے
دنیا کی ظلمت کو
روشنی سے ہمکنار کرنے
کوشاں رہا ہوں
اور اب وقت
کی دھول اور
گردش ایام پر
قلم اور قلب
دونوں کپکپاتے ہیں
لیکن ایک آس پر
زندہ ہوں کہ شاید
قلم اور قلم کاروں
کا شاید کوئی مسیحا
آجائے اور پرسان حال
شاید کوئی ہو جائے
مگر شاید تب تک
ہزاروں قلم کار مزدور
اپنا جوش بازو
کھو نہ دیں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

میرے مزدور
میرے دوست
غم نہ کر
ہم سب ساتھ ہیں
(گلاب خان سولنگی......نوشہرو فیروز)

روشنی کی اس طرح تشہیر ہونی چاہیے
ظلمتوں کی پھر بری تقدیر ہونی چاہیے
واعظو ہیں اس جہاں میں کچھ ہمارے بھی حقوق
میکدے میں آج اک تقریر ہونی چاہیے
تجھ سے تیرے ظلم کی روداد کہنے کیجیے!
تیرے در پہ عدل کی زنجیر ہونی چاہیے
چاندنی ہے دھوپ جیسی دھوپ سایہ دار ہے
ہے اگر یہ خواب پھر تعبیر ہونی چاہیے
آج پھر ہے عید شاکر پھر وہی تنہائیاں
وہ نہیں تو ان کی گھر تصویر ہونی چاہیے
(محمد حنیف شاکر......بھاگووالی ننکانہ صاحب)

کون ہو تم
میرے انتظار کی راحت ہو تم
میرے دل کی چاہت ہو تم
تم ہو تو یہ دنیا ہے
میں کیسے کہوں کہ میرے لئے کیا ہو تم
چلو میں بتاؤں کیا ہو تم
میں نے جو مانگی وہ دعا ہو تم
کرے مجھ کو جو روشن وہ دیا ہو تم
فضا میں مہکتی اک شام ہو تم
پیار میں چھلکتا جام ہو تم
میری زندگی کا دوسرا نام ہو تم
میری بجھتی زندگی کی سانس ہو تم
پھر کیسے نہ کہوں
میری جان ہو تم
(محمد دانیال جوئیہ۔روڈہ تھل خوشاب)

نا زندگی کا سوچا تھا نہ زمانے کا سوچا تھا
میں نے بس تمہیں اپنا بنانے کا سوچا تھا
تمہارے روٹھ جانے کے انداز کی قسم
تم روٹھ جاؤ تو زمانے کا سوچا تھا
وقت نے نہ کی وفا تو کوئی گلہ نہیں
میں نے تم سے وفائیں نبھانے کا سوچا تھا
تم مجھے رلاؤ تو کوئی بات نہیں
میں نے رو کر بھی تمہیں منانے کا سوچا تھا
(محمد ندیم۔روڈہ تھل،خوشاب)

اُس کے ہونٹوں پر اتر آئی دعا میرے بعد
یہ بھی صد شکر مرا نام لیا میرے بعد
اپنی ہستی سے تو ویسے ہی اسے نفرت تھی
وہ تو کرتا ہی رہا خود سے جفا میرے بعد
ہوش اپنا نہ کسی شخص کی پہچان اسے
روگ ایسا ہی کوئی اس کو لگا میرے بعد
وہ جو پتھر کے خداؤں میں رہا کرتا تھا
اس کی آنکھوں سے کوئی اشک گرا میرے بعد
اس کو احساس ہوا میرے بچھڑنے سے
اس نے محفل میں مرا ذکر کیا میرے بعد
(راشد زمان۔صادق آباد)

سرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں
ہر شب تنہائی میں ستاتی ہیں تیری یادیں
لوٹ کر اب کبھی نہ آئے گا تیرے پاس
ہر شب یہی کہہ کر مجھے رلاتی ہیں تیری یادیں
روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں
تیرا نام لے کر تڑپاتی ہیں مجھے تیری یادیں
جب کبھی بجھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا
مجھ سے پوچھے بغیر اسے جلاتی ہیں تیری یادیں
فلک بھلانا چاہتا ہوں جس صورت کو
ہر شب وہی صورت دکھاتی ہیں تیری یادیں
(فلک زاہد......لاہور)

☆☆



چڑیل کا بسیرا

شائزہ اعوان۔ راولپنڈی

اچانک چڑیل کی آواز سنائی دی، میرا بیٹا درخت کی ٹہنی پر موجود تھا کہ اس گھر کے فرد نے کلہاڑی سے میرے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دی اور میں ہر صورت اپنا بدلہ لے کر رہوں گی اور پھر......

ایک سرکش چڑیل کی سرکشی جس نے گھر والوں کو تنگ کر رکھا تھا...... تحیر انگیز کہانی

جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں سو فیصد سچی کہانی ہے آپ کو کہانی پڑھنے کے بعد اس کی سچائی کا علم ہو جائے گا کہ یہ واقعہ کس کے ساتھ پیش آیا تو سنیے۔

آج سے تین سال پہلے کی بات ہے جب میں اور میرے شوہر محمد آصف اپنا شہر مظفر گڑھ چھوڑ کر لاہور کے ایک ٹاؤن ایریا میں شفٹ ہوئے۔ لاہور آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ لاہور میں میرے شوہر کا ایک دوست رہتا تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ مل کر ایک ہوٹل بنانا چاہتے تھے اس لئے میرے شوہر مجھے اور دو چھوٹے بچوں کو لے کر آ گئے میری ایک بیٹی تھی جس کا نام ثمن نور تھا۔ اور ایک بیٹا جس کا نام اسفندیار تھا بیٹی تین سال کی اور بیٹا ایک سال کا تھا۔

لاہور آ کر ہم نے فاروق یعنی کہ آصف کے دوست کے گھر کے ساتھ والا گھر کرایہ پر لے لیا یہ گھر

دو کمروں پر مشتمل تھا اور ساتھ میں ایک کونے میں واش روم غسل خانہ بنا ہوا تھا جبکہ آگے صحن میں چھوٹا سا کچن تھا صحن کے درمیان میں ایک بڑا اور گھنا سالوسٹرے کا درخت تھا۔

ہم میاں بیوی دونوں نے مل کر ایک کمرہ مہمانوں کے لئے سیٹ کیا تاکہ آنے جانے والے مہمان اس میں رہ سکیں۔ اور دوسرا کمرہ ہم نے اپنے لئے رکھا کچھ دن تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ تقریباً پندرہ سولہ دن کے بعد آصف نے ماشاء اللہ ایک ہوٹل کھول لیا وہ صبح 7 بجے جاتے اور دن کو 12 بجے تک گھر آجاتے تھے پھر اس کے بعد رات کو 8 بجے جاتے ہوٹل پر سب نئے ملازم کام کرتے تھے اس لئے آصف بس چکر وغیرہ لگا کر واپس آجاتے۔

میرے شوہر زیادہ تر کھانا گھر میں ہی کھاتے تھے کیوں کہ مجھے شروع سے ہی اچھے اچھے کھانے بنانے کا شوق تھا اس لئے میں گھر کے کاموں اور کھانے وغیرہ کا کام اچھے سے انجام دیتی تھی اور میرے شوہر جب بھی کھانا کھاتے کھلے دل سے تعریف کرتے تھے کیونکہ ہماری شادی کو 6 سال ہو چکے تھے۔ لوگ ہماری محبت کی مثال دیتے تھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔

اس دن آصف ہوٹل پر چلے گئے میں نے سارا کام ختم کیا بچوں کو نہلا کر کپڑے بدلے اور چھوٹے بیٹے کو دودھ کا فیڈر بنا کر دیا وہ سو گیا میں نے سوچا چلو آج آصف کی پسند کی چکن بریانی بنادوں میری بیٹی بھی میرے ساتھ کچن میں آگئی۔

میں نے بریانی بنانی شروع کی جب بریانی بن گئی تو میں نے دم پر رکھ دی، میری بیٹی نے کہا "ماما میں نے بسکٹ کھانے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جاؤ بیٹا کمرے میں ٹیبل پر میں نے رکھے ہیں اٹھا لو۔"

"ٹھیک ہے ماما۔" وہ کہتی ہوئی کچن سے نکل گئی تو میں نے موبائل اٹھایا اور اپنے شوہر کو کال کی اور پوچھا گھر کس ٹائم آئیں گے۔"

"بس 20 منٹ صبر کرو آرہا ہوں۔" میں نے فون بند کیا اور جلدی جلدی رائتہ بنانے لگی۔ رائتہ بنا کر میں نے ابھی رکھا ہی تھا کہ مجھے کچن سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی عورت میری کمر کے پیچھے بیٹھی کچھ پکار رہی ہو میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا میں نے آرام سے گیس بند کیا اور چولہے سے بریانی اتاری۔

پھر وہی آواز ٹپ ٹپ آنی شروع ہو گئی میں نے گھبراتے ہوئے ایک بار پھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا اگر یہاں کوئی نہیں تو پھر آواز کیسی ہے ابھی میں خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کس طرح کچن سے باہر جاؤں مگر میرے قدم جیسے جم گئے تھے۔

اتنے میں ایسے معلوم ہوا جیسے دو عورتیں آپس میں سرگوشی کر رہی ہوں پھر تو نجانے کیسے مجھ میں اتنی ہمت آئی کہ میں بھاگ کر کچن سے باہر نکلی اور بھاگتے ہوئے سیدھی اپنے کمرے میں گئی میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور پسینے سے میرا جسم تر ہو چکا تھا میں اتنی ڈر گئی تھی کہ میری بیٹی نے مجھے آواز دی تو میری چیخ نکل گئی، میں تو پہلے سے ڈری ہوئی تھی اس کی اچانک آواز دینے پر مزید ڈر گئی اتنے میں باہر گیٹ پر دستک ہوئی تو مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کچن سے گزر کر (کچن کے ساتھ آگے گیٹ تھا کچن کے سامنے سے گزر کر گیٹ تک جانا پڑتا تھا) جاؤں دستک جب بار بار ہونے لگی تو میں نے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے گیٹ تک گئی گیٹ کھولا تو سامنے آصف کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو کب سے دستک دے رہا ہوں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے فکرمندی سے بولے۔

"نن۔۔۔۔۔نن۔۔۔۔۔نہیں کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔" میں نے گیٹ بند کیا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی جب وہ کچن کے بالکل سامنے گئے تو رک گئے۔

"واہ جی بڑے مزے کی خوشبو آرہی ہے۔۔۔۔۔ لگتا ہے تم نے بریانی بنائی ہے۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں آنکھیں پھاڑے ان کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو، کیا بات ہے بتاؤ تم مجھے کافی پریشان لگ رہی ہو۔"

"و...... و...... وہ...... آ...... ص...... ف...... وہ کچن میں کوئی ہے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کون ہے کچن میں۔" اتنا کہہ وہ کچن میں گئے تو وہاں کوئی نہ تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں۔"

"آصف یہاں کوئی عورت تھی وہ روٹی بنا رہی تھی پھر سرگوشی کر رہی تھی...... آصف مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے آصف کا ہاتھ پکڑ لیا۔

تو وہ مسکرانے لگے۔ "واہ میں اپنی پیاری بیوی کو بہت بہادر سمجھ رہا تھا مگر تم تو ڈرپوک ہو۔" ایک بار پھر مسکرائے اور کہا۔

"یار دیکھو رات ہوتی تو پھر بھی میں مان لیتا کہ تم ڈر گئی ہو۔ ارے دن کے 12 بجے تم ڈر گئی اسی لئے کہتا ہوں کہ آرام کیا کرو تم ہر وقت گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہو رات کو بھی بچے تمہیں نیند نہیں کرنے دیتے تمہیں آرام کی ضرورت ہے چلو کھانا کھاتے ہیں پھر تم آرام کرنا تھوڑی دیر سو جاؤ گی تو اپنے آپ کو فریش محسوس کرو گی۔"

میں نے کہا۔ "اسفند کب کا سو رہا ہے ابھی جاگ جائے گا پھر وہ کب سونے دے گا مجھے۔"

"ارے جان من تم بچوں کی فکر نہ کرو میں یہاں موجود ہوں بچوں کو دیکھ لوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو پھر کھانا کھائیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے تم کھانا نکالو میں منہ ہاتھ دھولوں۔" وہ واش روم میں چلے گئے تو میں نے کچن میں جا کر کھانا نکالا تو اس وقت مجھے نہ کوئی آواز سنائی دی اور نہ میں ڈری۔ کیوں کہ اپنے شوہر کی باتوں سے مجھے کافی تسلی ہوئی تھی آصف منہ ہاتھ دھو کر واپس آئے تو میں نے کمرے سے اپنی بیٹی کو بھی بلایا اور ہم کھانا کھانے لگے۔ موسم تو گرمی کا تھا مگر کچن کے آگے صحن میں جو درخت تھا اس کی ٹھنڈی ہوا سیدھی کچن میں آتی تھی۔ اس لئے ہم اکثر کچن میں ہی بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میرے شوہر نے کہا۔ "چلو اب تم آرام کرو۔" ہم اندر کمرے میں آ گئے، میں بیڈ پر لیٹ گئی جب کہ شوہر سامنے چارپائی پر بیٹھے ثمن سے باتیں کرنے لگے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب مجھے نیند آ گئی جب میری آنکھ کھلی تو شام کے 5 بج رہے تھے میں اٹھ کر بیٹھ گئی میرے شوہر دونوں بچوں کو پاس بیٹھائے آئس کریم کھلا رہے تھے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"جاگ گئی......"

میں نے کہا۔ "جی جاگ گئی۔"

تو بولے۔ "تم سو رہی تھی ثمن آئس کریم مانگ رہی تھی تو میں نے باہر دکان سے لے دی۔ تمہارے لئے بھی لے آؤں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی کھائیں گے۔"

"ہاں میں بھی کھاؤں گا۔" وہ باہر آئس کریم لینے گئے تو میں منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ اس وقت میں کافی فریش ہو چکی تھی میں نے دل میں سوچا کہ آصف سچ کہتے تھے کہ آرام نہ کرنے کی وجہ سے تمہیں یہ سب کچھ سنائی دیتا ہے۔ پھر میں نے صحن کے فرش پر دیکھا تو ڈھیروں پتے گرے ہوئے تھے میں نے سوچا آصف ابھی نہیں آئے چلو جھاڑو لگا دوں میں نے جلدی جلدی جھاڑو لگائی سارے پتے اٹھا کر کچرے دان میں ڈال دیئے اور جھاڑو ایک سائیڈ پر رکھ دی۔

جب میں پیچھے مڑی تو پتے پہلے سے بھی زیادہ فرش پر ڈھیر لگ چکے تھے میں نے ایک بار پھر جھاڑو لی اور شروع ہو گئی۔ لیکن تیسری بار تو فرش کم نظر آ رہا تھا اور پتے زیادہ، میں سوچنے لگی یا اللہ پہلے تو اتنے پتے نہیں گرتے تھے یہ آج کیا ہو رہا ہے۔" اتنے میں آصف آ گئے ابھی میں کھڑی کبھی درخت کبھی فرش پر پڑے پتوں کو دیکھ رہی تھی کہ آصف نے پوچھا۔

"کیا ہوا کیوں ایسے کھڑی درخت کو گھورے جا رہی ہو۔"

میں نے کہا۔ "دوبار جھاڑو لگائی لیکن یہ پتے۔"

انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "چلو چلو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

آئس کریم کھالو۔"

میں بھی سر جھٹک کر ان کے ساتھ اندر آ گئی۔ ہم نے آئس کریم کھائی اور بچوں کو لے کر باہر صحن میں آ گئے کیونکہ شام ہو رہی تھی۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ہم نے درخت کے نیچے چارپائی بچھا دی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آصف کی نظر فرش پر پڑی تو وہ بولے۔

"یار تم ویسے ٹھیک کہتی ہو بہت پتے گرتے ہیں۔ اچھا میں ایسا کرتا ہوں یہ جو شاخیں آگے کی طرف ہیں یہ زیادہ کچرا کرتی ہیں ان کو کاٹ دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں یہ آپ نے ٹھیک کہا کاٹ دیں ان کو پھر اتنا کچرا بھی نہیں ہوگا۔"

انہوں نے کہا۔ "تم یہ چارپائی ایک سائیڈ پر کرو میں اپنے دوست فاروق کے گھر سے آری لے آتا ہوں پھر کاٹوں گا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے آپ آری لے آئیں۔"

فاروق کا گھر بالکل ساتھ تھا وہ جلدی واپس آ گئے۔ پھر انہوں نے ایک شاخ کاٹی اور پھر جب دوسری شاخ کاٹنی شروع کی جو کہ کافی بڑی تھی آدھا صحن اس سے ڈھکا ہوا تھا جونہی شاخ کٹی تو شاخ کے نیچے گرتے ہی آصف کے سفید کاٹن کے سوٹ پر خون کے قطرے نظر آنے لگے۔ میری خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ آصف نے گھبرا کر میری طرف دیکھا تو میں تھر تھر کانپ رہی تھی انہوں نے آری ادھر ہی پھینکی اور میرے پاس آئے۔

"کیا ہے......"

میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"ارے کیا ہوا کچھ تو بتاؤ" میں نے مشکل سے آواز نکالی وہ خو......ن......خو......ن......خون۔ آ......پ......آپ کے کپڑوں پر۔" انہوں نے جب اپنے کپڑے دیکھے تو جگہ جگہ خون کے چھینٹے پڑے ہوئے نظر آئے۔

وہ بولے۔ "یہ خون کدھر سے آ گیا۔" وہ بھی کچھ پریشان دکھائی دینے لگے۔ اتنے میں کچن سے کچھ چیز گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی۔ آصف کچن کی طرف بڑھنے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ گئی کچن میں جا کر دیکھا تو کانچ کا جگ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو چکا تھا اسے دیکھ کر تو میں نے رونا شروع کر دیا کیوں کہ پانی والا جگ نیچے فرش پر گیس کے سلنڈر کے ساتھ ہی میں نے رکھا تھا تو پھر یہ کیسے ٹوٹ گیا جب کہ آواز تو ایسے آئی جیسے کوئی اوپر سے چیز نیچے گر کر ٹوٹتی ہے میں نے روتے ہوئے آصف کو جگ کے بارے میں بتایا تو آصف بھی پریشان ہو گئے۔

"یار تم ٹھیک کہتی ہو جگ تو ہم کھانا کھا کے گئے تو یہاں ہی گیس سلنڈر کے پاس رکھا ہوا تھا پھر یہ ٹوٹا کیسے اور یہ خون کیسا ہے، یا خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔" ابھی ہم اسی بارے میں سوچ رہے تھے کہ میرے بیٹے اسفند کی زوردار چیخ سنائی دی۔ ہم دونوں بھاگ کے باہر گئے تو اس کی گردن چارپائی سے نیچے لٹکی ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو اٹھایا آوازیں دینے لگی۔

"اسفند بیٹا آنکھیں کھولو۔" مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آصف یہ دیکھو میرے اسفند کو کیا ہو گیا ہے۔ آصف اس سے بولو ناں آنکھیں کھولے۔" میں مسلسل روئے جا رہی تھی آصف نے مجھے تسلی دی۔

"ہمارے بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔ چلو ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔" جلدی سے اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد اسے کچھ انجکشن لگائے اور پھر بولا۔

"یہ ساتھ والی مسجد میں قاری صادق صاحب ہوں گے ان سے دم کرا آؤ میرے خیال میں بچہ ڈر گیا ہے۔" ہم دونوں جلدی سے باہر نکلے اسفند کو آصف نے اٹھایا ہوا تھا، میں نے ثمن کو، ابھی ہم مسجد کے باہر پہنچے تو فاروق کی کال آ گئی۔

"یار آصف کدھر ہو تم تمہارے گھر کا تو گیٹ بھی کھلا تھا اور دروازے بھی کھلے تھے کدھر گئے ہو آپ لوگ، کم از کم دروازے تو بند کر کے جاتے۔"

آصف نے کہا۔ "یار اسفند کی طبیعت خراب ہے اسے لے کر آئے ہیں۔"

"کیا ہوا اسفند کو رات کو میں آپ کے گھر گیا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا پھر اچانک کیا ہو گیا اسے۔"

پھر آصف نے جلدی جلدی ساری تفصیل اسے بتائی تو اس نے کہا۔

"اس وقت کہاں ہو میں ابھی آتا ہوں۔"

"بازار والی مسجد کے باہر کھڑا ہوں......" آصف نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

ہم مسجد میں گئے تو قاری صاحب نے اسفند کو دیکھا اور دم کرنے لگے اتنے میں فاروق بھی ہمارے پاس آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے مجھے تسلی دی اور پھر قاری صاحب سے پوچھنے لگا۔

تو قاری صاحب نے کہا۔ "میں نے دم کر دیا ہے یہ ہوش میں آجائے گا اور پانی دم کر کے دے دیتا ہوں اسے وقفے وقفے سے پلاتے رہنا۔"

اور پھر بولے۔ "اگر آپ جس گھر میں رہتے ہو وہ چھوڑ دو تو اچھا ہو گا۔ آپ کا بچہ بری طرح سے ڈر گیا ہے خدا کا شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی۔"

ہم واپس گھر آئے تو آصف نے کہا۔

"فاروق تمہاری بھابی نے بھی مجھے بتایا تھا کہ کچن سے کچھ آوازیں آتی ہیں مگر میں نے سوچا شاید اس کا وہم ہے مگر اب پتہ چل گیا ہے یہ سچ کہتی تھی اس لئے ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ اب میں اس گھر میں اپنے بیوی بچوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لئے فاروق تم کوئی اور گھر دیکھو جلد از جلد۔ میں جب تک یہ گھر چھوڑ نہیں دیتا میں ان کے پاس گھر میں رہوں گا میں ان کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے آصف میں دو دن کے اندر کوئی اور گھر دیکھ لوں گا۔" فاروق نے ہامی بھر لی اتنے میں اسفند کو ہوش آ گیا لیکن اس کی آنکھیں ایسی تھیں کہ لال سرخ جیسے خون ہو، میں نے گھبرا کر آصف سے کہا اس کی آنکھوں کو کیا ہوا ذرا دیکھو آصف نے اشارہ کر کے مجھے چپ کروا دیا میں نے آصف سے لے کر اسفند کو اپنی گود میں لٹایا اور اس سے پوچھنے لگی۔

"میرا بیٹا کیا کھائے گا۔" مگر وہ کچھ بول نہیں رہا تھا بس صرف منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے جلدی سے اندر فریج سے جوس نکالا تو اس نے پینے سے انکار کر دیا میں بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی پھر آصف نے اسے دم کیا ہوا پانی زبردستی دو تین قطرے پلایا تو 10 منٹ کے بعد اس کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی۔ تو اس نے آدھا گلاس جوس پی لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا میں نے اور آصف نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی تو فاروق نے اسے اٹھایا تو وہ اس کے پاس چلا گیا تو ہم نے تھوڑا سکون محسوس کیا۔ فاروق بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا کیونکہ وہ ماشاء اللہ تھا ہی بہت خوب صورت صحت مند موٹی موٹی آنکھیں گول مٹول چہرہ، وہ ایک سال کا نہیں لگتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی تین چار سال کا بچہ ہو۔ جب کہ میری بیٹی بھی بہت پیاری نازک سی گڑیا تھی مگر وہ اس سے کئی گناہ زیادہ خوب صورت تھا۔

میں پیار سے اسے خان شہزادہ کہتی تھی میری جان تھا وہ۔ پھر فاروق نے اسے میری گود میں دیا تو آصف نے کہا چلو فاروق ہم کچن خالی کر دیتے ہیں کھانے پینے کا سامان اندر کمرے میں ایک سائیڈ پر رکھ لیں۔ گے اب میں تمہاری بھابی کو کچن میں کھانا نہیں بنانے دوں گا۔ فاروق نے کہا چلو میں تمہاری مدد کرتا ہوں دونوں نے سامان اٹھا کر اندر کمرے میں رکھ دیا۔

آصف نے مجھ سے کہا۔ "بس دو دن کی بات ہے پھر کوئی اور گھر مل جائے گا ہم چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"چلو بھابی لاؤ اسفند کو میرے حوالے کر دو اور آپ اچھی سی چائے پلا دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسفند کو فاروق کے حوالے کیا اور خود اندر کمرے میں جا کر چائے بنانے لگی۔ میں چائے بنا کر کپ میں ڈالنے لگی تو فاروق نے کہا۔ "بھابی اسفند سو گیا ہے۔" تو میں نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہاں ڈال دو میں چائے لے کر باہر آئی ہم نے چائے پی اور میں کپ دھو کر اندر رکھنے گئی تو اسفند کے منہ سے آواز آرہی تھی۔ جیسے کہ آہستہ آہستہ رو رہا ہو، میں جلدی سے

آگے بڑھی تو دیکھا اسفند چھت کو گھور رہا تھا اور آواز بھی نکال رہا تھا، میں نے اسے آواز دی۔ ''اسفند میرا چاند کیا کر رہا ہے آ جا اپنی ماما کے پاس۔'' مگر اس نے میری طرف نہیں دیکھا بس چھت کو گھورتا رہا۔ میں نے آصف کو جا کر بتایا تو وہ بھاگ کر آئے انہوں نے اسے اٹھایا بس اٹھانے کی دیر تھی کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ہم نے بہت کوشش کی کہ اسے چپ کروانے کی مگر چپ نہ کرواسکے۔ وہ بار بار چھت کو گھورتا اور زور زور سے روتا۔

فاروق نے جلدی سے دم کیا ہوا پانی اٹھایا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور زبردستی پانی اس کے منہ میں ڈالا، پانی ڈالنے کی دیر ہوئی کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور بخار سے اس کا جسم ایسے تپ رہا تھا کہ جیسے آگ ہو۔ میں اسے دیکھ کر روئے جا رہی تھی اور اپنے بیٹے کے لئے دعا مانگ رہی تھی۔

فاروق نے کہا۔ ''آصف ایک پیر ہے جو ایسے کاموں کا ماہر ہے ہم کل اس کے پاس جائیں گے میرے پاس اس کا فون نمبر بھی ہے میں تقریباً دو تین بار اس سے ملاقات کر چکا ہوں مجھے امید ہے اس کے پاس جانے سے اسفند ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں نے کہا فاروق تم اسے کال کرو۔ ہم ابھی اس کے گھر جائیں گے۔'' اس ٹائم رات کے نو بجنے والے تھے۔
فاروق نے کال کی اور ساری بات اس کو بتائی تو اس نے کہا۔ ''صبح 8 بجے سے پہلے تم اسے میرے پاس لے آنا۔ اور اس بچے کو ایک منٹ کے لئے بھی اکیلا مت چھوڑنا۔''

''میں آپ کا کام ضرور کروں گا۔''

رات کے 12 بجے کا ٹائم تھا جب کچن کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی میں نے مڑ کر آصف کی طرف دیکھا آصف نے کہا یہ تو کچن کے دروازے کی آواز ہے۔
پھر دوبارہ زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی ہم کمرے کے دروازے میں جا کر کھڑے ہو گئے اتنے میں درخت کے ساتھ مجھے کوئی سایہ سا دکھائی دیا۔

میں نے آصف سے کہا۔ ''وہ دیکھو درخت کے پاس کیا ہے۔'' آصف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ہمیں بھی اندر چلنے کو کہا اور خود بھی اندر آ کر دروازہ بند کر دیا، میں بہت خوف زدہ تھی دل دھڑک رہا تھا ہم بیٹھ گئے تو ہمارے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہونے لگی جیسے کہ کوئی آرام آرام سے انگلی سے دستک دے رہا ہو۔

''آصف نے کہا۔'' تم بیٹھو میں دیکھتا ہوں کون ہے۔''

میں نے زور سے آصف کا ہاتھ پکڑ لیا اور رونا شروع کر دیا۔'' آصف خدا کے لئے نہ جاؤ کوئی چیز ہو گی آپ کو مار دے گی۔'' میں بلک بلک کر رونے لگی تو آصف بیٹھ گئے چلو اب چپ کرو میں کہیں نہیں جا رہا۔

اچانک دروازہ ہلنا شروع ہو گیا جیسے کہ زلزلہ آ گیا ہو ہم نے کلمہ پڑھنا شروع کیا کہ اچانک اسفند نے چیخ ماری اور تڑپنا شروع ہو گیا وہ مسلسل چھت کو دیکھ دیکھ کر زور زور سے رو رہا تھا۔ میں نے کہا۔'' آصف اس کے دودھ والا فیڈر مجھے اٹھا دو سامنے چارپائی پر رکھا ہے۔ میں اسے دودھ دوں۔'' آصف نے پورا کمرہ چھان مارا مگر فیڈر نہ ملا۔

آخر کار تنگ آ کر میں نے گلاس میں دودھ ڈال کر اسے پلانے کی کوشش کی لیکن اس نے دودھ کا ایک قطرہ نہیں پیا۔ میں بار بار اسے اپنے سینے سے لگاتی اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی مگر سب کچھ بیکار، وہ چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک میری طرف دیکھنے لگا اس کی آنکھوں میں درد تھا جیسے کسی بہت بڑی تکلیف میں مبتلا ہے۔ میری طرف دیکھتے دیکھتے وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ میں نے جھک کر اسے پیار کیا تو کافی دیر تک دیکھتا رہا، میں نے کہا۔ ''اسفند بیٹا اسفند بیٹا بولو ناں کیا ہوا ہے ماما کی جان کو۔''

اتنے میں اس کی ناک سے خون نکلا اور اس نے زور کی سانس لی بس وہ اس کی آخری سانس تھی۔

میں نے کہا۔'' آصف یہ دیکھو خون اسفند کی ناک سے نکلا ہے۔'' آصف نے مجھ سے لے کر اسے غور سے دیکھا اور پھر اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں۔''
اور آصف کے منہ سے جو کچھ نکلا وہ میری برداشت سے باہر تھا۔

''اسفند فوت ہوگیا۔'' پھر تو مجھے ہوش نہ رہا۔

میری چیخوں سے ساتھ والے ہمسائے بھی دوڑے آئے فاروق کے گھر والے بھی آگئے سب مجھے چپ کروا رہے تھے سب مجھے دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے مگر میں اپنے بیٹے اسفند کو آوازیں دے رہی تھی۔ مگر اسے کوئی پرواہ نہ تھی آج نہ وہ جوس مانگ رہا تھا نہ دودھ۔ نہ آئس کریم، وہ بالکل خاموش ہوگیا تھا گہری نیند سو رہا تھا۔ آصف مجھے گلے لگا کر چپ کروا رہے تھے مگر میں کسی کی نہیں سن رہی تھی میں نے چارپائی سے اپنے بیٹے کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھا میں بار بار اس کے جسم کو چھو کر دیکھتی کیا پتہ میرا بیٹا بے ہوش ہو۔

محلے کی ایک عورت نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔
''بیٹی حوصلہ رکھو خدا کی چیز تھی اس نے لے لی۔ اپنی بیٹی کو دیکھو وہ تمہیں دیکھ دیکھ کر رو رہی ہے۔'' میں نے دیکھا ثمن میرے پاس کھڑی رو رہی تھی اور ماما کہہ رہی تھی میں نے اسے گود میں اٹھایا بس اس کے بعد مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اسفند کے جانے کی تیاری ہو چکی تھی اسے غسل دے دیا گیا تھا میرے سسرال والے اور راولپنڈی سے میرے امی ابو سب آگئے تھے۔ ''بس نہیں رہا تو صرف میرا بیٹا میرا شہزادہ۔''

غسل کے بعد پتہ چلا کہ اسفند کی گردن پر نشان تھے جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ اور آنکھوں کے آگے کالے سیاہ دھبے نظر آرہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سب اسے منوں مٹی تلے اکیلا چھوڑ کر واپس آگئے۔

میرے امی ابو اور سسرال والوں نے بہت اصرار کیا کہ چلو ہمارے ساتھ مگر میں اپنے بیٹے کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی 5 دن کے بعد سب واپس چلے گئے۔

آصف میرا بچوں کی طرح خیال رکھتے۔ آصف نے بھی مجھے کہا چلو راولپنڈی چلے جاتے ہیں مگر میں نے انکار کر دیا کیوں کہ وہاں گھر کے ساتھ ہی میرے اسفند کی قبر تھی میں اس سے دور نہیں جانا چاہتی تھی۔

میرے بیٹے کو فوت ہوئے ابھی 10 دن ہوئے تھے کہ میں واش روم سے باہر دو قدم آگے چلی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے میں نے ڈر کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں آگے چل پڑی ابھی میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میرے منہ سے خوفناک چیخ نکلی اور میں دروازے میں ہی گر کر بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے بہت تیز بخار تھا لیکن میرے سامنے ایک بزرگ نورانی چہرہ لئے بیٹھے تھے انہوں نے پوچھا۔ ''اب طبیعت کیسی ہے بیٹی۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہوں بابا جی۔''

پھر فاروق نے تعارف کرایا کہ یہ پیر صاحب ہیں حسین احمد پھر مجھے علم ہوگیا یہ وہی پیر ہیں جن کو فاروق جانتا ہے انہوں نے پورے گھر کا جائزہ لیا اور پھر تین تعویز بنائے ایک میرے لئے ایک میری بیٹی ثمن کے لئے ایک میرے شوہر آصف کے لئے۔ تعویز دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''کسی بھی حال میں تعویز گلے سے نہ نکالنا انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔'' اور میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''تعویز پاس رکھو گی اس کے بعد تمہیں ڈر بھی نہیں لگے گا۔''

وہ چلے گئے ہم نے تعویز گلے میں ڈال لئے۔ نہ کوئی واقعہ ہوا نہ آواز آئی اور ناں مجھے ڈر لگا تقریباً ایک ماہ کے بعد ہم نے قرآن پاک کا ختم کروایا کافی مہمان تھے ہمارے اپنے بھی آئے ہوئے تھے۔

ایک دن رہ کر جب سب واپس گئے تو میں گیٹ کے باہر کھڑی ان کو جاتا دیکھ رہی تھی جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوئے تو میں اور آصف واپس گیٹ سے اندر آنے والے تھے کہ ثمن کی چیخ کی آواز آئی۔ ہم پریشان ہوگئے ثمن ہمارے ساتھ باہر کھڑی تھی پھر اندر کب آئی ہم بھاگ کر اندر آئے تو ثمن درخت کے نیچے بے ہوش پڑی تھی پھر تو مجھے ہوش نہ رہا میں نے پاگلوں کی طرح رونا شروع کر دیا ایک بیٹا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب بیٹی بھی

ہاتھوں سے نکل رہی تھی آصف نے اسے اٹھایا اندر کمرے میں لے گئے۔ پھر فاروق کو کال کی تو اس نے پیر صاحب کو بلایا آدھے گھنٹے کے بعد پیر صاحب آ گئے انہوں نے ثمن کی حالت دیکھی تو پریشان ہو گئے، میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ''پیر صاحب میری بیٹی کو بچا لیں خدا کے لئے۔'' میں رو رو کر ان کی منت کر رہی تھی۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ ''کچھ نہیں ہوگا اب میں آ گیا ہوں تمہاری بیٹی کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' پھر انہوں نے ثمن کے گلے میں دیکھا تو تعویز نہیں تھا۔ یعنی تعویز غائب تھا انہوں نے باہر درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔

آصف ثمن کو لے کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔

دو گھنٹے تک وہ پڑھتے رہے اچانک ثمن نے آنکھیں کھول دیں۔ تو پیر صاحب نے پوچھا۔ ''کیا چاہتی ہے تو۔''

ثمن نے بولنا شروع کر دیا ثمن کے اندر سے کسی اور عورت کی آواز آ رہی تھی۔ ''میں سب کو ماردوں گی ان کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

پیر صاحب نے پوچھا۔ ''کیوں ایسا کر رہی ہے۔''

اس نے کہا۔ ''اس کچن اور اس درخت پر ہمارا بسیرا ہے۔'' پھر بولی۔ ''اس نے درخت کاٹا اور ساتھ میرے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دی میری دو بیٹیاں تھیں اور صرف ایک بیٹا تھا اس لئے میں نے ان کے بیٹے کو ماردیا۔ اب بیٹی کو بھی ماردوں گی پھر ان دونوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

پیر صاحب نے کہا۔ ''تمہارا بیٹا کدھر تھا جب اس کی ٹانگ کٹی تو۔''

وہ بولی۔ ''درخت کے اوپر بیٹھا تھا۔''

''تمہارے بیٹے کی کتنی عمر ہے۔''

7 سال ہے۔'' اب وہ چل نہیں سکتا۔''

پیر صاحب نے کہا۔ ''تو نے بیٹے کی ٹانگ کا بدلہ ان کے بیٹے کو مار کر لیا ہے اب ایسا کوئی کام نہ کرنا۔''

''کیوں نہ کروں گی۔'' پیر صاحب جوبات کرتے وہ انکار کر دیتی۔

اس کی باتیں سن کر خوف کے مارے میرا برا حال تھا میرا حلق خشک ہو چکا تھا میں مسلسل کانپ رہی تھی۔

پیر صاحب جب تھک گئے تو انہوں نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا پھر جب پھونک ماری تو وہ چیخنے لگی۔

''مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔''

پیر صاحب نے کہا۔ ''اب تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ پیر صاحب کو خدا کا واسطہ دینے لگی۔

''میں آج کے بعد کچھ نہیں کروں گی۔''

پیر صاحب نے اسے اس کے بچوں سمیت اپنے قبضے میں کر لیا۔

تو ثمن کو ہوش آ گیا وہ اٹھی اور کہنے لگی۔

''پاپا آئس کریم کھاؤں گی۔''

میں نے اور میرے شوہر نے اس کی پیشانی چومی اسے سینے سے لگایا۔

پیر صاحب نے کہا۔ ''اب تم آرام سے رہو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' مگر میں نے کہا۔ ''اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔'' پھر ہم وہ گھر چھوڑ کر راولپنڈی آ گئے کرایہ کے مکان میں رہے پھر ایک سال کے بعد ہم نے اپنی جگہ لے لی اور اپنا ایک چھوٹا سا پیارا سا گھر بنا لیا پھر مجھے خدا نے ایک اور بیٹی عطا کی۔ جس کا نام ہم نے ایمان رکھا، پتہ ہے میری بیٹی کیسی ہے بالکل میرے بیٹے اسفند کی طرح وہی خوب صورت چہرہ، وہی آنکھیں، اسی طرح صحت مند اب بھی مجھے اپنے خان شہزادے کی یاد آتی ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ پھر میں اپنی دونوں بیٹیوں کو سینے سے لگا لیتی ہوں۔

اور آپ کو پتہ ہے وہ پیارا سا بچہ کس کا تھا۔ وہ آپ کی اپنی بہن شانزہ اعوان کا بیٹا تھا۔'' اس لئے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کے بچوں کو سلامت رکھے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری ثمن اور ایمان کے لئے بھی دعا کریں اللہ ان کو سلامت رکھے۔'' آمین ثمہ آمین۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

بلیک آئی لینڈ

شہزاد خان۔صادق آباد

عفریت کا خوف سے چہرہ لبریز تھا، وہ گوشت کھانے میں اس قدر مصروف تھی کہ آسمان پر ٹمٹمانے والے ستارے بھی حیرت و استعجاب سے اسے دیکھ رہے تھے کہ اچانک......

جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی اور رگوں میں خون منجمد کرتی خوفناک اور ہولناک کہانی

مئی 1985ء کی ایک چمکدار صبح ہم لوگوں نے اپنا سفر شروع کیا تو ہم سب کے چہرے انجانی خوشی اور ایک بھرپور ایڈونچر بھرے سفر سے لطف اندوز ہونے کے لئے تمتما رہے تھے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے عزیز واقارب اور بیوی بچوں سے ایک لمبے عرصے تک دور رہنے کا غم بھی ستا رہا تھا۔ہم سب جن میں میرے علاوہ میرے تین دوست اور ان کے ساتھ ساتھ چھ مزدور جنہیں ہم لوگوں نے باربرداری اور دوسرے کام کاج کے سلسلہ میں کچھ رقم دے کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کیا تھا۔ہم چاروں دوست اپنے علاقے میں اچھے اور بہترین شکاری سمجھے جاتے تھے۔ہم نے اپنی زیادہ تر زندگی خوفناک جنگلوں میں خونخوار درندوں کا شکار کھیلتے گزاری تھی۔شکار کے دوران کئی بار ہم موت کے منہ سے بچے تھے لیکن اس کے باوجود جان جوکھوں کا کام کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے تھے۔ایک روز باتوں ہی باتوں میں کسی دور دراز جزیرے پر جا کر شکار کھیلنے کا پروگرام بن گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے ایک بڑی لانچ کے مالک کو بھاری رقم ادا کرکے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا اور کچھ تگڑے اور تجربہ کار مزدور بھی اس لانچ کے مالک کی مدد سے مل گئے۔

اور اس کے نتیجے میں اس روز ہم سب ایک بڑی سی لانچ میں سوار ہو کر سمندر میں اپنے ان دیکھے سفر کا آغاز کر چکے تھے۔تاحدِ نگاہ سمندر کا نیلگوں پانی سفید سفید جھاگ اڑاتا شیشے کی سلائیڈ کی مانند چمک رہا تھا اور اس میں سے مچھلیاں پکڑتے سفید سفید آبی پرندے بہت بھلے لگ رہے تھے۔لانچ میرے ایک دوست تیمور علی کے ہاتھوں میں پانی پر اچھلتی تیزی سے آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ہم سب نے بھی لانچ چلانے کی ٹریننگ لے لی تھی کہ نجانے کیسے حالات سے سامنا کرنا پڑے یہ سوچ کر سب نے اچھی طرح اور ذمہ داری سے تربیت حاصل کرلی تھی تاکہ کسی ممکنہ حادثے سے فوری طور پر بچا جاسکے۔اس کے ساتھ ساتھ ہم نے مزدوروں کو بھی تھوڑی بہت ٹریننگ دے دی تھی تاکہ وہ بھی اپنا شوق پورا کرتے رہیں۔

ہم سب خوش گپیوں میں مصروف تھے ہم نے گھر سے چلتے وقت اپنے سامان میں نقشہ، رسیوں کے بنڈل، گرم چادریں، چھریاں، چاقو، مٹی کے تیل کے کنستر، ماچسوں کے پیکٹ، کافی کی بوتلیں، نمک، مرچ غرض ضرورت کی ہر وہ چیز رکھ لی تھی جس کی ہمیں کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔کارتوسوں کی بڑی بڑی پیٹیاں، رائفلیں اور ماؤزر وغیرہ اپنی ضرورت سے بھی زیادہ لانچ میں رکھ لئے تھے۔اس لئے ہم سب بے فکری سے سفر سے لطف



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

انڈوز ہو رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی پکنک پوائنٹ پر تفریح کی غرض سے جارہے ہوں۔

نقشے کے مطابق ہم سب کی منزل سمندر میں موجود دور دراز کا ایک جزیرہ "بلیک آئی لینڈ" تھا۔ جس کے بارے میں ایک عام روایت تھی کہ یہ جزیرہ دنیا کے خوفناک ترین جزیروں میں سے ایک ہے۔ اس کے اندر آج تک کوئی شکاری یا سیاح نہیں جاسکا اور نہ ہی وہاں سے کسی قسم کی معلومات کوئی لاسکا۔ اس لئے یہ جزیرہ ابھی تک دنیا والوں کے لئے ایک سربستہ راز ہی تھا ان لوگوں نے اسے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے انتخاب کیا تھا۔

شروع شروع میں جو بھی اس کا نام سنتا اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگتا۔ ان چھ مزدوروں میں سے بھی چار مزدوروں نے ساتھ جانے سے صاف انکار کردیا تھا مگر جب میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کافی ساری رقم کی جھلک دکھائی تو وہ ساتھ چلنے پر آمادہ ہو ہی گئے۔ ہم نے ان مزدوروں کو کچھ معقول رقم پہلے ہی دے دی تھی تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو خرچہ وغیرہ دے دیں تاکہ انہیں بعد میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور اس سارے مرحلے کو بخوبی طے کرنے کے بعد ہم اپنے سفر کا آغاز کر چکے تھے۔ اور بلیک آئی لینڈ کی جانب رواں دواں تھے۔ اس دوران ہم سب نے باری باری لانچ کو چلایا تھا تاکہ دوسرے افراد بھی تھوڑا آرام کرسکیں اور تازہ دم رہیں۔ ایسا کرنے سے ہم سب کے چہروں پر بشاشت تھی اور ہم آنے والے وقت سے بے خبر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

شام کا جھٹپٹا ہر سو پھیلنے لگا تھا آبی پرندے قطاریں باندھے واپس اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے آسمان پر کہیں کہیں آوارہ بادل اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ سمندر کا پانی خاموش ہوگیا تھا اور ننھے ننھے ستارے آسمان پر ٹمٹمانے لگے تھے جن کے جھرمٹ میں چاند بھی کبھی کبھی اپنا روشن چہرہ نکال کر لانچ کے مسافروں کی طرف جھانک لیتا تھا۔ ہم سب نے ہلکا پھلکا کھانا کھا کر اپنے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھام رکھے تھے آگ جلانے کے لئے ہم نے گیس سے چلنے والے چولہے کا بندوبست سب سے پہلے کیا تھا۔ تیمور صاحب کیا خیال ہے ہم کب تک اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے؟ افضال احمد نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ اگر ہم بغیر رکے اسی رفتار سے آگے بڑھتے رہے تو میرے خیال میں پرسوں دوپہر تک ہم "بلیک آئی لینڈ" تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ تیمور علی نے لانچ کا اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ لوگوں نے خوامخواہ کیوں اس جزیرے کو منحوس اور آسیب زدہ مشہور کررکھا ہے" میرے ایک دوست شان نے کندھے اچکاتے ہوئے لقمہ دیا۔ "انگور کھٹے ہیں دوستو! جو لوگ کسی کام کو سرانجام نہیں دے سکتے وہ ایسی ہی بے سروپا باتیں کرکے خود کو دھوکا دیتے ہیں۔" تیمور علی نے جواباً کہا۔

"باقی اس بات میں کہاں تک صداقت ہے اس کا تو وہاں چل کر ہی پتہ چلے گا اس لئے جب تک ہم وہاں پہنچ نہیں جاتے اس قسم کی قیاس آرائیاں کرنا فضول ہے"۔ میں نے بھی دخل در معقولات دیتے ہوئے کہا۔ اسی قسم کی ہنسی اور ہلکا پھلکا مذاق کرتے ہوئے ہم سمندر میں آگے کی جانب بڑھتے جارہے تھے۔

ہمارے پاس فیول کا اسٹاک تھا اس لئے اس کی طرف سے تو ہم بالکل بے فکر تھے باقی خوراک کی طرف سے بھی ہم نے ہاتھ کھلا رکھا تھا اور ضرورت سے زیادہ ہی خوراک اسٹور کی تھی کہ نجانے کتنے روز ہمیں جزیرے پر رہنا پڑے اور کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔

رات کے وقت سمندر کے پانی پر چاند کی سفید چاندنی بہت بھلی لگ رہی تھی رات دھیرے دھیرے اپنا سفر جاری رکھے اجالے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تیمور علی نے لانچ کا اسٹیئرنگ ایک مزدور کو تھما کر کچھ ہدایات دیں اور خود ایک طرف بنے کیبن کی جانب بڑھ گیا۔ ہم دیگر دوست پہلے ہی کیبن میں بچھے ہوئے موٹے موٹے گدوں کے بستروں پر براجمان تھے اور آنے والے حالات پر تبصرہ کررہے تھے۔ تیمور علی بھی ایک خالی بستر دیکھ کر اس پر دراز ہوگیا۔ کچھ دیر وہ بھی ہمارے ساتھ ہماری باتوں میں شامل ہوگیا اور باتیں کرتے کرتے ہم نیند کی آغوش میں کھو گئے۔

صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو سورج کافی نکل چکا تھا اور لانچ سمندر کے پرشور پانی پر اچھلتی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ ہم نے نقشے اور کمپاس کے حساب سے دیکھا تو ہم اپنی منزل سے ایک دن کی دوری پر تھے۔ ہم نے باری باری ناشتہ کیا اور مزدوروں سے رات کے سفر کے متعلق بات چیت کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ساری رات باری باری لانچ کو چلاتے رہے تھے اور اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میں نے ایک مزدور کے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ پکڑا اور اسے ناشتہ کرنے کا کہہ کر لانچ کی رفتار بڑھادی۔

لانچ ایک جھٹکا لیتے ہوئے پانی کی لہروں پر اچھلی اور بندوق کی گولی کی مانند اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ابھی ہمیں سفر کرتے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ پانی کی لہروں میں کچھ کچھ حرکت ہونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لہروں نے سر اٹھانا شروع کردیا۔ لانچ پانی پر ڈولنے لگی اور اس کا اسٹیئرنگ میرے ہاتھوں سے نکلنے لگا جسے میں نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا مگر اس کے باوجود میرے ہاتھ اسے سنبھالنے میں ناکام ہورہے تھے۔ لہروں کے پرزور شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی ہم سب نے چیختے ہوئے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا اور پھر تیمور علی کی ہدایات پر مزدوروں نے لانچ پر سے وزن کم کرنے کے لئے اپنا فالتو سامان اٹھا اٹھا کر سمندر کے پانی میں پھینکنا شروع کردیا کہ شاید وزن ہلکا ہونے سے لانچ کے الٹنے کا خطرہ کم ہوسکے مگر موجوں نے اسے مزید اور جھٹکے دینے شروع کردیئے۔

میں نے چیختے ہوئے افضال احمد کو آواز دی کیونکہ مجھ سے اب لانچ کا اسٹیئرنگ کنٹرول کرنا مشکل ہوگیا تھا اور میرے ہاتھ شل ہوچکے تھے۔ افضال احمد نے آہستہ آہستہ میرے قریب آن کر مجھ سے اسٹیئرنگ لے لیا اور لانچ اسی رفتار سے آگے بڑھتی جارہی تھی مگر اس کے چلنے کے انداز میں فرق آگیا تھا پہلے وہ پرسکون انداز میں آگے بڑھ رہی تھی مگر اب وہ مینڈک کی طرح اچھلتی کودتی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ ہمیں اس انداز میں سفر کرتے مسلسل دو گھنٹے ہوگئے تھے مگر ان دو گھنٹوں کو ہم نے کس اذیت سے گزارا تھا یہ ہم یا ہمارا خدا ہی جانتا تھا۔

لانچ کے مسلسل جھٹکوں نے ہم سب کے جسموں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ہمارا انگ انگ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں موجیں کم ہونا شروع ہوگئیں اور پھر یکدم سمندر کا پانی یوں ساکت اور پرسکون ہوگیا جیسے کبھی اس میں طغیانی آئی ہی نہ ہو۔ سمندر کے پرسکون ہوتے ہی ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سورج اب ہمارے عین سروں پر آگیا تھا اور ہمیں اب بھوک نے بھی ستانا شروع کردیا تھا ہم نے مزدوروں سے کہہ کر کھانا تیار کروالیا اور پھر سیر ہوکر کھایا۔ موجوں سے لڑنے کی وجہ سے ہمیں بھوک بھی بہت لگی تھی اس لئے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ کھانا کھا کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔

صبح سویرے ہم اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے اس لئے ہم وہاں تازہ دم ہوکر جانا چاہتے تھے جزیرے کے متعلق سننے والی عجیب وغریب باتیں اور قصے ہمارے ذہنوں میں گونج رہے تھے اور ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ لانچ اپنی پوری رفتار سے سمندر کے پانی پر اچھلتی بھاگتی چلی جارہی تھی کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی بھنور میں پھنس گئی ہو اور پھر تیزی سے گھومنے لگی۔ لانچ میں موجود دوسرے افراد پریشانی کی کیفیت میں کھڑے سمندر کے پانی کے اندر جھانکنے کی کوشش کررہے تھے۔ "کیا ہوا یہ لانچ کو چکر کیوں آرہے ہیں؟" شان نے قریب آکر پوچھا۔

"میرے خیال میں ہم شارک مچھلیوں کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں کیونکہ آپ لوگوں سے ملنے سے پہلے میں ایک بحری جہاز میں ملازمت کرتا تھا اور اکثر وبیشتر ہمیں ان حالات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لئے لانچ کو جس طرح کے جھٹکے لگ رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں شارک مچھلیوں کی بہتات ہے۔ اس میں زیادہ گھبرانے والی بات نہیں ہے کیونکہ جب تک شارک مچھلیوں کو تنگ نہ کیا جائے اس وقت تک یہ کچھ نہیں کہتی ہیں۔ ہاں اگر ان پر حملہ کرنے میں ہم پہل کریں گے اور اس کے نتیجے میں اگر ان میں سے کوئی زخمی ہوجائے تو پھر ہمیں ان کا لقمہ بننے

سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ان سے بچاؤ کا یہی طریقہ ہے کہ خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھا جائے اور کسی نہ کسی طریقے سے لانچ کو اس علاقے سے فوراً دور لیجایا جائے“۔ایک مزدور نے تمام تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔اس کی یہ بات سنتے ہی تیمور علی نے لانچ کو کنٹرول کرتے ہوئے بھنور سے نکالا اور اس کی رفتار تیز کردی۔

لانچ نے ایک جھٹکا لیا اور مینڈک کی مانند اچھلتی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔کچھ ہی دیر میں ہم اس علاقے سے بہت دور نکل آئے۔مسلسل چار پانچ گھنٹوں تک سفر کرنے کے بعد ہمیں دور بہت دور ایک سیاہ لکیری نظر آئی ہم سمجھ گئے کہ یہی سیاہ لکیر ہی ”بلیک آئی لینڈ“ ہے یہ دیکھ کر ہم سب نے ضروری سامان ایک ترتیب سے ایک جانب رکھنا شروع کردیا ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ صرف وہی سامان جزیرے پر لے جایا جائے جس کی ہمیں اشد ضرورت پڑے گی فالتو سامان لیجانے سے خوامخواہ اسے سنبھالنا پڑتا۔

جوں جوں ہم اس لکیر کی جانب بڑھتے جارہے تھے توں توں اس سیاہ لکیر کا حجم بڑھتا جارہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سیاہ لکیر نے ایک وسیع جزیرے کی شکل اختیار کرلی۔جزیرے کی سرزمین پر درختوں کی قطاریں دور سے ہی دکھائی دینے لگی تھیں۔دور سے وہ ایک گھنا اور گنجان نظر آرہا تھا۔کچھ ہی دیر میں لانچ نے جزیرے کی سرزمین کو چھوا اور جھٹکا کھاتے ہوئے رک گئی۔تیمور علی نے جزیرے کے نزدیک پہنچتے ہی اس کی رفتار کم کردی تھی اس لئے وہ پانی پر تیرتی ہوئی جزیرے کی زمین سے ٹکرا کر رک گئی۔بعد میں اس نے لانچ کا انجن بند کرکے چابی میری جانب اچھال دی جسے میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بے خیالی میں اپنی پتلون کی سائیڈ والی جیب میں ڈال لیا۔ہم نے پہلے تمام مزدوروں کو نیچے اتارا اور پھر سامان اٹھا اٹھا کر انہیں پکڑانے لگے جسے وہ زمین پر ایک طرف رکھنے لگے۔

سارا ضروری سامان اتار کر ہم بھی لانچ سے نیچے آگئے اور بڑے غور سے جزیرے کو دیکھنے لگے۔جزیرے پر ایک پراسراری خاموشی طاری تھی یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے کوئی انسان اس طرف نہ آیا ہو۔حتیٰ کہ کہیں سے کسی چرند پرند یا کسی درندے کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی شاید ایسا شام کا جھٹپٹا چھا جانے کی وجہ سے محسوس ہورہا ہو۔پھر کچھ دیر میں ہم نے آپس میں فیصلہ کرکے رات یہیں ساحل سمندر پر بسر کرنے کے ارادے سے سامان میں سے مضبوط کپڑے کے خیمے نکالے جنہیں مزدوروں نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے ساحل کی ریت پر کھونٹے گاڑ کر لگادیا۔ہم نے اپنے ساتھ سفری بستر بھی لائے تھے وہ بھی انہوں نے جھٹ پٹ خیموں میں لگادیئے۔پھر اطمینان سے رات کا کھانا کھایا اور سونے سے پہلے ہم نے احتیاط کے پیش نظر باری باری پہرہ دینے کی ڈیوٹیاں لگادی تھیں تاکہ کسی ممکنہ خطرے سے فوری طور پر نپٹا جاسکے۔

ہم چونکہ دس افراد تھے اس لئے ہم نے دو دو افراد کی ٹولیاں بنالیں اور ہر ٹولی کے ذمے دو گھنٹے جاگ کر پہرہ دینے کی ڈیوٹی لگائی اور اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی کہ ہر ٹولی کے افراد انتہائی چابکدستی اور ذمہ داری سے پہرہ دیں گے۔اس کے باوجود کہ جزیرے پر ہمیں کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہیں دی تھی لیکن پھر بھی ہم نے پہرہ دینے کے کام کو اہم جانا تھا۔باری کے مطابق پہلی ٹولی میں دو مزدور ہاتھوں میں رائفلیں لے کر خیمے سے ذرا ہٹ کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے تھے اور ہم آرام کرنے کی غرض سے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

چاند ایک شیشے کے گولے کی مانند آسمان پر چمک رہا تھا ستارے سہمے سہمے انداز میں زمین پر اس جانب دیکھ رہے تھے جس طرف ایک عجیب وغریب مخلوق اپنے بے ڈھنگے جسم کے ساتھ لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب بڑھتی جارہی تھی اس کے لڑھکنے کے انداز کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے تیل کا ڈرم زمین پر لڑھکتا جارہا ہو۔یہ ”چوملنگا“ تھی اس خوفناک اور کالے جزیرے کی انتہائی خطرناک مخلوق۔اس کے جسم پر بھورے رنگ کے گھنے بال تھے جو سرکنڈوں کی مانند نوکیلے تھے اور اس کے پنجوں کی چھ چھ انگلیاں تھیں جن کے ناخن اپنی لمبائی کی وجہ سے آگے سے کسی قدر مڑ گئے تھے اور اس کا چہرہ کینگرو کی شکل جیسا تھا اور ناک چوڑا اور انتہائی بھدا تھا اس کے جبڑوں کا گوشت منہ

کے دونوں اطراف سے باہر کی جانب نکلا ہوا تھا اور اس کے سائیڈوں سے نکلے ہوئے پیلے پیلے دانت اس کی ٹھوڑی تک جھول رہے تھے۔اس کے چلنے کا انداز قدرتی طور پر لڑھکنے جیسا تھا اور ایک نظر میں وہ ایک گولے کی مانند ہی دکھائی دیتی تھی وہ تیزی سے لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب جارہی تھی جیسے کوئی دور بیٹھا اسے ریموٹ کنٹرول سے چلا رہا ہو۔

چاند آسمان پر دھیرے دھیرے اپنے سفر میں مصروف تھا۔دونوں مزدور ہاتھوں میں پکڑی رائفلیں پتھر کے سہارے ٹکا کر باتوں میں مصروف تھے اور اپنے بھیانک انجام سے بے خبر اس جزیرے کی پراسراریت کے متعلق باتیں کررہے تھے اور ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بیوقوفی اور توہم پرستی پر بھی ہنس رہے تھے جنہوں نے اس خوبصورت جزیرے کے متعلق خوامخواہ کی بے سروپا اور جھوٹی باتیں پھیلا رکھی تھیں حالانکہ جب سے وہ لوگ اس جزیرے پر پہنچے تھے ابھی تک انہیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی تھی جسے دیکھ کر انہیں ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی باتوں کا یقین ہوتا۔

ساتھ ساتھ وہ اس پہلو پر بھی غور کررہے تھے کہ شاید بحری قزاقوں نے یہاں کوئی خزانہ دفن کررکھا ہو اور اسے محفوظ کرنے کے لئے اس قسم کی جھوٹی خبریں پھیلادی ہوں تاکہ کوئی اس جزیرے پر آن کر ان کے خزانے کو حاصل نہ کرسکے۔جزیرے پر ایک سکون کی سی کیفیت طاری تھی کہیں کہیں سے کسی جھینگر کے بولنے کی آواز سنائی دیتی تو پل بھر کے لئے خاموشی کا طلسم ٹوٹتا اور پھر وہی گھمبیر خاموشی چھا جاتی۔ایک مزدور جو سامنے کے رخ بیٹھا جزیرے کے درختوں کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

اچانک باتیں کرتے کرتے اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا اور اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹی رہ گئیں اس کی نظریں اس عجیب وغریب شے پر ٹکی ہوئی تھیں جو ایک ڈرم کی طرح لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب ہی آرہی تھی پہلے تو وہ اسے ایک خالی ڈرم ہی سمجھا مگر جب آناً فاناً وہ چیز ان کے نزدیک پہنچ کر ایک دم اچھل کر کھڑی ہوئی تو خوف ودہشت سے ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ان کے سامنے ایک عجیب الخلقت شے تھی جس کی طرف دیکھتے ہی ان دونوں کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

خوف سے انہیں اپنے نزدیک رکھی بندوقیں تک اٹھانے کا خیال نہ آیا۔انہوں نے بھاگنے کے لئے قدم آگے بڑھانا چاہے مگر ان کے قدموں نے تو زمین کو یوں تھام لیا تھا جیسے کوئی مقناطیس لوہے کو پکڑتا ہے۔ان کے چیخنے چلانے سے جزیرے کی خاموش فضا میں ان کی آوازوں کی بازگشت ابھی تک گونج رہی تھی اور ان کے یکدم چیخنے سے درختوں پر بیٹھے سینکڑوں پرندے اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے باہر نکل کر آسمان پر اڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی خیموں میں سوئے ہوئے ہم لوگ بھی گھبرا کر باہر نکل آئے اور ہم نے بڑبڑاتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو ملتے ہوئے حقیقت جاننا چاہی تو ہماری بھی وہی حالت ہوگئی جو اس سے پہلے دیگر دو مزدوروں کی ہوئی تھی۔

ابھی ہم اپنے بچاؤ کی کوئی صورت سوچ ہی رہے تھے کہ اس بلا کا داؤ چل گیا اور اس نے اپنے نزدیک کھڑے ایک مزدور کے چہرے پر اپنا بھاری تھپڑ دے مارا۔تھپڑ لگتے ہی مزدور جو سکتے کی سی حالت میں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اچھل کر دور جا گرا اور یہ دیکھ کر دیگر افراد کی چیخیں نکل گئیں کہ تھپڑ کھانے والے مزدور کا دھڑ اور سر علیحدہ علیحدہ جاگرے تھے یہ دیکھ کر سب نے اس عجیب وغریب بلا کی طاقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

ہم نے دوڑ کر خیموں سے اپنی بندوقیں نکالیں اور ان کا رخ اس بلا کی جانب موڑ کر گولیاں برسانا شروع کردیں مگر اس سے پہلے کہ گولیاں اس بلا کے جسم کو چھوتیں اس بلا نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور زمین پر گرتے ہی اس کا جسم تیزی سے ایک گیند کی شکل میں تبدیل ہوگیا اور وہ توپ کے گولے کی مانند زمین پر لڑھکتی ہوئی ہماری جانب بڑھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ہم تیزی سے دائیں جانب ہوگئے ۔وہ تیزی سے آگے نکل گئی اور کچھ دور جا کر اس نے اپنا رخ بدلا اور دوبارہ ہماری طرف بڑھی۔

یہ دیکھ کر ہم نے دوبارہ اس پر گولیوں کی بارش کردی مگر اس سے پہلے کہ گولیاں اس کے جسم کو چھوتیں وہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

کسی گولی کی مانند ہمارے جسموں سے آٹکرائی ہم نے اپنے بچاؤ کی بھرپور کوشش کی مگر اس کے جسم کے شدید جھٹکے سے ہم سب اچھل کر دور جا گرے اور بندوقیں ہمارے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ ہمیں نیچے گرتے دیکھ کر وہ یکدم اچھل کر کھڑی ہوئی اور تیزی سے ایک مزدور کو ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اس کے بالوں کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا تو اس کا سر اس کے دھڑ سے علیحدہ ہوگیا اور اس میں سے نکلنے والی نسیں اور رگیں ہوا میں لہرانے لگیں اور دھڑ ایک جانب جا گرا اور زمین پر اس کے جسم کا خون تیزی سے پھیلنے لگا۔

اپنے ساتھی کا یہ بھیانک انجام دیکھ کر ہم سب کے جسموں پر لرزہ طاری ہوگیا اور ہمیں اس جزیرے کے متعلق پھیلی ہوئی آسیبی باتوں پر یقین آگیا ہم اس وقت کو کوس رہے تھے جب ہم نے اس منحوس جزیرے پر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے دوڑ کر دوبارہ اپنی بندوقوں کو اٹھانے کا ارادہ کیا مگر اب وہ بلا ہمیں اس بات کا موقع کہاں دینے لگی تھی اس نے دوبارہ اچھل کر ایک اور ساتھی کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا مگر اب ہم سب ہوشیار ہوگئے تھے اس لئے ہم نے ادھر ادھر ہو کر خود کو اس کے حملے سے بچایا۔

مگر پھر بھی ایک بدقسمت مزدور اس کی گرفت میں آہی گیا جسے اس مخلوق نے جلدی سے پکڑ کر ایک بھرپور تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارا اور اس کے چہرے پر تھپڑ یوں پڑا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے لوہے کا گرز دے مارا ہو اس کا دایاں گال پھٹ گیا اور اس کی کھال ایک جانب لٹک گئی تھی وہ چیختا ہوا ایک جانب بھاگا مگر وہ اس کی چیخوں سے بے نیاز اسے اپنی جانب گھسیٹنے لگی اور اپنے قریب آتے ہی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر مخالف سمت میں کھینچ دیا یہ دیکھ کر خوف سے ہماری چیخیں نکل گئیں کیونکہ ایک زندہ شخص ہمارے سامنے دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔

ہم نے لرزتے جسموں کے ساتھ اس طرف دوڑ لگادی جہاں ہماری لانچ کھڑی تھی یہ تو شکر تھا کہ ہم نے اس کو مضبوطی کے ساتھ رسی سے نہیں باندھا تھا اس لئے اس کے نزدیک پہنچتے ہی ہم سب اچھل اچھل کر اس میں سوار ہونے لگے میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالنا چاہی تو یہ دیکھ کر بھک سے میرا دماغ ماؤف ہوگیا کہ جیب خالی تھی اور لانچ کی چابی نجانے کہاں گر گئی تھی شاید بھاگتے ہوئے جزیرے پر ہی کہیں گر گئی ہوگی۔

بہرحال یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا اس لئے ہم نے جلدی سے نیچے اتر کر لانچ کو دھکا لگا کر پانی کے اندر دور تک لے گئے اب ساحل کی زمین اور لانچ کا فاصلہ تقریباً پچیس تیس فٹ کے قریب ہوگیا تھا مگر اب بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اچانک وہ بلا پانی کے اندر سے نمودار ہوگی اور ہم میں سے کسی اور بدنصیب کو دبوچ لے گی۔ یہاں سے جزیرے پر پھیلی ہوئی ریت چاندنی کی چاندنی میں ہیروں کی مانند چمک رہی تھی دور سے وہ بلا ہمیں صاف نظر آرہی تھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دو حصوں میں بٹے ہمارے ساتھی کے سینے کو اپنے ناخنوں سے ادھیڑا اور اس کا دل مٹھی میں لے کر کچر کچر چبانے لگی ہمیں یہ دیکھ کر ابکائیاں آنے لگیں۔

ہمارے دو ساتھی شروعات میں ہی ہم سے بچھڑ گئے تھے جن کی موت کا ہم سب کو بے حد افسوس تھا۔ دل کھانے کے بعد اس کے ہاتھ میں ہمارے مردہ ساتھی کے پھیپھڑے اور گردے جھول رہے تھے خون سے اس کا چہرہ لبریز ہوگیا تھا خوف و دہشت کی وجہ سے ہم سے اس کی طرف دیکھا بھی نہ جا رہا تھا وہ گوشت کھانے میں اس قدر مصروف تھی کہ آس پاس نظر آنے والے گیدڑ اور لگڑ بگڑ بھی بیٹھے اس کو بڑے غور اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہم بے بسی کی تصویر بنے اپنے دو معصوم اور بے گناہ ساتھیوں کو اس خوفناک بلا کا کھاجا بنتے دیکھتے رہے اور ان کی خاطر کچھ بھی نہ کر پائے اور اب اپنی جانیں بچا کر لانچ میں چھپے بیٹھے تھے۔ خوف سے ہمیں نیند نہیں آئی اور ہم جزیرے پر نظریں ٹکائے رات گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

وہ خوفناک عفریت کچھ دیر بعد دوبارہ اچھلی اور اس کا جسم پھر گول ہوا اور وہ تیزی سے ایک جانب لڑھکنے لگی اور کچھ ہی دیر میں ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی ہم نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ہمیں بال بال موت کے منہ سے بچا لیا تھا۔

رات کے نجانے کون سے پہر ہماری آنکھ لگ گئی اور

اس وقت جاگے جب سورج کی کرنیں لانچ کے عرشے پر پھیلنے لگی تھیں پہلے تو ہم بے خیالی میں آرام سے لیٹے سورج کو تکتے رہے پھر جیسے ہی ہمیں رات والی خوفناک بلا اور وہ خونی منظر یاد آیا ہم فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور تیزی سے جزیرے کی طرف نظریں دوڑائیں تو ہمیں وہاں پھیلی ہوئی ہریالی نظر آئی جو کہ کل رات اندھیرا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ جابجا پھیلے ہوئے عجیب وغریب قسم کے عنابی اور پیلے پھول بھی دکھائی نہیں دیئے تھے جن کا سائز ایک پیالے جتنا بڑا تھا اور ان کا رخ اوپر کی بجائے زمین کی طرف تھا یہ کم وبیش چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور نجانے ان میں سے کون سی بھینی بھینی خوشبو نکل رہی تھی کہ اس کا احساس ہمیں اتنے فاصلے سے بھی بخوبی ہو رہا تھا اس کے فوراً بعد ہم نے جزیرے کے چاروں طرف بھی غور سے دیکھنا شروع کردیا کہ کہیں وہ عفریت دوبارہ ہماری تاک میں نہ چھپی بیٹھی ہو مگر کافی دور دور تک دیکھنے کے باوجود بھی وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

ہم نے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور پھر باقی بچ جانے والے مزدوروں کے ساتھ مل کر لانچ کو دھکیل کر دوبارہ ساحل تک لے آئے اور ایک رسی کی مدد سے قریب کے ایک درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا کہ کہیں لانچ رسی کھل جانے کی وجہ سے گہرے پانی میں نہ چلی جائے۔ ہماری رائفلیں ابھی تک وہیں پڑی تھیں اور خیمے بھی اسی طرح ایستادہ تھے اس بلا کا شکار ہونے والے ہمارے دونوں ساتھیوں کا بچا کھچا گوشت لکڑ بگڑ کھا گئے تھے اور اب وہاں صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہی پڑے دکھائی دے رہے تھے۔

ہم نے سب سے پہلے اپنی رائفلیں قابو کیں اور پھر خیمے اٹھا کر ان کو لپیٹا اور احتیاط سے لانچ میں رکھوا دیا اور رائفلیں ہاتھوں میں تھام کر جزیرے کے اندر داخل ہوگئے ہم نے چاروں مزدوروں کو اپنے اردگرد نظریں جمائے رکھنے کا کہہ دیا تھا ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا دوبارہ نہ حملہ آور ہو جائے۔ اس انداز میں ہم آگے بڑھتے جزیرے کے اندر داخل ہوگئے۔

جزیرے میں درختوں کی بہتات تھی اور جنگلی جھاڑیاں جگہ جگہ راستے میں نظر آئیں گنجان درختوں کی وجہ سے زمین پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اب جیسے ہی ہم جزیرے کے اندر داخل ہوئے تو ہمیں اس میں پھرنے والے جنگلی جانور اور حشرات الارض بھی نظر آنے لگے۔

بڑا عجیب اور پراسرار جزیرہ تھا جس میں سرخ رنگ کے جانور کافی مقدار میں دکھائی دے رہے تھے وہ اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے جھاڑیوں میں چھپے ہماری طرف دیکھ رہے تھے ان کا جسم خرگوش کی مانند اور چہرہ بلی جیسا تھا ہم نے ایسے جانور پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

ابھی ہم آپس میں باتیں کرتے اور ادھر ادھر دیکھتے تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ جزیرے کی زمین یوں ہلنے لگی جیسے کوئی دیو قامت مخلوق اس کو روندتی چلی آرہی ہو ہمارے خوف سے رنگ فق ہوگئے ابھی ہم اپنے بچاؤ کی کوئی صورت سوچ ہی رہے تھے۔

اچانک ہمارے سروں پر موجود درختوں میں ہلچل ہوئی اور زمین پر یکدم تیز روشنی پھیل گئی اور یہ دیکھ کر ہماری دہشت سے چیخیں نکل گئیں کہ ایک ڈائنوسار نسل کا جانور اپنی اونٹ جیسی تھوتھنی درختوں سے نکالے ہمارے سروں پر موجود تھا اس کا سر درختوں کے اندر آنے سے سورج کی روشنی زمین پر پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے دن کا سماں جنگل کے اندر تک پھیل گیا تھا ہم نے اسے دیکھتے ہی ایک جانب دوڑ لگادی ابھی ہم دس قدم ہی بھاگے ہوں گے کہ یکدم ہمارے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی اور ہم چیختے چلاتے ہوئے سر کے بل ایک گہرے کنویں میں گرتے چلے گئے۔

یہ شام کے تقریباً پانچ بجے کا وقت ہوگا جب چھ جنگلی ہاتھوں میں بھالے تھامے ننگے پاؤں جنگل میں یوں چلے جارہے تھے جیسے وہ کانٹوں پر نہیں بلکہ کسی قالین پر چل رہے ہوں ان کے سروں پر کسی جانور کی انتڑیوں کی بنی ہوئی رسیاں بندھی تھیں جن میں رنگ برنگے پر اڑسے ہوئے تھے گالوں کو سفید رنگ سے رنگا ہوا تھا کالے چہروں پر سفید سفید دانت اور تھوڑیاں قدرے لمبوتری تھیں۔

چلنے کے ساتھ ساتھ وہ آپس میں ایک غیر مانوس زبان میں باتیں بھی کرتے جارہے تھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان میں سے کسی کے ہنسنے کی آواز بھی سنائی دے

جاتی تھی۔ یہ سب "تاواشنگو" قبیلے کے آدم خور تھے جنہوں نے جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے لئے جنگل کے وسط میں ایک بہت بڑا اور گہرا کنواں کھودکر اسے جنگلی جھاڑیوں سے ڈھانپ رکھا تھا جس میں اکثر وبیشتر جنگلی جانور بے دھیانی میں گر جاتے جنہیں بعد میں یہ لوگ نکال کر اپنی خوراک کے طور پر استعمال کرتے اس کے لئے وہ دوسرے تیسرے روز اپنی اپنی باری کے مطابق چکر لگاتے اور ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ انہیں مایوس لوٹنا پڑتا ورنہ زیادہ تر وہ شکار لے کر ہی واپس قبیلے میں لوٹتے۔

آج یہ چھ افراد اپنی باری کے مطابق خوراک کی تلاش میں جنگل کی جانب بڑھ رہے تھے اور انہیں اس بات کا پکا یقین تھا کہ اس بار بھی وہ ناکام نہیں لوٹیں گے۔

گڑھے میں گرتے ہی ہم سب ریت کی خالی ہوتی ہوئی بوریوں کی مانند ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر ہوتے چلے گئے اندر کی زمین نرم ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی گہری چوٹ نہیں آئی یوں لگ رہا تھا جیسے گڑھے میں بارش کا پانی جمع ہونے کی وجہ سے زمین گیلی ہورہی تھی۔ گڑھے کی گہرائی کم وبیش بارہ فٹ کے قریب تھی اور اس کی چوڑائی تقریباً چودہ فٹ کے نزدیک ہوگی۔ انہوں نے کچھ دیر بیٹھ کر اپنی سانسوں کو بحال کیا پھر گڑھے سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنے لگے زمین پر جابجا چھوٹی بڑی لکڑیاں بھی بکھری پڑی تھیں جو جانوروں کے گرنے کے ساتھ ہی شاید نیچے گری ہوں گی۔ تیمور علی ایک ڈیڑھ فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی لکڑی اٹھا کر اس کی نوک سے گڑھے کی دیوار میں ایک سوراخ بنانے لگا تقریباً چار انچ گہرا اور چوڑا سوراخ آسانی سے بن گیا دیواریں چونکہ نرم تھیں اس لئے انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑی۔ یہ دیکھ کر ایک مزدور زمین پر جھک کر بیٹھ گیا جسے دیکھ کر تیمور علی اس کی پیٹھ پر چڑھ کر مزید سوراخ نکالنے لگا وہ ایک ایک فٹ کے فاصلے سے سوراخ نکالتا جا رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں اس نے تین سوراخ نکال لئے اب مزدور اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور تیمور علی اس کے کندھوں پر کھڑا مزید سوراخ نکالنے لگا اور مسلسل آدھا گھنٹہ محنت کرنے کے بعد وہ مزید تین اور سوراخ نکال چکا تھا۔

چھ سوراخ نکالنے کے بعد وہ اچھل کر مزدور کے کندھوں سے نیچے کودا اور ہمیں باہر نکلنے کے لئے ہدایات دینے لگا۔ اس تمام کارروائی میں ہم اس کا پلان سمجھ چکے تھے اس لئے اسے ہمیں باہر نکلنے کے طریقے کے متعلق زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہ پڑی۔

ابھی ہم باہر نکلنے کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں گڑھے کے اوپر ایک شور سا سنائی دیا ایسے لگا جیسے بہت سے افراد کسی غیر مانوس زبان میں تیز تیز بول رہے ہوں اور پھر یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کچھ ہی دیر میں وہی آوازیں گڑھے کے اوپر آن کر رک گئیں اور کچھ بھیانک چہروں نے ہمیں گڑھے میں دیکھ لیا۔

ابھی ہم اپنے بچاؤ کے بارے میں کوئی منصوبہ بنا ہی رہے تھے کہ زمین پر درختوں کی چھال سے بنی رسی آن گری اور ساتھ ہی ہمیں ایک نا سمجھ میں آنے والی زبان میں کچھ کہا جانے لگا۔ اور ہمیں یہ سمجھنے میں قطعی دیر نہ لگی کہ وہ ہمیں اس رسی کے سہارے اوپر آنے کا کہہ رہے تھے ہم سب نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نظروں ہی نظروں میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے اس رسی کی مدد سے باہر نکلنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم سب گڑھے کے باہر تھے۔ باہر نکلتے ہی ہمیں وہاں چھ ننگ دھڑنگ وحشی دکھائی دیئے جن کے چہرے ہمیں دیکھتے ہی کھل اٹھے تھے وہ اپنے بھالوں کی انیوں سے ہمیں ایک طرف چلنے کا اشارہ کررہے تھے۔ ہم ان کے کہنے کے مطابق اس طرف چلنے لگے جس طرف وہ ہمیں لے جانا چاہ رہے تھے۔

جنگل میں اب شام کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے اور ان کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے جنگل سے نکل جانا چاہ رہے ہوں۔ جنگل کے اندر بنے ایک تنگ سے راستے پر چلتے ہوئے جیسے ہی ہم ایک موڑ مڑے ہمیں ایک درہ نظر آیا جس کے کنارے پر مزید دو وحشی ہاتھوں میں بھالے تھامے یوں کھڑے ہمیں آتا دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی انہونی چیز دیکھ لی ہو۔ ہم تیزی سے چلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچ

گئے ہمیں آتا دیکھ کر وہ خوشی سے ناچنے لگے۔

وحشی ہمیں لئے درّے کے اندر داخل ہوئے ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہم حیرت سے وہاں پھیلے ہوئے خیموں کو دیکھ رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی تہذیب یافتہ دُنیا میں آگئے ہوں سب خیمے ایک ترتیب سے بنے ہوئے تھے ان کی بناوٹ اور ان میں استعمال ہونے والا سامان سب کا سب ایک جیسا ہی تھا۔لیکن ایک بڑی سی جھونپڑی جس کا سائز سب سے بڑا تھا ایک بہت ہی اونچی جگہ پر بنی ہوئی تھی جس کے اوپر ایک لکڑی پر ہرن کی کھوپڑی ٹنگی ہوئی تھی یہ غالباً اس قبیلے کے سردار کی رہائش گاہ ہوگی۔یہ سوچتے ہوئے ہم چلتے ہوئے بستی میں داخل ہوگئے۔

جیسے ہی ہم بستی کے وسط میں پہنچے جھونپڑیوں سے بچے اور عورتیں نکل کر اپنے اپنے گھروں کے باہر جمع ہونے لگے۔وہ سب جن کے ساتھ ہم یہاں تک پہنچے تھے ہمیں لئے ایک طرف بنے ہوئے جھونپڑے میں داخل ہوگئے۔یہ ایک کافی کشادہ جھونپڑی تھی جس کے اندر کھپریل کے بستر بچھے ہوئے تھے ایک طرف ایک مٹکا اور دو آب خورے بھی رکھے تھے۔وہ وحشی ہمیں جھونپڑی میں چھوڑ کر واپس لوٹ گئے۔ہم کچھ دیر بیوقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر یہاں سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنے لگے۔ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

تمام وحشی وسط میں ایک بھیانک اور مکروہ شکل کی عورت کے آگے دو زانو بیٹھے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسکول ٹیچر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو کوئی سبق پڑھا رہے ہوں۔وہ بھیانک شکل عورت نجانے کونسی زبان میں اشلوک پڑھ رہی تھی جو ان سب کی سمجھ میں آنے سے قاصر تھی۔عورت نے اپنے دائیں ہاتھ میں کسی جانور کی ٹانگ کی ہڈی تھامی ہوئی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک خرگوش پکڑا ہوا تھا جو خوف سے تڑپ رہا تھا وہ اپنی بکواس کے دوران بار بار جنگلیوں کو اس خرگوش کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی جس کے جواب میں جنگلی اس خرگوش کو دیکھ کر چیختے۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے ایک جھٹکے سے اس خرگوش کا سر اس کے دھڑ سے علیحدہ کرکے دور پھینک دیا۔

یہ دیکھ کر تمام [illegible] سجدے کی حالت میں زمین پر گر گئے۔انہیں اس طرح دیکھ کر عورت نے ہاتھ میں جھولتا ہوا خرگوش کا دھڑ اپنے دانتوں سے نوچنا شروع کردیا اور کچھ ہی دیر میں خرگوش کے جسم کو اپنے پیٹ میں نگل گئی تھی۔

وحشیوں میں موجود ایک بوڑھا شخص جو اس کی یہ تمام کارروائی کو بغور دیکھ رہا تھا اس کے خرگوش کھاتے ہی اس نے کسی پرندے کے سر کی بنی ہوئی ایک وسل اپنے جُبے کی جیب سے نکالی اور فوراً اپنے منہ سے لگا کر زوردار پھونک ماردی۔اس سر میں سے ایک تیز گھنٹی نما آواز نکلی اور زمین پر پڑے ہوئے تمام وحشی یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اگر انہیں ایک لمحہ کی بھی دیر ہوجاتی تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔عورت نے بوڑھے شخص کو کوئی بات کہی تو سب اس کی آواز سن کر اس جھونپڑی کی جانب متوجہ ہوگئے جس میں اس وقت ہم سب قید تھے۔

شان نے اٹھ کر جھونپڑی کی دیواروں کا جائزہ لینا شروع کردیا وہ جنگلی گھاس پھوس سے تیار کی گئی تھیں لیکن کافی مضبوط لگ رہی تھی اس نے کوئی تیز دھار قسم کے آلے کے لئے جھونپڑی میں نظریں دوڑائیں لیکن اسے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس کا استعمال کرکے وہ دیوار میں کوئی سوراخ بنا سکیں۔تیمور علی اس کے ارادے کو بھانپتے ہوئے اس کے نزدیک آیا اور کہنے لگا۔"کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں خود اسی زاویے پر سوچ رہا ہوں لیکن میں رات ہونے کا انتظار کروں گا تاکہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم یہاں سے فرار ہوسکیں۔اس لئے ہمیں چاک و چوبند رہنے کے لئے ایک دو گھنٹوں تک آرام کرلینا چاہئے تاکہ بعد میں کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک جھونپڑی کا دروازہ کھلا ایک وحشی ہاتھ میں دو تین پرندوں کو لٹکائے اندر داخل ہوا پرندوں کے صرف پر صاف تھے یا بھونتے ہوئے جل گئے تھے مگر جسم ثابت ہی تھے یوں لگتا تھا جیسے انہیں زندہ ہی بھونا گیا ہو۔

یہ دیکھ کر ابکائیاں آنے لگیں۔وحشی نے اشارہ

کرتے ہوئے پرندے ایک طرف رکھے اور دوبارہ باہر نکل گیا۔ انہوں نے پرندوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور ستانے کے انداز میں زمین پر بچھے کھپریل کے بستر پر بیٹھ گئے۔

رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں ایک سکون کی سی کیفیت طاری ہوگئی انہوں نے اٹھ کر جھونپڑی سے باہر جھانکا تو باہر انہیں صرف ایک وحشی بھالا تھامے دروازے پر پہرہ دیتے نظر آیا اور وہ بھی نیند کی وجہ سے جھوم رہا تھا۔ قسمت ان پر مہربان تھی انہوں نے دو مزدوروں کو اس پر نظر رکھنے کا کہا اور خود تینوں جھونپڑی کے آخری حصے کی جانب بڑھ گئے وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ تھوڑی سی تلاش سے انہیں جھونپڑی میں ایک نوکیلی لکڑی مل گئی جس کی مدد سے انہوں نے دیوار میں سوراخ نکالنا شروع کردیا اور کچھ ہی دیر میں اتنا بڑا سوراخ بنانے میں کامیاب ہوگئے جس سے ایک شخص با آسانی گزر سکے۔ لکڑی ایک طرف رکھ کر وہ باری باری اس سوراخ سے باہر کی جانب نکلنے لگے۔

جھونپڑی کے باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں چلتے ہوئے ایک جانب چل پڑے اندھیرے میں چلتے ہوئے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے ان کا ایک غلط قدم انہیں موت کی وادی میں لے جاسکتا تھا۔ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد انہیں دور پہاڑیاں نظر آئی جو اندھیرے میں جنات کی طرح دکھائی دے رہی تھیں وہ اندازے سے لیکن ذرا تیز قدموں سے ان کی جانب بڑھنے لگے وہ جلد از جلد اس قبیلے اور وحشیوں کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ وحشیوں کو غالباً ابھی ان کے فرار کا پتہ نہیں چلا تھا ورنہ وہ ان کی تلاش میں نکل پڑتے ویسے بھی رات کا پچھلا پہر ہونے کی وجہ سے وہ ان کی طرف سے بے فکر تھے کہ رات کی تاریکی میں وہ وہاں سے بھاگنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے صرف ایک وحشی کو ہی ان کی چوکیداری کے لئے کافی سمجھا تھا۔

تقریباً گھنٹہ بھر چلنے کے بعد پہاڑیاں نزدیک آگئی تھیں یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پہاڑیاں میلوں فاصلے تک پھیلی ہوئی تھیں وہ اب دوڑنے کے انداز میں چل رہے تھے۔ نزدیک پہنچنے پر انہوں نے دیکھا کہ پہاڑیوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں آگ میں دہکا دیا ہو اور آس پاس پڑے چھوٹے بڑے پتھر بھی گہرے سیاہ رنگ کے تھے۔ نجانے یہ کونسی سرزمین تھی اس قسم کے پہاڑ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔ شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا پہاڑیوں کا سلسلہ یوں نظر آرہا تھا جیسے کسی نے سیاہ رنگ کی چادر تان رکھی ہو۔

زمین پتھریلی تھی لیکن انہیں بھاگنے میں کوئی دقت نہ ہورہی تھی وہ مسلسل آگے کی جانب بھاگتے چلے جارہے تھے۔ کافی دیر تک بھاگنے کے بعد وہ بہت دور نکل آئے تھے اور پھر اپنے سامنے نظر آنے والی ایک غار کے اندر داخل ہوگئے۔ غار کے اندر عجیب طرح کا تعفن پھیلا ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں چمگادڑوں کو مار کر محفوظ کرلیا گیا ہو سانس تک لینا دشوار ہو رہا تھا یہ دیکھ کر وہ پلٹ کر دوبارہ غار کے دہانے کے قریب ہوگئے اور یہاں انہیں کھلی ہوا کی وجہ سے سانس لینے میں آسانی محسوس ہورہی تھی۔

ساتھ ساتھ سب کو یہ بھی فکر ستا رہی تھی کہ وحشیوں کو جیسے ہی ان کے فرار کا پتہ چلا وہ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے اور اس بار اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گئے تو انہیں موت کے منہ سے کوئی نہیں بچا پائے گا اور یہ سوچ سوچ کر ان کے سانس خشک ہورہے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور اجالا پھیلنے تک انہیں اسی غار میں ہی پناہ لینی تھی۔ نیند کوسوں دور تھی انہیں صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگے سہمے سہمے انداز میں باتیں کررہے تھے آسمان پر آہستہ آہستہ سپیدہ نمودار ہونے لگا اور تھوڑی دیر بعد صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔

روشنی پھیلنے سے غار کے اندر کا منظر بھی واضح ہوگیا تھا۔ ایک تنگ سا راستہ اس کے اندر دور تک جاتا نظر آرہا تھا اندر اندھیرا ہونے کی وجہ سے آگے تک دیکھنا ناممکن تھا۔ یہ سوچ کر کہ غار کے دوسری طرف نکلنے کا کوئی راستہ شاید اندر موجود ہو انہوں نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ

کرلیا۔ وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے غار کے اندر کی جانب بڑھنے لگے تھوڑا سا اندر جاتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ جیسے وہ پانی میں چل رہے ہوں اور جیسے جیسے وہ اندر بڑھتے جارہے تھے ویسے ویسے پانی گہرا ہوتا جارہا تھا لیکن وہ برابر آگے بڑھتے رہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ کمر تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور چلتے جارہے تھے۔

غار شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی جارہی تھی انہوں نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ اب چاہے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے وہ واپس نہیں جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں انہیں آس پاس کا منظر صاف دکھائی دینے لگا شاید باہر سورج نکل آیا تھا۔ غار کی دیواریں سیلن زدہ تھیں جن پر جمی ہوئی سبز کائی کی تہہ میں جھانکتی چھپکلیاں اپنی چمکدار آنکھوں سے انہیں حیرت سے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے انہوں نے کسی انسان کو پہلی بار دیکھا ہو۔ سبز کائی کی وجہ سے ان کے جسم بھی سبزی مائل ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے رہے جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جارہے تھے ویسے ویسے غار کشادہ ہوتا جارہا تھا۔

ابھی وہ چند فرلانگ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ دور انہوں نے ایک دھماکے کی آواز سنی۔ ایسا لگا جیسے کوئی وزنی چیز پانی میں کودی ہو اور وہ آنکھیں پھاڑے اس طرف دیکھنے لگے جس طرف سے وہ آواز سنائی دی تھی لیکن بغور دیکھنے کے باوجود بھی وہ کچھ نہ دیکھ پائے۔

ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ پانی پر دوڑتی ہوئی وہ عجیب مخلوق ان کے سامنے تھی۔ مگرمچھ کی شکل کا ایک عجیب جانور جس کی چھ ٹانگیں اور جسم بکری کے قد کے برابر تھا تیزی سے دوڑتا ہوا ان کی طرف بڑھتا آرہا تھا اسے اس طرح اپنی جانب آتے دیکھ کر انہوں نے غار کے پچھلے حصے کی جانب دوڑ لگادی لیکن اس جانور کی رفتار ان سے کہیں زیادہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں وہ ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ اسے اپنے اتنا نزدیک دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر زمین پر گر گئے اور یہ نیچے گرنا ہی ان کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا اور وہ مخلوق تیزی سے بھاگتی ہوئی ان کے آگے سے نکل گئی اپنی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے وہ کافی دور جاکر دوبارہ پلٹی۔

لیکن اس عرصہ میں وہ سنبھل گئے تھے انہوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر اٹھالئے اور جیسے ہی وہ مخلوق ان کے نزدیک پہنچی انہوں نے تاک کر اپنے اپنے ہاتھوں میں تھامے پتھر اس پر دے مارے۔ پتھر کسی کمان سے نکلے ہوئے تیروں کی طرح اڑتے ہوئے اس کے جسم سے ٹکرائے اس اچانک افتاد سے بلا گھبرا کر ایک لمحے کے لئے رکی اور دوسرے لمحے چیختی ہوئی غار کے اندر بھاگتی چلی گئی اس کی درد سے کراہتی ہوئی آواز کی بازگشت بہت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ہم سب نے سکون کا سانس لیا اور اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

ساری رات ایک طرف تو اس عفریت کے دوبارہ آنے کا خوف اور دوسری جانب وحشیوں کے ڈھونڈ لئے جانے کا ڈر ستاتا رہا اور رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرکے اجالے کی جانب بڑھتی رہی۔ خوف و دہشت سے کسی کی بھی ایک پل کے لئے آنکھ نہ لگ سکی وحشیوں کو شاید ان کے فرار کا پتہ چل چکا ہوگا اور وہ بھوکے بھیڑیوں کے طرح ان کی تلاش میں نکل پڑے ہوں گے لیکن ان پہاڑیوں میں ابھی تک ان کے پہنچنے کے کوئی آثار تک نظر نہیں آئے تھے اس لئے کسی قدر مطمئن تھے لیکن وہ ساری عمر اب ان پہاڑیوں میں بھی چھپ کر نہیں بیٹھ سکتے تھے اس لئے دن کا اجالا پھیلتے ہی انہوں نے غار سے نکل کر دوسرے ٹھکانے کی جانب پیش قدمی کا سوچا۔

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ دن کی روشنی غار کے اندر تک آنے کی وجہ سے انہیں اس کے اندر دائیں جانب ایک سرنگ نظر آئی جس کا دہانہ تقریباً چار فٹ چوڑا ہوگا اس کے منہ کے آگے ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی نے بھاگتے ہوئے اسے ٹکر مار کر دہانے سے دور ہٹادیا ہے۔ اور وہ سمجھ گئے کہ رات والی عفریت شاید بھاگتے ہوئے اس پتھر سے ٹکرائی ہوگی اور اس کی زوردار ٹکر سے ہی یہ پتھر سرنگ کے منہ سے سرک گیا ہوگا۔

بہر حال انہوں نے اس پر مزید سوچنے میں وقت

ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس سرنگ کی جانب بڑھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس سرنگ کے ذریعے وہ اس غار سے کہیں اور محفوظ جگہ نکل سکیں گے اور یہی سوچ کر انہوں نے سرنگ کی جانب پیش قدمی کی تھی۔

غار کے سوراخ سے اندر کی جانب ایک ایک فرد جھک کر داخل ہو گیا اندر جاتے ہی انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہوادار کمرے میں آ گئے ہوں کہیں سے تازہ ہوا اس کے اندر آ رہی تھی۔ یہ اندر سے تقریباً بارہ فٹ چوڑی سرنگ تھی جس کے سامنے کے رخ ایک بڑا سا ہال دکھائی دے رہا تھا اس ہال میں سورج کی روشنی کے آنے سے یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں وولٹ کے سینکڑوں بلب ایک دم روشن کر دیئے گئے ہوں۔ اور اس ہال تک پہنچ کر گھٹن کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔

ہال کے دائیں ہاتھ ایک اور راستہ دکھائی دے رہا تھا جس میں جانے کے لئے تین سیڑھیاں پتھر رکھ کر بنائی گئی تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی ذی روح یہاں رہتا رہا ہو لیکن اس دور دراز جزیرے میں بھلا کون سر پھرا ہوگا جو یہاں رہائش اختیار کرنے کا سوچیں۔ انہوں نے کچھ فیصلہ کیا اور اس نظر آنے والے راستے میں داخل ہو گئے اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں چار پانچ تانبے کے بڑے بڑے صندوق رکھے تھے جن کے رنگ گردشِ لیل و نہار کے باعث سیاہ پڑ چکے تھے اور ان پر موٹے موٹے قفل پڑے ہوئے تھے۔ جن پر کائی جمی ہوئی تھی۔

صندوقوں پر یوں نقش و نگار کھدے ہوئے تھے جیسے بادشاہوں کے وقت میں ایسے صندوقوں پر ہوا کرتے تھے۔ "خدا کی پناہ! اگر میں بھول نہیں رہا تو کیا یہ وہی خزانہ ہے؟" افضال احمد نے حیرت سے چیختے ہوئے کہا۔

"تم کس خزانے کا ذکر کر رہے ہو؟" تیمور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ایک تاریخی ناول میں پڑھا تھا کہ ایک معزول بادشاہ نے جسے بغاوت کے ذریعے حکومت سے ہٹا دیا گیا تھا اس نے کسی نہ کسی طرح سے کچھ خزانہ ایک بحری جہاز کے کپتان کے ساتھ ساز باز کر کے اس کے جہاز میں رکھوا دیا تھا اور خود بھیس بدل کر اسی جہاز میں ایک ملازم کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا خزانہ دھات کی دس بارہ پیٹیوں میں چھپایا گیا تھا ایسا اس لئے کیا گیا تھا تاکہ خزانہ باحفاظت محفوظ جگہ پہنچ سکے۔

ایک روز بادشاہ نے اپنے خاص نائب کو نہ چاہتے ہوئے بھی خزانے کی حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ دونوں خزانے والے کیبن میں موجود تھے کہ سمندر میں طوفان آ گیا۔ جہاز تنکوں کی مانند موجوں پر ڈولنے لگا مسافر پریشانی اور گھبراہٹ میں اپنے اپنے بچاؤ کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر لگی ہوئی تھی کسی کو کسی کا خیال نہ تھا اور اسی افراتفری میں کہیں سے بحری قزاق آ دھمکے اور جہاز پر چڑھ کر لوٹ مار مچا دی اور جو ساز و سامان نظر آیا اسے لوٹ کر اپنے چھوٹے سے بحری جہاز میں بھرنے لگے۔

خزانہ جہاز کے نیچے بنے ہوئے ایک خفیہ تہہ خانے میں چھپا دیا گیا تھا اس لئے ان کی نظروں سے اوجھل رہا اور عام طور پر دیکھنے میں نظر نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر تک قزاق لوٹ مار کرتے رہے اور دوبارہ اپنے جہاز میں سوار ہو کر فرار ہو گئے۔

جہاز کے بچ جانے والے مسافروں میں راشد علی نام کا ایک جوڑا بھی تھا جو اپنی شادی کے بعد گھومنے پھرنے کے ارادے سے یورپ کی جانب روانہ ہوا تھا۔ جہاز پر موجود تقریباً ہر مسافر ان بحری قزاقوں کی لوٹ مار کا شکار بنا تھا۔

راشد علی قزاقوں سے چھپتا ہوا نیچے بنے ہوئے تہہ خانے تک پہنچ گیا تھا اور اسے اس بات کا بالکل احساس تک نہ ہو سکا کہ وہ اس وقت ایک بہت بڑے خزانے کے قریب کھڑا ہے۔

تہہ خانے میں ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی دکھائی دی جس پر ایک پر پھڑپھڑاتی فاختہ کی تصویر تھی اور اس پر کراس کا نشان بھی بنا ہوا تھا اسے اس تصویر کے یہاں لگانے کا مقصد سمجھ نہیں آیا اور وہ بے خیالی میں چلتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ کر ٹھہر گیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

ابھی وہ غور سے اس تصویر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک جہاز کو ایک جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا ہو۔ لیکن ایسا صرف چند لمحوں کے لئے ہوا اور پھر یکدم ایک گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ یہ دیکھ کر راشد علی نے اس تصویر کو ہلکے سے دبایا تو وہ ایک ڈھکن کی مانند اوپر اٹھ گئی اور اس کے اندر ایک اور کمرہ بنا ہوا تھا جس میں جھانکنے سے اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ اس کے اندر چھ سات جستی پیٹیاں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں تاکہ اس کمرے کے اندر جانے کا کوئی اور راستہ مل سکے جلد ہی اسے اپنی بائیں جانب اسی طرح کا ایک دروازہ نظر آ گیا۔ اس نے اسے بھی اندر کی طرف دھکیلا تو وہ بھی ایک ڈھکن کی مانند اوپر اٹھ گیا۔

دو فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا ایک راستہ اب اس کمرے کی طرف جانے کے لئے بن گیا تھا۔ وہ اس میں داخل ہوا تو سب پیٹیوں پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک پیٹی کا جائزہ لینا چاہا کہ اچانک جہاز ایک پینڈولم کی مانند ڈولنے لگا۔ اسے تجسس ہوا کہ پیٹیوں میں شاید کوئی خاص چیز بند ہے۔ انسانی فطرت دیکھیں کہ اسے اپنی جان بچانے کی بجائے پیٹی کھول کر دیکھنے کا شوق چرانے لگا۔ حالانکہ جس کسی کی بھی وہ پیٹیاں ہوں گی وہ بھی شاید اب تک اپنی جان بچانے کی فکر میں جہاز سے نیچے پھینکی جانے والی کشتی میں کود چکا ہوگا۔

راشد نے تھوڑی سی تلاش سے ایک لوہے کا موٹا ڈنڈا حاصل کر لیا اور اس کی تین چار ضربوں سے تالا ٹوٹ کر لٹک گیا۔ اس نے ڈنڈا ایک طرف پھینکا اور پیٹی کا ڈھکن اوپر اٹھا دیا۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ پیٹی لبالب سونے کی اشرفیوں، ہیرے، جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈھکن بند کیا اور دروازہ بند کر کے جلدی سے باہر نکل آیا اور سیدھا اپنے کیبن کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔

اس نے تمام بات بیوی کو بتائی اور وہیں رکنے کا کہہ کر خود جلدی سے کیبن سے باہر نکل آیا اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا اور پھر جلد ہی اسے اپنے مطلب کے آدمی نظر آ گئے جن کی اسے تلاش تھی۔ اس نے سات آٹھ ملازموں کو دولت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا جس میں یہ طے پایا تھا کہ وہ ایک مضبوط کشتی کا بندوبست کریں گے اور اسے چپکے سے پانی میں اتار کر لوگوں کی نظروں سے بچا کر خزانے والی پیٹیاں جہاز سے دور لے جا کر کسی جزیرے پر چھپا دیں گے۔ اور کچھ ہی دیر میں ان ملازموں نے ربڑ کی ایک کافی بڑے سائز کی مضبوط کشتی رسوں کے ذریعے سمندر کے پانی میں اتار دی اور باری باری چھ پیٹیاں رسوں کی مدد سے کشتی میں اتارنے لگے۔ اس کام میں انہیں بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگا ہوگا۔

جہاز پر ایک افراتفری کی سی کیفیت طاری تھی ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی پڑی ہوئی تھی اس ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے خاموشی سے اپنا کام مکمل کر لیا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی۔ پھر وہ سب بھی باری باری کشتی میں اترتے گئے اور جب تمام افراد کشتی میں پہنچ گئے تو وہ جلدی جلدی چپوؤں کو چلاتے ہوئے کشتی کو جہاز سے دور لیجانے لگے۔

اسی اثناء میں انہوں نے دیکھا کہ جہاز اب سامنے سے سمندر کے پانی کی جانب جھکنے لگا تھا جس سے اس کے عرشے پر بھاگتے ہوئے افراد مکھیوں کی طرح سمندر کے کھارے پانی میں گرنے لگے۔ اور جہاز لحہ بہ لحہ سمندر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور وہ سب بے بسی کی تصویر بنے اسے دیکھ رہے تھے۔

جہاز کافی بڑا تھا اس لئے اپنے وزن کی مناسبت سے تیزی سے غرق ہو رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سمندر ان کی نظروں کے سامنے اسے یوں نگل گیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اب وہ تھے اور ان کے سامنے بے کراں پھیلا ہوا سمندر تھا۔ انہوں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور کشتی کو باری باری چپوؤں کی مدد سے آگے دھکیلنے لگے۔

ملازموں نے یہ عقلمندی ضرور کی تھی کہ اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان جو کہ بند ڈبوں میں تھا وہ رکھنا نہ بھولے تھے ایک گتے کے کارٹن میں بہت سے خوراک کے

ڈبے اور کافی مقدار میں منرل واٹر کی بوتلیں تھیں۔ وہ چونکہ بحری جہاز کے ملازم تھے اس لئے سمندر میں کس چیز کی کب ضرورت پڑ جائے وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ کشتی پانی کی لہروں سے کھیلتی ہوئی ایک جانب محوِ سفر تھی۔

راشد علی نے اپنی بیوی کو بھی کشتی چلانے کا طریقہ سمجھا دیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس وقت سمندر میں ہیں اور کسی بھی وقت نامساعد حالات کا سامنا ہوسکتا ہے اس لئے ہر کسی کو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

وہ کشتی چلانے والے ایک ملازم کے پاس آن کر بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ "کیا خیال ہے ہم اس وقت کہاں ہیں؟"۔

"میرے خیال میں ہم کوکس آئی لینڈ کی مغربی پٹی کے نزدیک سے گزر رہے ہیں" اس ملازم نے کمپاس پر نظریں جماتے ہوئے بڑے ذوق سے جواب دیا۔

"کوکس آئی لینڈ" یہ کونسی جگہ ہے؟ راشد نے دوبارہ پوچھا۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بحری جہاز کے کپتان گزرنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس جزیرے پر جابجا مقناطیس کے پہاڑ ہیں اور اگر بھولے بھٹکے سے کوئی جہاز اس جزیرے کے نزدیک سے گزرے تو وہ مقناطیسی پہاڑ اسے اس طاقت سے اپنی طرف کھینچتے ہیں کہ وہ اتنی زور سے ان پہاڑوں سے ٹکراتا ہے کہ پاش پاش ہوجاتا ہے اور لمحہ بھر میں بھاری بھرکم جہاز تنکوں میں تبدیل ہوکر سمندر کے پانی پر بکھر جاتا ہے اور اگر ہم بھی اب اس وقت کسی لوہے والی چیز میں سفر کررہے ہوتے تو اس وقت تک ہماری ٹوٹی پھوٹی لاشیں سمندر کی مچھلیاں کھارہی ہوتیں۔ فائبر کی کشتی ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ ہیں۔" ملازم نے چپو چلاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

اس کی یہ بات سن کر راشد علی حیرت اور دہشت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اس نے ملازم کی بات سن کر اس پر فوراً یقین کرلیا کیونکہ وہ ان راستوں پر آتا جاتا تھا اس لئے غالباً جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوگا۔

اب رات کا اندھیرا چھانے لگا اور آسمان پر بادل چھانے لگے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش ہونے لگے گی وہ اپنے بچاؤ کی ترکیب کرنے لگے کھلی کشتی میں سوار کھلے سمندر میں اور اوپر سے بارش ان کے لئے کافی مشکلات پیدا کرسکتی تھی وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگ رہے تھے کہ بارش نہ برسے۔ اور شاید وہ گھڑی قبولیت کی ہوگی کہ اچانک ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور پھر چند ہی منٹوں میں بادل یوں آسمان سے غائب ہوگئے جیسے وہ انہیں خوفزدہ کرنے کے لئے آسمان پر نمودار ہوئے تھے۔

انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا اور اطمینان سے بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

رات دھیمے دھیمے اپنا سفر ختم کررہی تھی اور دور افق پر ستارے اپنی چمک کھو رہے تھے۔ صبح کا سپیدہ آہستہ آہستہ اپنی بوجھل آنکھیں کھول رہا تھا۔ کشتی کو باری باری چلاتے انہیں کوئی تھکن محسوس نہ ہورہی تھی اور خوراک کا بھی انہیں بہت فائدہ ہوا تھا جس کے کھانے سے انہیں اپنے جسم توانا لگ رہے تھے اور وہ پوری طرح چاق وچوبند تھے۔

انہیں اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ ان کے ہاتھ ایک بہت بڑا خزانہ لگ گیا تھا جو ان سب کی قسمت بدل سکتا تھا اگر کسی طرح زندہ سلامت وہ سب اپنے اپنے وطن لوٹ گئے تو ان کی ساری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی۔ اس بات کو سوچتے ہوئے وہ اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ آپس میں طے کرکے انہوں نے خوراک کو احتیاط سے استعمال کرنا شروع کردیا تھا کیونکہ انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ اگر ان کے پاس خوراک ختم ہوگئی تو انہیں بے بسی کی موت مرنے سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ صبح کا سپیدہ نمودار ہوتے ہی انہیں دور بہت دور ایک سیاہ لکیر نظر آئی اسے دیکھتے ہی ان سب کے منہ سے خوشی سے چیخیں نکل گئیں وہ سمجھ گئے کہ دور نظر آنے والی سیاہ لکیر کسی جزیرے کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہے۔ انہوں نے تیزی سے کشتی کو اس جزیرے کی جانب چلانا شروع کردیا جیسے جیسے وہ اس سیاہ لکیر کے نزدیک ہوتے جارہے تھے ویسے ویسے وہ سیاہ لکیر چوڑی ہوتی جارہی تھی اور بہت

جلد انہیں اس پر لگے ہوئے درخت نظر آنے لگے۔

جزیرے پر سیاہ چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ہزاروں سال کی گردشِ لیل و نہار کے باعث ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا جنہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ قریب جانے پر انہیں چٹانوں کے عقب میں عجیب و غریب قسم کے درخت نظر آئے جو انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔

وہ جلدی جلدی کشتی کو چلاتے اس جزیرے کے ساحل کی جانب بڑھتے گئے کچھ ہی دیر میں کشتی نے جزیرے کے ساحل کی زمین کو چھوا اور کنارے سے ٹکرا کر رک گئی۔ کشتی کو ایک رسی کی مدد سے ایک بڑے سے پتھر سے مضبوطی سے باندھ کر ملازموں کی مدد سے خزانے کی پیٹیوں کو ساحل پر اتارا گیا۔ خوراک کے بچے ہوئے ڈبوں کو بھی ایک طرف رکھ دیا گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ڈبوں سے خوراک نکالی اور پیٹ بھر کر کھایا اور پانی پی کر کچھ دیر آرام کیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور جزیرے کی ریت پر دھوپ میں لیٹنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

کچھ دیر تک آرام کرنے کے بعد اب وہ آئندہ پیش آنے والے حالات کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ اس پہلو پر بھی سوچ رہے تھے کہ اتنے بڑے خزانے کو اپنی دنیا میں کس طرح لے جاسکیں گے۔ یہ سوچ کر سب سے پہلے انہوں نے اس خزانے کو کسی محفوظ جگہ چھپانے کا فیصلہ کیا اور پھر سب پھیل کر چٹانوں میں نظر آنے والے غاروں کی طرف بڑھ گئے۔ غار اندر سے خالی تھے اور ان میں کسی قدر سیلن سی ہو رہی تھی غالباً ایسا سمندری طوفانوں کے آنے سے سمندر کا پانی چٹانوں کو روندتا ہوا ان غاروں تک پہنچتا ہوگا جن کی وجہ سے یہ غار سیلن زدہ ہوگئی تھیں اور ان کی دیواروں پر سبز کائی جم گئی تھی لیکن اس کے برعکس غار اندر سے کافی کشادہ اور ہوادار تھے کیونکہ وہاں کسی قسم کی گھٹن کا احساس تک نہ ہوتا تھا انہیں یہاں آ کر کافی سکون محسوس ہوا۔ انہوں نے ایک غار منتخب کیا اور اپنا سامان لا کر اس میں ایک صاف جگہ پر رکھ دیا۔ غار کے باہر چمکیلی دھوپ اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی۔

کچھ دیر تک ستانے کے بعد راشد علی غار سے نکلا اور باہر کا جائزہ لے کر دوبارہ اندر داخل ہوا اور اپنے ساتھ تین ملازموں کو لے کر دوبارہ باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ انہیں چوکس رہنے کا کہہ گیا تھا۔ بیوی کو اس نے ساتھ نہیں لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اسے کہہ گیا تھا کہ ان کی واپسی تک دوسرے ملازموں کی مدد سے آگ جلا کر ڈبوں کا کھانا گرم کر کے رکھے کیونکہ ٹھنڈا کھانا کھا کھا کر وہ تنگ آ گئے تھے۔ اسی لئے اس نے اسے اپنے ساتھ لیجانے سے گریز کیا تھا۔

جزیرے پر نظر آنے والے درختوں کے نزدیک پہنچ کر انہیں اس پر لگے ہوئے عجیب و غریب پھل نظر آئے جن کی شکل امرود کی طرح اور رنگ سبز تھا جن میں ہلکی سی پیلے رنگ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ "ایلوا" کے درخت تھے جو ایک جنگلی پھل ہے جس کا ذائقہ کسیلا لیکن مزیدار تھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے ایک پھل توڑ کر منہ میں ڈالا تو اس کا ذائقہ اتنا برا نہ تھا جتنا وہ سوچ رہے تھے یہ دیکھ کر انہوں نے بہت سے پھل توڑ کر اپنی اپنی جیبوں میں بھر لئے اور واپس غار کی طرف لوٹ گئے۔

پہلے تو انہوں نے سوچا تھا کہ جزیرے پر گھوم پھر کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ کوئی جنگلی خرگوش وغیرہ نظر آ گیا تو اسے شکار کر کے تازہ گوشت حاصل کرسکیں گے تاکہ بند ڈبوں کا کھانا کھا کر منہ کا ذائقہ تبدیل ہو گیا تھا لیکن اب ان پھلوں کو چکھنے کے بعد انہوں نے سوچا کہ اس میں اپنے دیگر ساتھیوں کو شامل کرنا چاہئے یہ سوچ کر انہوں نے جزیرے پر گھومنے کا پروگرام ملتوی کر کے واپس غار میں جانے کی ٹھانی تھی۔

خزانہ انہوں نے غار میں بنے ہوئے ایک کمرہ نما جگہ میں چھپا دیا تھا کہ اگر وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اس خزانے کو اپنے ساتھ لے جائیں گے ورنہ اگر کبھی کوئی بھولے بسرے اس جزیرے پر آ ٹپکا تو شاید قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو جائے اور وہ یہ خزانہ حاصل کرلے۔ جزیرہ اتنا لمبا چوڑا نظر نہ آ رہا تھا لیکن اس پر درختوں کی بہتات اور ہریالی بہت تھی۔ کسی قسم کا موذی جانور بھی ابھی تک نظر نہ آیا تھا یا شاید وہ پورا جزیرہ نہ دیکھ

پائے تھے اور نہ ہی تمام غاروں میں جھانک سکے تھے۔

جزیرے پر رہتے ہوئے انہیں دس بارہ روز ہو گئے تھے اس دوران دو مرتبہ سمندری طوفان بھی آئے تھے لیکن غاروں کی وجہ سے انہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس دوران وہ پہروں ایک اونچی چٹان پر بیٹھ کر دور سمندر میں دیکھا کرتے تھے کہ شاید بھولے بھٹکے سے کوئی بحری جہاز اس طرف آ نکلے تو وہ اسے اپنی مدد کے لئے بلا سکیں اور ساتھ ہی خزانہ بھی اپنے ساتھ لے جاسکیں۔ مگر ہر روز گھنٹوں بیٹھے رہنے کے باوجود انہیں اب تک کوئی جہاز نظر نہیں آیا تھا۔

دوسری صبح کا سورج ان کے لئے خوشی کی نوید لے کر آیا کیونکہ جیسے ہی راشد علی غار سے نکلا تو دور سمندر میں اسے ایک جہاز نظر آیا جس کی چمنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو وہ دور سے ہی دیکھ رہا تھا اس نے جلدی سے ایک بلند چٹان پر چڑھ کر اپنی قمیض اتاری اور زور زور سے اسے فضا میں ہلانے لگا اور شاید جہاز کے عرشہ پر کوئی دوربین سے جزیرے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ جہاز نے اپنا رخ جزیرے کی طرف موڑ لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ عین وقت پر غار سے نکلا اگر اسے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو اس جزیرے پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے وہ سب اپنی جان دے دیتے اسے اس غیبی مدد پر حیرت ہو رہی تھی۔

جہاز آہستہ آہستہ جزیرے کے ساحل کی جانب بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اسے عرشے پر ایک دو افراد کھڑے صاف نظر آرہے تھے جو ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ اس نے زوردار آواز سے اپنے دیگر ساتھیوں کو پکارا اور جزیرے پر سناٹا ہونے کی وجہ سے اس کی آواز اس کے ساتھیوں کے کانوں تک با آسانی پہنچ گئی اور وہ سب لپک کر غار سے باہر نکل آئے اور یہ دیکھ کر ان کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں کہ ایک درمیانے سائز کا بحری جہاز ان کے سامنے تھا۔

راشد علی پہلے ہی ساحل پر کھڑا جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاز کنارے سے ذرا دور ہی رک گیا تھا اور ایک رسی کی سیڑھی اس کے اندر سے باہر لٹکا دی گئی۔ جہاز سے دو افراد اتر کر ان کی جانب بڑھنے لگے اور یہ دیکھ کر ان کی گم ہو گئی کہ وہ شکل سے بحری قزاق دکھائی دے رہے تھے اور ان کے چہروں سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنی دائیں آنکھ پر کالی پٹی باندھ رکھی تھی۔ نزدیک آکر وہ کچھ پوچھنے لگے جواب میں انہوں نے انہیں تفصیل سے تمام حالات بتائے اور ان سب باتوں میں جان بوجھ کر خزانے والی بات سرے سے گول کر گئے یہ بات انہیں بتا کر اتنے بڑے خزانے سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ زندہ بچ گئے تو کسی طرح دوبارہ واپس آکر خزانہ نکال کر اپنی دنیا میں لے جائیں گے۔

لیکن ان بحری قزاقوں کو بتانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بحری قزاقوں نے ان کی رام کہانی سننے کے بعد ان سب کی بھرپور تلاشی لی اور ان کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر جا کر ان کا سامان بھی قبضے میں کر لیا۔ سارا کچھ جاتا دیکھ کر انہوں نے ان کی منت سماجت کر کے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کہا۔ انہیں بے ضرر سمجھتے ہوئے اور ان کے اس طرح منت سماجت کرنے پر شاید انہیں ترس آگیا تھا اور وہ انہیں اپنے ساتھ جہاز پر لے جانے پر رضامند ہو گئے۔

جہاز اپنی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ جہاز سے اترتے وقت قزاقوں نے انہیں کچھ رقم دے دی تھی تاکہ وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاسکیں۔ انہوں نے ان کی اس مہربانی پر شکریہ ادا کیا اور اپنی اپنی منزل کی طرف بڑھ گئے۔

راشد علی اپنے آبائی ملک مصر پہنچ گیا جہاں کچھ عرصہ زندگی کی بہاریں دیکھ کر وہ دونوں میاں بیوی ایک متعدی بیماری کے شکار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس دوران راشد علی نے وہ تمام واقعات تفصیل سے ایک ڈائری میں تحریر کر دیئے تھے اور ساتھ ہی جزیرے پر خزانے کی موجودگی کا بھی ذکر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آڑھی ترچھی لکیروں سے ایک نقشہ بھی بنا دیا تھا۔ قزاقوں سے بات چیت کے دوران اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس جزیرے کا نام "بلیک آئی لینڈ" یعنی "کالا جزیرہ" تھا۔ اس کی لکھی ہوئی ڈائری اس کے ایک دوست

کے ہاتھ لگی جوان دونوں میاں بیوی کی آخری رسومات کے لئے پہنچا تھا۔ اور بعد میں اس نے وہ ڈائری اپنے ایک ناول نگار دوست کو دے دی تھی کیونکہ وہ اس میں لکھے ہوئے تمام واقعات کو جھوٹا ہی سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے اس ڈائری میں بنے ہوئے نقشہ کو بھی غور سے دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ اور اس طرح یہ قصہ ایک داستاں کی صورت میں بدل گیا اور خزانہ حاصل کرنے کی کسی نے کوشش تک نہ کی۔

مگر آج اس خزانے کو یہاں دیکھ کر مجھے ناول میں لکھی ہوئی تحریر یاد آگئی۔'' افضال احمد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے ان کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو منہ پھاڑے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ سب اس کی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ یہ تک بھول بیٹھے تھے کہ وہ اس وقت کس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ باتوں کے دوران انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور یہ بھی خیریت رہی کہ ابھی تک شاید وحشیوں کو ان پہاڑیوں تک پہنچنے کا خیال تک نہ آیا تھا ورنہ اب تک وہ ان تک پہنچ کر انہیں پکڑ چکے ہوتے۔

غار میں تاریکی پھیلنے لگی تھی اور انہیں بھوک بھی ستار رہی تھی۔ تیمور اور شان نے باہر جھانکا تو دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر بھی کوئی جانور یا پرند نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے غار سے باہر نکل کر کھانے کے لئے کوئی جھاڑی دار جنگلی پھل وغیرہ یا کوئی جنگلی خرگوش کی تلاش شروع کردی۔ لیکن انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ رات کا اندھیرا پھیلنے سے ایسا ناممکن تھا۔

وہ ابھی واپسی کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک جانب چند قدم دور انہیں تین چار جھاڑیاں نظر آئیں جن پر کچھ لگا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ ان پر آلو بخارے کی شکل کے پھل لگے ہوئے تھے جن کا رنگ گہرا زرد تھا اور ان پر سیاہ دھاریاں بنی ہوئی تھیں نجانے کس قسم کے پھل تھے۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کیونکہ وہ عجیب وغریب پھل کھانے کے لئے ان کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اگر وہ زہریلے پھل ہوئے تو؟ یہ سوچ کر وہ لرز کر رہ گئے۔ لیکن بھوک بھی ستا رہی تھی انہوں نے ایک دوسرے کی طرف [illegible] ایک [illegible] کرتے ہوئے تیمور نے ایک پھل توڑا اور اپنے دانتوں سے اسے تھوڑا سا کاٹا پھل کا چھلکا موٹا اور رسیلا تھا اسے اپنے منہ میں کھٹاس کا احساس ہوا تھوڑی دیر تک تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی لیموں کھا لیا ہو لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چند لمحوں کے بعد اس کے منہ کا ذائقہ یوں بدل گیا جیسے اس نے شہد منہ میں انڈیل لیا ہو۔ یہ بات اس نے شان کو بتائی وہ بھی حیرت اور خوشی سے اس پھل کو دیکھنے لگا۔ میرے تسلی دینے پر اس نے جلدی جلدی بہت سے پھل توڑ کر اپنی جیبوں میں بھر لئے۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں اپنی جیبیں پھلوں سے بھر لیں اور واپس غار کی جانب پیش قدمی کی۔

غار میں آکر ہم نے وہ پھل اپنے دیگر ساتھیوں میں بانٹ دیئے۔ انہوں نے بھی مزے مزے لے لے کر وہ پھل کھائے۔ ہم سب قدرت کے اس عجیب وغریب پھل اور اس کے ذائقے پر عش عش کر رہے تھے۔ رات ہم نے اسی غار میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور حفاظت کے لئے دو افراد کو مقرر کرتے ہوئے لمبی تان کر سو گئے۔

صبح تک ہم گھوڑے بیچ کر سوئے رہے اور پھر اچانک غار میں پانی گرنے کے شور سے یکدم ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دور کہیں آبشار کا پانی غار کے اندر گر رہا ہو۔ ہم حیران تھے کہ اگر یہ آبشار ہی ہے تو اس کی آواز رات کو ہمیں کیوں سنائی نہ دی تھی۔ ہم نے اس طرف اپنی نظریں گھمائیں جہاں سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی تو دور ہمیں ایک سفید نشان جس کا سائز تقریباً ایک فٹ بال جتنا معلوم ہو رہا تھا دکھائی دیا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ وہ اس سرنگ کا دہانہ ہوگا جو دوری کی وجہ سے ہمیں چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم نے سکون کا سانس لیا اور مطمئن ہو گئے پھر ہم نے رات کے بچے ہوئے پھلوں کو اپنے معدے میں اتارا اور جلدی سے اس دہانے کی جانب پیش قدمی کی۔

دن کی روشنی پھیلنے کے باوجود غار میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور جابجا پتھر بھی ہمارے پاؤں سے

تکرار ہے تھے ہم پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے اور یہ احتیاط ہی ہمارے کام آ گئی کہ اچانک ایک موڑ مڑتے ہی ہمیں یکدم رکنا پڑا ہمارے سامنے ایک بہت بڑی کھائی تھی جس کا پاٹ کم و بیش بیس فٹ کے قریب ضرور ہوگا۔ اگر ہم احتیاط سے کام نہ لیتے تو اس وقت ہمارے جسم گوشت کے ٹکڑوں میں تقسیم ہوئے ہزاروں فٹ گہری کھائی میں پڑے ہوتے۔ ہم نے کھائی کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ شاید کہیں سے کوئی راستہ دہانے کی جانب جانے کے لئے مل جائے مگر مدھم روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود ہمیں کہیں سے بھی کوئی رخنہ یا پٹی دکھائی نہ دی جس کے سہارے ہم اس کھائی کو پار کر کے دہانے کی جانب بڑھ سکتے۔

ابھی ہم یہی سوچ رہے تھے کہ اچانک غار کے اس دہانے کی طرف سے بہت سی ملی جلی آوازوں کا شور سنائی دیا جہاں سے ہم اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر خوف و دہشت سے ہماری سانسیں رک گئیں ہم فوراً سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ اسی قبیلے کے وحشی ہیں جو ہمیں ڈھونڈتے ہوئے اس غار تک آ پہنچے ہیں۔ ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور پھر ہمیں سامنے دائیں رخ ایک تنگ راستہ اندر جاتا دکھائی دیا ہماری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں اس لئے کچھ سوچے بنا ہم نے اس تنگ راستے کی جانب دوڑ لگادی۔

یہ تقریباً بیس بائیس ننگ دھڑنگ وحشی تھے جنہوں نے درختوں کے پتوں سے اپنے جسموں کو ڈھانپ رکھا تھا اور چہروں پر سرخ اور پیلے رنگ سے دھاریاں بنائی ہوئی تھیں ان کے ہاتھوں میں زہر پھینکنے والی نلکیاں تھیں اور چہروں پر خباثت چھائی ہوئی تھی ان کی حرکات سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں کسی کی تلاش ہے اور اگر وہ اسے مل گیا تو وہ اسے کچا چبا جائیں گے۔ ان میں شامل ایک بوڑھا جس کے ہاتھ میں پرندوں کی کھوپڑیوں کی بنا ہوئی ایک مالا لٹک رہی تھی تیزی سے کچھ سونگھتا ان سے آگے آگے چل رہا تھا اور اس کا رخ سیدھا غار کی طرف ہی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے غار میں سے ان کی خوشبو آ رہی ہو اور پھر وہ دوسرے وحشیوں کو لئے غار کے اندر داخل ہو گیا۔

غار میں موجود چالوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے کوئی یہاں ٹھہرا ہو یہ دیکھ کر اس بوڑھے نے وحشیوں کو اپنی زبان میں کچھ کہا جسے سن کر ان میں سے تین وحشی غار کے اندر چلے گئے بقایا وحشی وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہ وحشی بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے اور انہیں کچھ کہا جسے سن کر وہ بھی تیزی سے دوڑتے ہوئے غار سے باہر نکل گئے۔

تنگ راستہ مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا لیکن ہم بنا مڑے سیدھے بھاگتے چلے جا رہے تھے تقریباً ایک میل تک دوڑتے رہنے کی وجہ سے ہمارے سانس دھونکنی کی مانند چل رہے تھے لیکن ہمیں جانوں کی فکر تھی اس لئے اپنے بچاؤ کے لئے بھاگتے رہنے میں ہی عافیت تھی اور ہم جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔

وحشی چونکہ اس علاقے کے باشندے تھے اس لئے ہمیں فکر تھی کہ کہیں وہ ہماری بو سونگھتے ہوئے ہمارے پیچھے نہ آ رہے ہوں۔ لیکن اتنی دیر بھاگتے رہنے کے باوجود ابھی تک ہمیں سرنگ میں بھاگتے ہوئے صرف اپنے قدموں کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ وحشیوں کی طرف سے تسلی ہوتے ہی ہم نے کچھ دیر آرام کرنے کا سوچا تا کہ دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنا سفر شروع کر سکیں۔

سرنگ میں اب سامنے سے تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے تھے یہ دیکھ کر ہم خوشی سے ناچنے لگے کہ شاید اب ہم باہر نکلنے کے قریب تھے اور اس سرنگ کا دہانہ کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ یہ دیکھ کر ہم نے آرام کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور دوبارہ بھاگنے لگے۔ جلد ہی ہمیں اپنے اندازے کی داد دینا پڑی ہمارے ایک موڑ مڑتے ہی بائیں جانب ایک دو فٹ چوڑا اور تین فٹ اونچا سوراخ تھا جس کے باہر سے تازہ ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ ہم تیزی سے بھاگتے ہوئے اس سوراخ کے نزدیک پہنچے اور ایک ایک کر کے اس سے باہر آ گئے۔

سرنگ سے باہر آتے ہی ہمارے سامنے سرسبز میدانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس میں جا بجا جنگلی پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

ایک ہی درخت پر کئی قسم کے پھل لگے ہوئے تھے جن میں سے کچھ کی شکل لمبوتری، کچھ چوکور اور کچھ گول تھے اور ان کا سائز بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا اور رنگ میں بھی مشابہت نہ تھی ہماری معلومات کے مطابق پیوندکاری تو ہم نے سنی تھی جس سے ایک درخت پر دو قسم کے پھل لے سکتے ہیں لیکن اس دور دراز علاقے میں اس طرح کے درختوں پر کس نے پیوندکاری کی ہوگی یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے ایک نزدیک کے درخت سے کچھ پھل توڑے اور انہیں چکھا اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان کا ذائقہ یوں لگا جیسے ہم نے تازہ روٹی کا نوالہ منہ میں ڈال لیا ہو۔ ہم قدرت کے اس کرشمہ پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ دُنیا میں کہیں ایسے درخت بھی پائے جاتے ہیں جن کے پھلوں کا ذائقہ روٹی کی طرح کا ہو۔ بحرحال حقیقت ہمارے سامنے تھی اور ہم اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے تھے۔

ہم نے جلدی جلدی بہت سے پھل توڑے اور انہیں اپنی جھولیوں اور جیبوں میں بھر لیا۔ ان پھلوں کی وجہ سے کم از کم ہماری بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا تھا ورنہ اس ویرانے میں ہمیں خوراک کہاں سے دستیاب ہوتی۔ خزانہ ہم نے وہیں غار میں ہی محفوظ کر دیا تھا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو دوبارہ واپس آکر اسے لے جائیں گے مگر اس وقت تو اپنی جان بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے اس خزانے کو کہاں گھسیٹتے پھرتے اس لئے ہماری جانیں اس خزانے سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔

میدانوں میں لگی ہری بھری گھاس بہت بھلی لگ رہی تھی اور دور تک ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے سبز رنگ کا قالین زمین پر بچھا دیا ہو۔ ہم جلد از جلد یہاں سے کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہتے تھے کیونکہ جس طرح ہم اس سرنگ کے راستے یہاں نکل آئے تھے اسی طرح وہ وحشی بھی کسی وقت ہمارے سروں پر پہنچ سکتے تھے۔ ہم کچھ دیر تک کھڑے چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتے رہے لیکن دور دور تک دیکھنے کے باوجود ہمیں کہیں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں ہم خود کو چھپا سکیں۔

[illegible] اور ہم ابھی تک اسی شش و پنج میں تھے کہ کہاں جائیں۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے دیگر ساتھیوں کی تھی جو اپنے بیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ کر ہمارے ساتھ آئے تھے اور تمام مشکلات کو جھیلنے میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پھر ایک فیصلہ کرتے ہوئے ہم ناک کی سیدھ میں ایک جانب بڑھ گئے ہم نے سوچا کہ دیکھتے ہیں یہ میدانوں کا سلسلہ کہاں تک چلتا ہے اگر نصیب میں زندگی لکھی ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں موت کے منہ میں نہ جانے دے گی۔

تین گھنٹوں تک پیدل چلتے رہنے سے ہماری حالت پتلی ہو رہی تھی پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے دل چاہتا تھا کہیں گر کر لمبی تان کر سو جائیں لیکن یہ سب کچھ صرف سوچنے کی حد تک ہی ٹھیک تھا کیونکہ اس وقت ہم بارود کے ڈھیر پر بیٹھے تھے وہ وحشی کسی بھی وقت ہمارے سروں پر پہنچ کر ہمارا ٹینٹوا دبا سکتے تھے اس لئے مسلسل چلنا ہماری مجبوری تھا آپس میں باہم صلاح و مشورہ سے ہم وقفے وقفے سے آرام بھی کر لیتے تھے تاکہ ہمارے جسم چست و توانا رہیں۔

مسلسل دو دن اور دو راتوں تک سفر کرنے سے ہمارے پاؤں میں چھالے بن گئے تھے جو چلنے میں ہمیں تکلیف دے رہے تھے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے ہمیں عجیب شکل کے پودے دکھائی دیئے جن کے زرد رنگ کے پتے تھے ہم نے کچھ سوچتے ہوئے وہ پتے توڑ کر اپنے زخموں پر باندھ لئے ظاہر ہے ان ویرانوں میں ہمیں مرہم کہاں سے ملتی اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جہاں جہاں زخموں پر پتے باندھے تھے وہ زخم اس طرح بھرنے لگے جیسے کبھی ہوئے ہی نہ ہوں۔ ہم نے بہت سے پتے توڑ کر اپنے ساتھ لے لئے کہ شاید ان کی پھر بھی ضرورت پڑ جائے ان عجیب پتوں نے ہمارے زخموں کو پل بھر میں ٹھیک کر دیا تھا اور ہمیں اپنے زخموں میں ایک ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا ہم خدا کی طرف سے اس بروقت مدد کا شکر ادا کر رہے تھے۔

چلتے چلتے ہم ایک ایسے علاقے سے گزرے

جہاں ہمیں ایک اور عجوبہ نظر آیا ہم حیرانی سے ان بلی نما جانوروں کو دیکھ رہے تھے جو اپنے سروں پر ایک نوکدار سینگ لئے اچانک نمودار ہوئے تھے ان کی تعداد کم از چالیس پچاس کے قریب تھی ان کا رنگ خاکستری اور نیلا تھا اور ان کی آنکھیں گول کی بجائے بیضوی تھیں اور ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں سرمہ ڈال دیا ہو۔ بڑی عجیب نسل کے جانور تھے جو آس پاس موجود چھوٹے چھوٹے پودوں پر لگے امرود کی شکل کے پھل یوں رغبت سے کھا رہے تھے جیسے وہ ان کا من پسند کھاجا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے منٹوں میں بہت سے پودے اجاڑ دیئے اور پھر جس تیزی کے ساتھ ان کے سامنے آئے اسی تیزی کے ساتھ واپس دوڑ گئے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ کر نیند سے جاگے ہوں۔

”خدا کی پناہ! میں نے تو اس قسم کے جانوروں کے متعلق کہیں نہیں پڑھا شاید یہ نسل اس علاقے میں ہی پائی جاتی ہو چونکہ یہ علاقے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں اس لئے کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔ شان نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! میں بھی یہی کہنے والا تھا میں خود اس قسم کے جانور پہلی بار دیکھ رہا ہوں“۔

تھوڑی دیر تک ستانے کے بعد ہم دوبارہ چلنے لگے اس دوران ہم وقفے وقفے سے اپنے پیٹ کی آگ بھی بجھاتے رہے تھے اس لئے زخموں کے بھر جانے اور پیٹ بھر جانے کی وجہ سے ہماری رفتار تیز تھی۔ ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی بجائے وہ چھوٹی چھوٹی مٹیالے رنگ کی ٹیلیاں تھیں جن میں جابجا سانپوں یا نیولوں کے بل بنے ہوئے تھے ہم ان سے دور دور ہی رہے اس سرزمین پر کب اور کیا واقعہ ہو جائے ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سورج مغرب میں غروب ہوتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے تانبے کی کوئی چمک دار پلیٹ کسی نے آسمان پر جڑ دی ہو۔ چل چل کر تھکن سے ہمارا برا حال ہو گیا تھا ابھی تک ہم ایک دوسرے کی ہمت بندھاتے چلتے رہے تھے لیکن اب ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ رات کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی مناسب ٹھکانہ ڈھونڈنا ہوگا ورنہ ہم ان ویرانوں میں ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کو گلے لگا لیں گے۔

ابھی ہم اسی نہج پر سوچ رہے تھے کہ تیمور علی کی نظر نیچے زمین پر پڑی تو اس کے ہوش اڑ گئے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جی ہاں! زمین کا رنگ شام کے سائے پھیلتے ہی سیاہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام زمین سیاہ رنگ میں بدل گئی اس پر اُگے ہوئے جھاڑ جھنکار بھی اپنی رنگت سبز سے سیاہ میں بدل چکے تھے۔ زمین کا رنگ سیاہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا مزید بڑھ گیا تھا اور ہمیں چلنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ ابھی ہم آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ہماری نظروں نے ایک اور عجیب منظر دیکھا ہمیں یوں لگا جیسے زمین پر اُگے ہوئے پودے چلنے لگے ہوں اور زمین پر پڑے پتھر ادھر اُدھر لڑھکنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زلزلہ آنے والا ہو لیکن ایسا صرف چند لمحوں تک ہی ہوا اور پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔

موت کی سی خاموشی ہمیں اپنے دلوں کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی اور پھر ہمیں اس پراسرار خاموشی سے وحشت ہونے لگی ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ ہم دھاڑیں مار مار کر روئیں اور کوئی ہمیں چپ کروانے والا بھی نہ ہو۔ مگر ایسا ہم صرف سوچ سکتے تھے کیونکہ عملی طور پر ہم ایسا کرنے سے معذور تھے کیونکہ باوجود ہزار کوشش کے ہم منہ تک نہ کھول پائے ہمیں ایسا لگا جیسے کسی پراسرار طاقت نے ہم سب کے منہ پر کوئی ٹیپ لگا دی ہو۔

ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ انہوں نے دور سے بھیڑیوں کے چیخنے کی آوازیں سنیں بہت سے بھیڑیے مل کر چیخ رہے تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہوا نے انہیں ان کی موجودگی کا پتہ دے دیا ہو۔ ہم خوف سے تھوک نگلتے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب کچھ ہی لمحوں میں ہم موت کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔ خوفناک ویرانہ اور خونخوار بھیڑیئے اور وہ سب خالی ہاتھ۔ ہمارے انجام کا اندازہ لگانا مشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور کچھ ہی دیر میں خونخوار بھیڑیوں کا ایک غول دوڑتا ہوا ہمارے سامنے نمودار ہوا اور جیسے ہی انہوں نے ان پر حملہ کرنا چاہا یکدم نیلے رنگ کا

دھواں لہراتا ہوا ہمارے سامنے آگیا۔

دھویں میں ایک عورت کی شبیہ واضح نظر آرہی تھی جسے دیکھتے ہی بھیڑیے دم دبا کر بھاگ گئے۔

ہم سب حیرت سے اس دھویں کو اور اس میں نظر آنی والی مخلوق کو دیکھ رہے تھے جس نے بروقت پہنچ کر ہمیں بھیڑیوں کی خوراک بننے سے بچالیا تھا۔ "چنگل کھوری اس سرزمین پر خوش آمدید کہتی ہے یہ حیرتوں کی سرزمین ہے یہاں پر حیران ہونے والا ایک دردناک عذاب کا شکار ہوتا ہے یہ "منشکوربن" کا علاقہ ہے۔ میں بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتی ہوں تمہیں مصیبت میں دیکھا تو مدد کے لئے آپہنچی" اس نے ان کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

لیکن افضال کی نظریں اس کے پیروں پر ٹکی ہوئی تھیں جس نے زندہ کچھوؤں کو جوتوں کی طرح اپنے پیروں میں پہن رکھا تھا اور جب وہ وقفے وقفے سے پاؤں پر زور دیتی تو پل بھر کے لئے کچھوے اپنی گردنیں باہر نکالتے اور دوبارہ اندر کرلیتے۔ یہ سب دیکھ کر افضال احمد نے شان کو اور تیمور کو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ منظر دکھایا۔ یہ دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ ہمیں دھوکا دیا جارہا ہے اور قصہ کچھ اور ہے ہم نے جلدی سے اپنے اپنے گلے میں پہنے ہوئے تعویذ کا رخ اس مخلوق کی جانب کیا تو وہ چیختی چلاتی یکدم غائب ہوگئی اور ہم نے سکون کا سانس لیا۔

رات کافی گہری ہوچلی تھی ہم نے گھوم پھر کر کوئی جائے پناہ تلاش کرنا چاہی تو دور ہمیں ایک عجیب شکل کا مکان بنا ہوا دکھائی دیا ایک نظر میں یوں لگتا تھا جیسے کوئی اونٹ بیٹھا ہوا ہو مکان کا رنگ گہرا سیاہ تھا اس لئے شاید ہمیں پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ اس عجیب وغریب مکان کا کوئی دروازہ ہی نہ تھا سامنے کے رخ داخلی دروازے پر دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے ستون بنے ہوئے تھے جن پر سفید رنگ سے دھاریاں بنائی گئی تھیں غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ دھاریاں نہیں بلکہ سفید رنگ کے سانپ تھے جو ستونوں پر لپٹے ہوئے تھے ایسا اس وقت محسوس ہوا جب انہیں وہ دھاریاں ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں تھیں۔

ہم یہی سوچ رہے تھے کہ کیا اس مکان میں جا کر رسک لیا جائے یا یہیں سے لوٹ جایا جائے اور کوئی اور ٹھکانہ تلاش کیا جائے۔ ابھی ہم اسی شش وپنج میں تھے کہ وہ سیاہ مکان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور اس کے اندر سے وہی عفریت "چنگل کھوری" برآمد ہوئی اس کے چہرے پر خباثت چھائی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں کا رنگ گہرا سرخ تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ خونخوار بلا ابھی ابھی تازہ خون پی کر آئی ہو اس کی باچھوں سے خون کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ اس کے ارادے خطرناک لگ رہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ انہیں دیکھ کر غصے سے تلملا رہی ہو۔

وحشی غار سے نکلتے ہی سیدھے جنگل میں جانے والے راستے پر بھاگتے چلے گئے وہ جلد از جلد انہیں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں بہت پہلے ہی تلاش کرلیتے لیکن انہیں ان کے فرار ہونے کا پتہ بہت دیر بعد چلا جب پہرے دار وحشی انہیں دیکھنے کے لئے جھونپڑی میں داخل ہوا۔ جھونپڑی میں انہیں نہ پاکر اس نے شور مچادیا اور پھر سارے قبیلے میں ان کے فرار کی خبر پھیل گئی اور بیس بائیس خونخوار وحشی ان کی تلاش میں نکل پڑے۔ وہ انہیں تلاش کرتے کرتے کالی پہاڑیوں تک جاپہنچے تھے لیکن انہیں وہاں نہ پاکر وہ واپس جنگل کی طرف بھاگ گئے اور انہیں غار کے اندر بنی ہوئی سرنگ کا خیال نہ آیا ورنہ اگر وہ اس کے ذریعے باآسانی ان تک پہنچ سکتے تھے۔

جنگل طویل ہونے کی وجہ سے انہیں بہت تیزی سے سفر کرنا پڑ رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اگر انہیں جنگل میں تلاش نہ کرسکے تو سیدھے ساحل پر جاکر چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور وہیں سے انہیں شکار کرکے اپنے قبیلے کے لئے خوراک کا بندوبست کریں گے۔

"چنگل کھوری" کو دیکھتے ہی ہمارے اوسان خطا ہوگئے ہم اس کو اس طرح اپنے سامنے یوں اچانک دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئے۔ پھر اچانک ایک خیال کے آتے ہی تیمور نے دوبارہ تعویذ کی جانب ہاتھ بڑھایا یہ دیکھتے ہی ایک ایک پتھر زوردار آواز سے اس کے دائیں ہاتھ پر پڑا وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب جھکا اور یہ جھکنا ہی اس کے لئے فائدہ مند

ثابت ہوا اور ایک گول کڑا جس کے چاروں طرف تیز دھار دندانے بنے ہوئے تھے اس کی کمر پر سے شائیں شائیں کی آواز نکالتا ہوا اس کے پیچھے نظر آنے والے درخت کے تنے میں پیوست ہوگیا۔

اس عفریت نے اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر وار کردیا تھا شان نے قریب پڑا پتھر اٹھایا اور تاک کر اس عفریت پر دے مارا پتھر اڑتا ہوا سیدھا اس کی پیشانی پر لگا اس نے ایک جھٹکا کھاتے ہوئے خود کو سنبھالا اور اپنا دایاں ہاتھ ان کی جانب کرکے ایک جھٹکا دیا اس کے ہاتھ سے جن کی انگلیاں سانپوں کی مانند لہرا رہی تھیں شعلے اگلتی ہوئی ان کی طرف بڑھیں۔

یہ دیکھ کر ہم سب نے خود کو ان سے بچایا اور بھاگتے ہوئے سامنے نظر آنے والے مکان کے کھلے حصے سے اندر داخل ہوگئے۔

جنگل میں پوری طرح تلاش کرلینے کے بعد تمام وحشی ساحل پر موجود درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر بیٹھ گئے وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کا شکار آخر کار یہیں سے ہی واپس جائے گا۔ ان میں موجود ایک بوڑھے وحشی نے فضا میں کچھ سونگھتے ہوئے انہیں ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانا چاہا جسے وہ تمام سن کر پریشان ہوگئے۔ بوڑھا جیسے جیسے تفصیل بتا رہا تھا ویسے ویسے وہاں موجود وحشی خوف و دہشت سے آنکھیں پھاڑے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ بوڑھے نے انہیں بتایا کہ "فرار ہونے والوں کی تلاش میں جانے والے افراد کے متعلق وہاں کے قبیلے کے سردار نے اسے خبردار کیا تھا کہ اگر وہ سب ناکام لوٹتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ ان کے بیوی بچوں کو بھی زندہ آگ میں جھونک دیا جائے گا تاکہ سورج دیوتا ان کی بھینٹ لے کر ان کے قبیلے پر آئندہ والی مصیبت ٹال سکے۔ اس لئے ان کی اور ان کے گھر کے دیگر افراد کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ جیسے تیسے کرکے فرار ہونے والے افراد کو تلاش کرکے واپس قبیلے میں لے جائیں۔"

...... بوڑھے نے لمبا سانس لیتے ہوئے بات ختم کی۔ بوڑھے کی اسی بات نے ہی ان سب وحشیوں کا خون خشک کردیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ان سب کی واپسی تک یہیں انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا جس میں داخل ہوتے ہی ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی تیز رفتار گھومتی ہوئی چکی پر بیٹھ گئے ہوں ہم سب نے سنبھلنے کے لئے ابھی قدم جمائے ہی تھے کہ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہم سب سروں کے بل الٹے پاتال میں گرتے چلے گئے ہمارے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں لیکن جیسے جیسے ہم نیچے گرتے جارہے تھے کمرے میں بے پناہ شور گونجنے لگا جس میں ہم سب کی چیخیں دب کر رہ گئیں۔

کافی دیر تک نیچے گرنے کے بعد چھپاک کی آواز کے ساتھ ہی ہم پانی میں جا گرے۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی برف کے کارخانے میں داخل ہوگئے ہوں اور سردی سے ہمارے دانت بجنے لگے۔ اور اسی کیفیت میں ہماری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم پر نیند کا غلبہ طاری ہوا اور ہم سب کسی مردہ سانپ کی طرح پانی کی سطح پر تیرنے لگے شاید ہماری زندگی کا چراغ بجھ گیا تھا۔

دن کا اجالا پھیلتے ہی ہمیں ہوش آگیا لیکن اب ہم پانی کی بجائے ایک سرسبز علاقے میں تھے ہمارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے لیکن اب ہمیں سردی محسوس نہ ہو رہی تھی ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور کچھ دیر تک نیند کی سی کیفیت میں ادھر ادھر دیکھتے رہے لیکن اپنے سامنے کے منظر پر نظر پڑتے ہی ہمارے ہوش ٹھکانے آگئے ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہاں دیکھ رہے تھے۔

ہمارے سامنے برگد کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے موٹے تنے کے ساتھ ایک دودھیا رنگ کا اور نیلا دھاری دار اژدھا لپٹا ہوا تھا وہ جس درخت کے ساتھ لپٹا ہوا تھا اس کے نیچے ایک پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی جس کی شکل گول تھال نما تھی اس کے درمیان ایک زرد رنگ کا پتھر کا پیالہ رکھا تھا جس کے کناروں میں دو دو کنڈے لگے ہوئے تھے ان کنڈوں کے ساتھ ایک سفید رنگ کی زنجیر بندھی ہوئی تھی جس کا ایک سرا درخت کے پیچھے کی جانب جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اژدھا گردن جھکائے پیالے میں دیکھ رہا تھا جس

میں نجانے کہاں سے دودھ بھر بھر کر آرہا تھا جسے وہ پینے میں مگن تھا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ ایک جھپاکا ہوا اور "چنگل کھوری" پھر آن ٹپکی۔ "اس سے پہلے کہ تم اس اژدھے کو ختم کرو جس میں میری جان ہے میں تم سب کو جلا کر بھسم کردوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ان کی طرف اپنی انگلیاں جھٹکیں۔ سبز رنگ کی لہریں تیزی سے ان کی جانب بڑھیں اور سیدھی تیمور علی کے سینے پر پڑیں اسے یوں لگا جیسے کسی نے لوہے کی گرم سلاخیں اس کے سینے میں دھنسا دی ہوں۔

وہ چیختا ہوا زمین پر گر گیا یہ دیکھ کر شان اور افضال نے بھاگ کر اسے تھامنا چاہا لیکن وہ کسی ریت کی خالی ہوتی ہوئی بوری کی مانند ان کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے انتہائی تکلیف ہو رہی ہو۔

شان نے جلدی سے اس کے سینے کو مسلنا شروع کردیا اور میں نے اس کے پاؤں کے تلیاں تلوے مسلنے لگا۔

وہ عفریت دور کھڑی قہقہے لگا رہی تھی اور ان کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی یہ دیکھ کر شان نے جلدی سے تیمور علی کے گلے سے تعویذ اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اللہ کا نام لے کر اس کا رخ اس بلا کی جانب کردیا۔ شاید قدرت کو ہماری بے بسی پر رحم آگیا تھا اس لئے جیسے ہی اس نے تعویذ کا رخ اس کی طرف کیا ایک سفید ہالہ سا چکراتا ہوا اس عفریت کی جانب بڑھا اور سیدھا اس عفریت کے گلے میں جا کر فٹ ہوگیا مگر یہ دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ اسی طرح ایک طرف کھڑی قہقہے لگا رہی تھی۔

اور پھر ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح شان کے دماغ میں آیا کہ اس کی جان تو سامنے موجود اژدھے میں پوشیدہ ہے یہ خیال فوراً آتے ہی اس نے تعویذ کا رخ دوبارہ اس اژدھے کی جانب کردیا اور اسی طرح ایک گول چکر تیزی سے گھومتا ہوا گیا اور اس بار اژدھے کے منہ پر جا کر فٹ ہوگیا۔

اژدھا جو دودھ پینے میں مصروف تھا اچانک افتاد سے گھبرا گیا اور اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور گول کڑے نے اس کی گردن میں فٹ ہوتے ہی تنگ ہونا شروع کردیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کا سائز ایک انچ تک ہوگیا اور اژدھے کی گردن پچک کر رہ گئی اور دوسری طرف "چنگل کھوری" یہ دیکھ کر چیختی چلاتی اس کی طرف بھاگی مگر چند قدم دور آکر لہرا کر گری اور اس نے اپنی گردن کو یوں پکڑا ہوا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن کو کسی مضبوط شکنجے میں جکڑ رکھا ہو۔

اس عرصے میں افضال کی کوشش رنگ لائی اور تیمور علی نے ایک سانس لیا اور اپنی آنکھیں کھول دیں اور جیسے ہی اسے سامنے کا منظر نظر آیا اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر افضال نے اسے ایسا کرنے سے منع کردیا۔ اور پھر اسے وہاں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔

اس عفریت کی موت کا سن کر تیمور علی نے اطمینان کی سانس لی اور شان کی بہادری پر اسے مبارکباد دی جس نے بروقت سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اور ان کی جانوں کو اس عفریت کی وحشت کا شکار ہونے سے بچایا۔

اب وہ جلد از جلد یہاں سے ساحل کی جانب جانے والے راستے کی تلاش میں تھے تاکہ وہاں سے کسی جہاز کی مدد سے اپنے ملک روانہ ہوسکیں مگر ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم یہاں سے کیسے نکلیں کیونکہ چاروں طرف سرسبز زمین پھیلی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آرہا تھا جس پر چل کر ہم ساحل کی طرف جاسکیں۔

پھر یہ فیصلہ کرکے کہ وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کسی جانب پیش قدمی کی جائے اللہ تعالیٰ کوئی سبب ضرور پیدا کرے گا یہ سوچ کر سب نے مشرق کی سمت سفر شروع کردیا چلتے چلتے شام ہوگئی اور ایک جگہ ستانے کے بعد ہم دوبارہ چل پڑے اسی طرح مزید دو تین گھنٹے چلنے کے بعد سامنے یوں لگا جیسے کوئی درختوں کے جھنڈ ہیں ان پر نظر پڑتے ہی ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کی جانب بڑھے جیسے جیسے ہم نزدیک ہوتے جارہے تھے ویسے ویسے درختوں کے آثار واضح ہوتے جارہے تھے۔ قریب جاکر ہم نے دیکھا کہ ان درختوں کے درمیان میں ایک تالاب بنا ہوا تھا۔

ہم خوشی خوشی اس کی طرف دوڑے کہ شاید اس میں پانی موجود ہو لیکن یہ دیکھ کر ہماری خوشی مایوسی میں بدل گئی کہ

وہ ایک سوکھا تالاب تھا جس میں جابجا جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ان میں جنگلی چوہے دوڑتے پھر رہے تھے۔سب اپنی قسمت کو کوستے ہوئے پلٹ کر درختوں کے نیچے آن کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر ستانے کا سوچ کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔رات کا پچھلا پہر ہوگا جب شان کے پیٹ میں اچانک درد اٹھا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکاریاں نکل رہی تھیں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں فٹ بال پھینک دی ہو جو ادھر ادھر لڑھکتی پھر رہی ہو اس کی سسکاریاں اچانک چیخوں میں بدل گئیں اور اس کے اس طرح چیخنے سے آس پاس لیٹے دوسرے افراد بھی اٹھ گئے وہ اچانک اس ناگہانی افتاد پر بوکھلا کر شان کی طرف دیکھنے لگے جو بری طرح چیخ رہا تھا۔شان بار بار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انتہائی کرب کی حالت میں ہو۔

یہ دیکھ کر تیمور بھاگ کر اس کی جانب بڑھا اور اس کے پیٹ کو پکڑ کر ٹٹولنے لگا اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گول مٹول شے اس کے پیٹ میں کودتی پھر رہی ہو اسی دوران شان پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی ہم نے جلدی سے اسے ایک درخت کے نیچے لے جا کر لٹا دیا۔اس کا پیٹ اسی طرح پھول اور پچک رہا تھا کہ تیمور نے کچھ سوچ کر جیسے ہی دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ کر دبایا شان کا منہ ایک لمحے کے لئے کھلا اور ایک دھواں سا اس کے منہ سے نکل کر فضا میں ایک شبیہہ کی صورت میں ڈھلنے لگا جلد ہی اس نے ایک وجود کی شکل اختیار کر لی۔

وہ ایک چھوٹا سا سفید رنگ کا پتلا تھا جس کا رنگ رات کے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا اور اس کی گول گول آنکھیں بے پناہ چلیوں کے ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھیں جنہیں دیکھ کر وحشت طاری ہوتی تھی۔"مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تم نے شکور بن کے علاقے میں گھسنے کی جرأت کیسے کی؟" اس پتلے کے منہ سے ایک پتلی سی آواز نکلی۔

ہم سب سکتے کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے یہ سنتے ہی جیسے ہوش میں آ گئے ہم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے درختوں کے باہر کی طرف جانے کے لئے دوڑ لگا دی لیکن وہ پتلا ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار نکلا اور ہمارا ارادہ بھانپتے ہی اس نے وہیں سے ایک زوردار پھونک ماری جس سے شعلے نکلے اور سیدھے ہماری طرف بڑھے۔

افضال اور شان بھاگتے ہوئے پیچھے دیکھ رہے تھے اور دونوں ٹکرا کر زمین پر گر گئے اور وہ شعلے سیدھے ان کے سروں پر سے گزرتے ہوئے آگے چلے گئے۔تیمور اور دیگر ملازم بھی اپنی اپنی جان بچانے کے لئے اندھیرے میں بھاگے چلے جا رہے تھے وہ انہیں اس طرح زمین پر گرتے دیکھ کر واپس پلٹے۔

لیکن اس سے پہلے ہی دونوں دوبارہ اٹھ کر بھاگنے لگے تھے۔ان کے قریب پہنچتے ہی وہ سب ایک جانب ہو گئے اور دوبارہ شعلوں کی لپیٹ میں آنے سے بچ گئے۔لیکن اس وقفے میں وہ پتلا ہمارے انتہائی قریب آن کر فضا میں معلق ہو گیا تھا اور بغیر کسی وقفے سے ہم پر شعلوں کی بارش کر دی اس بار سب خود کو نہ بچا سکے اور بری طرح شعلوں کی لپیٹ میں آ کر جھلس گئے۔

میرے پاس چونکہ تعویذ تھا جو میں نے مضبوطی سے اپنی مٹھی میں دبایا ہوا تھا اس کی وجہ سے شعلوں کا اثر مجھ پر نہیں ہوا اور میں نے اللہ کا نام لے کر اس کا رخ اس شیطانی پتلے کی طرف کر دیا تعویذ سے ایک چمکدار شعلہ نکلا اور کسی تیر کی طرح اڑتا ہوا سیدھا اس پتلے کے سینے پر جا لگا پتلا ایک جھٹکے سے فضا میں اچھلا اور سرمئی رنگ کا دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔میرے ساتھی اب ایک راکھ کے ڈھیر کی صورت میں وہاں پڑے تھے۔بعد میں ایک بحری جہاز کے ذریعے میں وہاں سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

کالے جزیرے پر پایا جانے والا خزانہ دوبارہ دنیا والوں کے لئے ایک چیلنج بن کر رہ گیا جو آج بھی وہاں مدفن ہے اور کئی سر پھرے دوبارہ اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر سفر کے لئے کوشاں ہیں۔